تاریخ سے مکالمہ

(انٹرویوز اور تاثرات)

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
e-mail: tarikh publishers@gmail.com

نام کتاب : تاریخ سے مکالمہ
(انٹرویوز اور تاثرات)

مصنف : ڈاکٹر مبارک علی

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : نین تارا

اشاعت : 2013ء

قیمت : -/400 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی



فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

خالد علیگ کے نام!

عام طور سے شاعر کی شخصیت و کردار اور شاعری دونوں میں فرق ہوتا ہے، مگر ان کی شخصیت و کردار اور شاعری میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں۔

فہرست

دیباچہ 7

انٹرویوز

1- اخبارخواتین 11

2- اخبار جہاں 16

3- جنگ 21

4- نوائے وقت 55

5- جفاکش 60

6- بدلتی دنیا 69

7- مشرق 81

8- پاکستان 91

9- گجرات ٹائمز 98

10- ایکسپریس 116

11- الجریدہ 129

12- کتاب کے لئے انٹرویو 132

13- ہم شہری 153

14- آج کل 160

-15 نئی آواز 167

-16 بدلتی دنیا 173

-17 ایکسپریس 178

-18 وقت 181

تاثرات

-1 مکران کی دریافت 189

-2 سندھ کی آواز 195

-3 لسانیت، وفاقیت اور دو قومی نظریہ 200

دیباچہ

اس کتاب میں ان انٹرویوز اور تاثرات کو شامل کیا گیا ہے کہ جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں دیئے گئے ہیں۔ انٹرویو کا اصل دار و مدار، انٹرویو لینے والے پر ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے سوالات پوچھتا ہے، اور سامنے والے کو اپنے سوالات سے اس قدر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

چونکہ انٹرویوز میں تسلسل نہیں ہوتا ہے۔ یہ مختلف موضوعات پر مختصر رائے ہوتی ہے، اس لئے شاید اس میں تشنگی محسوس ہو، مگر ساتھ ہی میں انٹرویوز کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ وسیع اور مختلف موضوعات کو محدود دائرے میں لا کر انٹرویو لینے والے کے خیالات کو باہم جمع کر دیتا ہے۔

ساتھ ہی میں کچھ لیکچرز ہیں، کہ جو مختلف جگہوں میں دیئے گئے، جو تاثرات کے نام سے ہے، اگرچہ لیکچرز تو اور بہت دیئے گئے، مگر یہ اس لئے محفوظ رہ گئے کہ انہیں کچھ لوگوں نے محفوظ کر لیا۔ ان انٹرویوز کے ذریعہ میرے خیالات کے ساتھ ساتھ، شاید میری شخصیت کو بھی سمجھنے میں مدد ملے۔

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور

انٹرویوز

سندھ کی تاریخ ساز شخصیت

ملاقات: عابدہ جیلانی حیدرآباد سندھ

تاریخ پر لکھی جانے والی بے شمار کتابوں سے قطع نظر سندھ کی تاریخ کو نئی تربیت اور نئی زندگی دینے والوں میں ڈاکٹر مبارک علی کا نام کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نام دیکھتے ہی دیکھتے تاریخ کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنے پسندیدہ موضوع یعنی تاریخ پر بات کرتے ہوئے نہایت پُر جوش ہو جاتے ہیں اور ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے کہ اپنی تمام تر گفتگو دلائل اور ثبوت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مجھے ان میں ایک نڈر، بے باک، صاف گو اور کھرے انسان کی تمام تر خوبیاں (خامیاں) نظر آئیں۔

مبارک علی راجستھان کی چھوٹی سی ریاست ٹونک میں 1941ء کو پیدا ہوئے۔ 1952ء میں حیدرآباد آئے اور سٹی کالج سے بی اے کیا۔ 1963ء میں سندھ یونیورسٹی سے جنرل ہسٹری میں ایم۔اے کرنے کے بعد بحیثیت استاد اسی یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ 1972ء میں پی۔ایچ ڈی کے لئے جرمنی چلے گئے جہاں انہوں نے Ruhr یونیورسٹی سے مغل ہسٹری میں اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ ان کی تھیس (Thesis) کا موضوع تھا۔ ''مغل دربار'' آج کل سندھ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین ہیں۔ سندھ ریسرچ سوسائٹی کے بھی چیئرمین ہیں اور تاریخ کے موضوع پر ایک درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب آپ این میری شمل انسٹیٹیوٹ آف لینگویجز کے اعزازی مشیر بھی ہیں......تو یہ جرمن زبان آپ سیکھ کر گئے تھے۔ یا وہیں سیکھی۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

مبارک علی صاحب جو بالکل ''الرٹ'' تھے۔ گویا ہوئے ''زبان تو وہیں جا کر سیکھی جناب کیونکہ وہاں کے رولز کے مطابق کسی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جرمن زبان کا سیکھنا لازمی ہوتا ہے۔ ویسے جاننے کی حد تک تو ترکی، فارسی اور عربی سے واقفیت ہے۔ انہوں نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

شادی تو وہیں کی ہو گی آپ نے؟ میں نے بڑے یقین سے کہا۔

''ارے نہیں بھئی......شادی تو یہیں کی اپنے شہر میں۔''

وہ کیسے...... کچھ بتائیں گے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

1974ء میں ہماری شادی ہوئی...... اور صرف پانچ آدمی شریک ہوئے۔ کیونکہ میری بنیادی شرط ہی یہ تھی کہ دونوں طرف سے کم سے کم لوگ شریک ہوں گے اور بغیر کسی ہنگامے کے یہ تقریب ہو جائے۔

پھر خاندان والے تو خوب ناراض ہوئے ہوں گے کہ بلایا ہی نہیں؟ ظاہر ہے (انہوں نے قہقہہ لگایا) لیکن بعد میں ہم نے ٹھیک کر لیا۔ سب کو منا لیا اور سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔

''مبارک علی صاحب...... ایک بات بتائیں۔ جس وقت آپ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تو یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ آگے چل کر لکھیں گے بھی؟''

''جی...... بالکل تھی...... وہ مسکرائے۔ ہر وہ شخص جو پڑھتا ہے اسے لکھنا بھی چاہیے۔ کیونکہ لکھے بغیر خیالات میں ترتیب نہیں آتی۔ آدمی سیٹ نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ میں نے بھی لکھنے کا کام ساتھ ہی شروع کر دیا تھا۔''

مبارک صاحب بڑے ملنسار اور وضع دار آدمی ہیں۔ بات چیت کے دوران الفاظ کا استعمال بڑی احتیاط اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے ان کی بعد کی گفتگو سے ہوا۔

مبارک صاحب۔ آپ سندھ میں مغلیہ دور حکومت پر کام کر رہے ہیں آپ کی اس ریسرچ کے سلسلے میں کیا باتیں سامنے آئیں ہیں؟ میں نے ان کی خوبصورت بچی کی رنگین آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوال مکمل کیا۔ جو مستقل اپنے ابو کی گود میں بیٹھی تھی۔

''سب سے پہلے تو آپ یہ دیکھیں کہ تاریخ ہے کیا؟ انہوں نے بچی کو دھیرے سے گود سے اتار دیا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔''

تاریخ دراصل قوموں کو شخصیت کو سمجھنے اور ان کے ماضی سے تعلق کا نام ہے۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ لکھنے والے کی ذاتی پسند سے قطع نظر تاریخ کو آئینے کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ ہمیشہ حکمران وقت کی خوشنودی کو شامل حال رکھ کر لکھی جاتی رہی ہے۔ انگریز کے دور میں انگریزوں کے نقطہ نظر سے اور تقسیم کے بعد دیگر حکمرانوں کے نقطہ نظر سے۔

آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ (وہ سانس لینے کو رکے تو میں نے جلدی سے پوچھا)

وجہ تو صاف ظاہر ہے مورخ سیاستدان کے تابع ہو گئے ہیں خصوصاً ہمارے ہاں تاریخ کو جتنا مسخ کیا گیا اتنا ظلم تو شاید کہیں بھی نہیں ہوا تھا۔ جب کہ تاریخ ان ملکوں کے لئے تو اور زیادہ اہم ہو جاتی ہے جو نو آبادیاتی نظام کا شکار رہے ہوں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ ہمارے ہاں مداح سرائی اور قصیدہ گوئی کو بنیاد بنا کر تاریخ لکھی جاتی ہے اور حقائق کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا جاتا۔ جس طرح کیا جانا چاہیے...... یہ تاریخ کے

ساتھ ظلم ہے۔ ناانصافی ہے...... وہ باقاعدہ پُر جوش ہو گئے تھے۔ اور ایک ایک نقطہ اس طرح سمجھا سمجھا کر دہرا رہے تھے کہ جیسے میری کوڑھ مغزی کا اندازہ میرے چہرے سے لگا چکے ہوں۔ جس طرح چچا غالب خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے لفافہ دیکھ کر۔

تو اب کیا کیا جائے کہ اس ظلم کے اثرات کچھ کم ہو سکیں (میں نے انہیں جذباتی ہوتے دیکھا تو انہیں سے مشورہ طلب کر لیا)

دوبارہ لکھا جائے وہ فوراً بولے اور اٹھ کر اپنی بیگم کی مدد کو بڑھے جو اسی وقت چائے اور پھل وغیرہ ٹرے میں لئے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ بیگم ڈاکٹر مبارک خوب صورت اور باوقار خاتون ہیں۔ ان کی بری کنج آنکھوں میں ذہانت بھی ہے اور شرارت بھی...... انہوں نے ہمیں چائے پینے کی دعوت دی۔

''بھئی اس کا ایک ہی علاج ہے کہ تاریخ کو دوبارہ لکھا جائے اور عوامی نقطہ نظر سے لکھا جائے (مبارک صاحب نے چائے کی چسکیوں کے ساتھ گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع کیا) تاریخ لکھنے والا ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ اس دور کے حکمران کیسے تھے۔ امراء کا کیا حال تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تاریخ میں عوام کے رول کو کبھی زیر بحث نہیں لایا گیا۔ حالانکہ کسی تاریخ کے دھارے کو موڑنے میں سب سے زیادہ نمایاں کردار یہی طبقہ ادا کرتا ہے۔ جسے ہم اور آپ عوام کہتے ہیں۔ یہ عوام ہی ہیں جو شخصیتوں کی تعمیر کرتے ہیں...... شخصیتیں عوام کو نہیں بناتیں۔ تاریخ کو جب تک پیشہ ور مورخوں سے نجات نہیں ملے گی۔ تاریخ اسی طرح پسماندہ رہے گی۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ میں نے آپ کی تقریباً تمام کتابیں دیکھی ہیں۔ اور کچھ کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہ سب کتابیں انتہائی مختصر اور سہل زبان میں ہیں۔ اس کی کچھ وجہ......؟''

''میں لوگوں میں نہایت آسان اور واضح طریقے سے تاریخ کا شعور بیدار کرنا چاہتا ہوں اور اپنی کتابوں کو ان کے ذہنوں پر بوجھ نہیں بنانا چاہتا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ بعض لوگوں میں مطالعے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی وجہ ہے آپ کے ذہن میں......؟''

''عابدہ! اگر آپ سمجھتی ہیں کہ مطالعے کا رجحان واقعی کم ہو رہا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں......؟'' ظاہر ہے لوگوں کو جو کچھ پڑھنے کے لئے دیا جا رہا ہے وہ ان کی ذہنی استعداد اور معاشی استطاعت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے وہ نہیں پڑھتے۔ (انہوں نے قطعی لہجے میں کہا)

گویا آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا؟

''نہیں یہ بات نہیں۔ اس میں نقادوں کا بھی بڑا قصور ہے۔ دوستی یاری میں اصلی بات سامنے نہیں آنے دیتے۔ جب تک آپ ایمانداری سے اپنی رائے نہیں دیں گے۔ ادب کس طرح پرورش پائے گا۔''

(راحیلہ تصویریں بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے)

علامتی افسانے کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ (راحیلہ کے فارغ ہوتے ہی میں نے سوال کیا)

''علامتی افسانے (دھراتے ہوئے وہ بڑے ذومعنی انداز میں مسکرائے)''

''جناب! ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ عوام سے رابطہ توڑنے کے بعد ادب کامیاب نہیں رہتا اور یہ جو علامتی ادب ہے نا...... بھئی اپنے تو پلے نہیں پڑتا یہ سب کچھ اگر آپ لوگوں کے لئے لکھ رہے ہیں......اور چاہتے ہیں کہ لوگ پڑھیں بھی......تو پھر آپ کو آسان اور عام فہم انداز میں لکھنا ہوگا۔ ہاں اگر آپ صرف اپنے لئے لکھ رہے ہیں۔ تو پھر شائع کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں بیٹھے پڑھتے رہیں۔'' انہوں نے اس طرح چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا...... گویا علامتی ادب کا یہ سارا چکر اس ناچیز کا شروع کیا ہوا ہے۔

''لوگوں کو ادب کی طرف راغب کرنے کے لئے آپ کے خیال میں کوئی تجویز ہے......؟''

''آپ تو یوں مشورے مانگ رہی ہیں کہ جیسے غالب خستہ کے بغیر سارے کارخانے وغیرہ بند پڑے ہوئے ہیں۔''

بہر حال بات اتنی سی ہے کہ آپ عام لوگوں کے معاشرتی مسائل پر لکھیں اور عام زبان استعمال کریں۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں نے نہایت سلیس زبان استعمال کی ہے اور دور کیوں جائیں عصمت چغتائی کو لے لیں۔ پھر منٹو ہیں۔ کرشن چندر ہیں۔ سردار جعفری ہیں۔ یہ سب عام لوگوں میں بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کہ خاص لوگوں میں لوگ تو وہ چیز پڑھنا چاہتے ہیں جس سے کچھ حاصل کر سکیں اور اسی چیز سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جو آپ کی عقل میں اچھی طرح سما سکے۔ سر پر سے گزر جانے والی چیزیں پڑھنے والے کا بھلا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے چلے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کتابوں کی قیمتیں بھی اس سلسلے کی بڑی رکاوٹ ہیں۔''

تو پھر کتابیں کیسے سستی ہوں کہ عام آدمی بھی خرید کر پڑھ سکے؟

''اب ہر بات کے لئے تو گورنمنٹ کی طرف دیکھنا فضول ہے۔ یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ کم قیمت کی معیاری کتابیں شائع کریں۔ اب آپ میری کتابیں ہی لیں۔ ان کی کتابت بھی میں نے خود کی ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ یعنی 12 روپے۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ کتابت مبارک صاحب خود کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تمام کتابیں واقعی بڑے سلیقے سے شائع کی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں لائبریریوں کا رواج تو بالکل ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ مطالعے کے رجحان کو فروغ دینے کا (انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا) اس سلسلے میں سندھی لٹریچر کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہاں ہر تیسرے دن ایک نئی کتاب شائع ہوتی ہے اور یہ کم قیمت معیاری ادب ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔''

''آپ اندرون سندھ جا چکے ہیں اور آپ کی کتابوں کے سندھی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ سندھ کے

نوجوانوں کے ادبی شعور کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا......؟''

''سندھ کے نوجوان بہت زیادہ ادبی شعور رکھتے ہیں۔ نہ صرف ادبی شعور بلکہ سیاسی شعور بھی۔''

''تو کیا ادب کا سیاست سے بھی کوئی تعلق ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل ہے۔(انہوں نے قطعی لہجے میں کہا) ادب برائے ادب کچھ بھی نہیں۔''

مبارک صاحب! آپ کی کتاب تاریخ اور عورت کے حوالے سے پوچھنا چاہوں کہ آپ آزادی نسواں کے کس حق تک قائل ہیں۔

''آخری حد تک......(وہ جلدی سے بولے، پھر بڑے معنی خیز انداز میں کہنے لگے) ویسے خواتین ماشاءاللہ سمجھ دار ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے لئے کوئی چیز کہاں تک سودمند ہے۔''

''اچھا...... آپ کی دیگر مصروفیات کیا ہیں؟''

''سبھی دیگر ہیں......'' (وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتے چلے گئے۔ مگر زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتے ہیں۔)

(اخبارخواتین)



کیا نئی صدی میں ہم صداقت پر مبنی تاریخ مرتب کر سکیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے روشن خیال دانشوروں میں سے ہیں اور تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ خاص طور پر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا انہوں نے گہرا اور تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کی متعدد کتابیں، اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اپنے اس انٹرویو میں آپ نے ماضی کے تاریخی حقائق کی روشنی میں آنے والی صدی میں تاریخ کی صورتحال پر گفتگو کی ہے۔

سوال: کیا پرانی صدی کا خاتمہ اور نئی صدی کا آغاز تاریخ میں اہم ثابت ہوا ہے؟

جواب: پرانی اور نئی صدی کا تصور ہمارے دماغ میں ہوتا ہے۔ ورنہ وقت کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے کہ جو تقسیم ہو سکے۔ یہ ایک تسلسل کا نام ہے۔ لیکن مورخ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے وقت کو ''ادوار'' یا حصوں میں تقسیم کر لیتا ہے تا کہ اس عمل کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکے۔ مثلاً یہ تاریخ کو کبھی تو سیاسی اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں، کبھی مذہبی اور کبھی معاشی۔ مثلاً ''پتھر کا زمانہ''، ''کانسی یا لوہے کا زمانہ''، ''صنعتی دور'' یا ''فرانسیسی و روسی انقلاب کا عہد'' وغیرہ۔ تاریخی عمل کو ادوار میں تقسیم کر کے ہم اس عہد کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت پر زور دیتے ہیں اور یہ کہ اس عہد میں کیا اہم سیاسی و سماجی و معاشی اثرات ہوئے۔ لیکن تاریخ میں ادوار کی یہ تقسیم ہر ملک اور علاقہ میں اپنی اپنی ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخی عمل ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ ایشیا، یورپ، افریقہ یا امریکہ ہر ملک میں یہ عمل مختلف رہا ہے۔ اس لئے ''جدید عہد'' کا جو تصور مغرب میں ہے وہ افریقہ میں نہیں ہے۔

اس گلوبلائزیشن کے دور میں بھی تاریخی عمل یکساں نہیں ہوا ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی تقسیم آج بھی ہے۔ کبھی یہ مہذب و غیر مہذب ملکوں کے نام سے تھی، اور خود ہر معاشرے میں شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق رہتا ہے۔ اس لئے ایک صدی کا جب خاتمہ ہوتا ہے۔ تو مورخ اس کو حد بنا کر ماضی کا تجزیہ کرتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے کہ صدی کے خاتمہ پر تاریخی عمل کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے وہ تسلسل باقی رہتا ہے۔ تبدیلی کا عمل اس تسلسل کے دوران جاری رہتا ہے۔ اس لئے مورخ کے لئے صدی کی تبدیلی کوئی اہم نہیں ہوتی ہے۔

سوال: اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہزار سال کے خاتمہ کے بعد ایک نئی صدی کے آغاز پر کیوں

اس قدر شور ہے؟

جواب: دیکھئے ہم آج وقت کو عیسوی کلینڈر کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ ہر قوم کا اپنا کلینڈر ہوتا ہے اور وہ وقت کو اس کے لحاظ سے تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کا ہجری کلینڈر ہے، ہندوؤں کا وکرماجیت کے عہد کا بنایا ہوا کلینڈر ہے۔ ایران میں شمسی کلینڈر ہے۔ چینی و جاپانی اور افریقہ کے ملکوں میں اپنے علیحدہ علیحدہ کلینڈر ہیں۔ لیکن مغرب کے عروج کے بعد اب اکثر ملکوں نے پوپ گریگوری کے بنائے ہوئے اس عیسوی کلینڈر کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ اس نے وقت کی تقسیم اور تاریخی عمل کو اس کلینڈر کی روشنی میں دیکھنے لگے ہیں، لیکن آج بھی دنیا کی اکثریت وقت کی اس تقسیم سے بے خبر ہے۔ لیکن مغرب اور ان سے جڑے ہوئے ممالک اس کی روشنی میں تاریخی عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ صدی کی تبدیلی کا شور، ایک فیشن بھی ہے، لوگ تبدیلی کے خواہش مند رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یکم جنوری 2000ء میں دنیا شاید بدل جائے۔ دنیا بدلتی ضرور ہے مگر آہستہ آہستہ۔ صدی کی تبدیلی کوئی اہم اور زبردست تبدیلی لے کر نہیں آتی ہے۔

سوال: کیا ہم نئی صدی میں تاریخ سے متعلق بہتر اور موثر تحقیق کرنے کے قابل ہو سکیں گے؟

جواب: تاریخ ایک طاقتور اور موثر علم ہے۔ اس لئے حکمراں طبقوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس پر کنٹرول رکھا جائے۔ ابتداء میں بادشاہ اپنے دربار میں مورخ رکھا کرتے تھے، جو ان کے کارناموں کو لکھا کرتے تھے۔ جمہوری اور عوامی زمانے میں بھی حکمرانوں کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ تاریخ کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس لئے نصاب کی کتابیں ہوں یا ذرائع ابلاغ، ان کے ذریعہ تاریخ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ چونکہ تاریخ لکھنے کے لئے تحریری دستاویزات کا ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے یہ دستاویزات، جو سرکاری ہوں۔ یا جماعتوں کی، ان میں وہ اپنے مفادات کی روشنی میں واقعات کو لکھتے ہیں، بیان کرتے ہیں اور انہیں محفوظ کرتے ہیں۔ اب تک امریکہ و مغربی ملکوں میں خفیہ دستاویزات ہوتی ہیں کہ جن تک مورخوں کی پہنچ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جب بھی ان خفیہ دستاویزات تک رسائی ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا نقطہ نظر بدل جاتا ہے۔

تاریخ اس وقت بھی بدلتی ہے۔ جب لوگوں میں تاریخی شعور آتا ہے۔ مثلاً جب 1992ء میں کولمبس کی یاد میں 500 سالہ پروگرام بنائے گئے تو امریکہ کے قدیم باشندوں نے اس پر سخت اعتراض کیا کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے ان کی تہذیب و تمدن اور ان کی نسلوں کو مٹا دیا۔ اس لئے وہ کوئی ہیرو نہیں تھا۔ بلکہ ظالم اور غاصب تھا۔ ان کے اس اعتراض کے بعد یہ پروگرام ختم ہو کر رہ گیا، یہی صورتحال 1989ء میں واسکوڈا گاما کے ساتھ ہوئی جس پر ہندوستان نے اعتراض کیا کہ اس امید کی دریافت نے ہندوستان میں یورپیوں کو آنے دیا جنہوں نے بعد میں اس کو اپنی نوآبادیات بنا کر اس کی آزادی کو ختم کیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''معلومات'' اب حکومتیں زیادہ عرصہ کنٹرول میں نہیں رکھ سکیں گی۔ تاریخی

شعور اور معلومات تک رسائی تاریخ کو لکھنے میں مدد دے گی۔ تاریخ اب صرف حکمرانوں کے کارنامے بیان نہیں کرے گی، بلکہ اس میں معاشرہ کی سماجی و ثقافتی اور معاشی تاریخ ہوگی۔ اب تاریخ ایک طبقہ کی اجارہ داری نہیں رہے گی۔ بلکہ یہ پورے معاشرے کی سرگرمیوں کا احاطہ کرے گی اس وجہ سے امید ہے کہ آنے والے زمانہ میں تاریخ کا دائرہ وسیع ہوگا۔

سوال: گذشتہ صدی تاریخی طور پر کیا دے گئی اور کہاں لے گئی؟

جواب: اگرچہ اس مختصر سے انٹرویو میں ایک صدی کا تجزیہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن اگر ہم اس پوری صدی میں تاریخی عمل کو دیکھیں تو اس کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو سیاسی، معاشی اور سماجی عمل ہے۔ اور دوسرا سائنس اور ٹیکنالوجی کی تبدیلیاں ہیں اس صدی کے شروع میں جب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی شروع ہوئی۔ تو بہت سے مفکرین کا یہ خیال تھا کہ انسان مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے۔ اور ایک وقت وہ آئے گا کہ انسان کام اور محنت کی مشقت سے آزاد ہو جائے گا اور اس کا وقت فرصت اور آرام سے گزارے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ذہنی ترقی ہوگی اور وہ کلچر میں بے پناہ اضافے کرے گا۔ لیکن یہ تمام خواب اس وقت ٹوٹ گئے جب یورپ میں پہلی جنگ عظیم ہوئی، اس جنگ میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہر قسم کے ہتھیار استعمال کئے ٹینک، مشین گن، شیل، آب دوزیں اور ہوائی جہاز وغیرہ، اس جنگ نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا لہٰذا اب قومی برتری کے لئے علم و ادب ضروری نہیں رہے بلکہ فوجی قوت و ساخت کا ہونا لازمی ٹھہرا تمام ترقی یافتہ قومیں ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل ہوگئیں۔ اس کے نتیجہ میں دوسری جنگ عظیم ہوئی اس جنگ میں فاتح اور مفتوح دونوں تھک ہار کر اور خستہ ہو کر گر پڑے۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب ایشیا و افریقہ کے ملک جو ان کے نو آبادیات تھیں ان میں آزادی کی تحریکیں چلیں اور وہ ایک ایک کر کے ان کے چنگل سے آزاد ہوئے۔ لیکن جہاں مغربی ممالک نے اپنی اجارہ داری ختم کی، ان دو جنگوں نے امریکہ اور روس کو دو طاقتور حریفوں کی شکل میں لا کھڑا کیا اس کے بعد سے ''سرد جنگ'' کا آغاز ہوا کہ جس میں ایک دوسرے کے ڈر سے ہتھیاروں کا ذخیرہ ہونے لگا اس کا نتیجہ روس کی معاشی تباہی اور پھر نظریاتی تباہی کی صورت میں نکلا۔ روس ایمپائر جب ٹوٹی تو مشرقی یورپ میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی اس نے بوزینا، کروشیا اور سربیا کے جھگڑوں کو پیدا کیا بوزینا اور کوسوو میں جو کچھ ہوا اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس تمام ترقی کے باوجود انسان اندر سے اب تک ''وحشی'' اور خونخوار ہے اس وقت روس چیچنیا جو کچھ کر رہا ہے اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ستر سال کے نظریاتی ملک میں رہنے کے باوجود روسی اندر سے بھیڑیئے ہیں۔

لہٰذا ایک تو یہ صدی انسانیت کے لئے قابل نفریں صدی ہے کیونکہ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے زیادہ تباہی آئی امریکہ نے اس صدی میں ایٹم بم کا استعمال کر کے اپنی جارحیت اور انسانی قدروں سے

نفرت کو ظاہر کر دیا لیکن جہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اب ان مناظر کو لوگ گھر میں بیٹھے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں کہ روانڈا میں لاکھوں عوام ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہیں لوگ قتل ہو رہے ہیں عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی ہیں بچے یتیم ہو رہے ہیں لوگ بے گھر خاندان سے مبرا مارے مارے پھر رہے ہیں قحط ہے، وبائیں ہیں اور ہم ان مناظر کو دیکھتے ہیں اور ان کو دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں انسانی جذبات مر رہے ہیں اس میں مرتی انسانیت کو بچانے کا اس وقت خیال آتا ہے جب اس کے مفادات پر زد پڑے۔ لیکن دوسری طرف زمانہ آگے بھی بڑھ رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کو سہولتیں بھی پہنچا رہی ہے۔ طب میں بیماریوں کی تحقیق ہو رہی ہے، ذرائع ابلاغ دنیا کو قریب لا رہے ہیں اور اب تو گلابلائزیشن کا دور ہے۔

سوال: کیا گلوبلائزیشن ہمارے لئے مفید ہے؟

جواب: دیکھئے گلوبلائزیشن دوسرے لفظوں میں یورپیانائزیشن، یعنی مغرب کی بالاتری کا نام ہے۔ اس میں وہ ملک جو صنعتی و علمی لحاظ سے مغرب سے پیچھے ہیں ان کے لئے اپنی بقاء مشکل ہوگی۔ ''آزاد منڈی'' کا تصور اور اس کا اطلاق ہم جیسے ملکوں کو محتاج بنا دے گا۔ کہا جا رہا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہ زمانہ آ رہا ہے جب صرف بیس فیصد لوگ کام کریں گے اور اَسّی فیصد لوگ بیکار ہوں گے۔ ان 20 فیصد میں بھی کام کرنے والے ساٹھ فیصد امریکہ اور یورپ میں ہوں گے۔ ہمارے ہاں شاید ایک فیصد باقی ہوں، باقی لوگ کیا کریں گے؟ کہاں جائیں گے؟ وقت ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر چار سو بلین لوگوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ لہٰذا یہ دو بلین جو زیادہ ہو گئے ہیں ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

سوال: نئی صدی انسان کے لئے کیا نوید لے کر آ رہی ہے؟

جواب: نئی صدی کوئی خوش خبری لے کر نہیں آ رہی ہے بلکہ اس صدی کے آخر میں یہ جو نسلی جھگڑے، خانہ جنگیاں، مذہبی جنونیت، مغربی امریکہ، اجارہ داری اور مقامی کلچر اور روایات کو ختم کر کے، صرف مغربی کلچر کو قائم کرنے کی کوششیں ہیں، یہ سب نئی صدی میں داخل ہوں گی۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ نئی صدی شاید انسانیت کے لئے اور زیادہ بھیانک ثابت ہو۔

تاہم دوسری طرف یہ تحریکیں بھی ہیں کہ ان مسائل پر قابو پایا جائے۔ یہ دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس حیرت انگیز ترقی کے باوجود انسان ذہنی طور سے ایک وحشی درندہ ہی رہے گا۔ وہ تہذیب و تمدن کے نام پر ایک خول چڑھا لیتا ہے لیکن جب وقت آتا ہے تو وہ اپنی صحیح صورت و شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔

سوال: کیا انسان اس نئی صدی میں ایسی تاریخ مرتب کر سکے گا کہ جو پہلے سے بہتر ہو؟

جواب: دیکھئے تاریخ انسان کی سرگرمیوں کی تاریخ ہے۔ اگر انسان اچھے کام کرے گا تو تاریخ بھی اچھی

ہوگی۔لیکن اگر انسان درندگی کا مظاہرہ کرے گا تو تاریخ بھی اس کا مظہر ہوگی۔مگر تاریخ کے ساتھ ہوتا یہ ہے کہ مورخ کبھی قوم پرستی کے نام اور کبھی مذہب کے نام پر اپنی قوم کی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کو صحیح ٹھہراتا ہے۔امریکہ ریڈ انڈینز کے قتل عام کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔انگریز 1857ء کی بغاوت میں اپنے مظالم کو جائز بتاتے ہیں۔آنے والا روسی مورخ چیچنیا میں روسی کارروائیوں کو صحیح کہے گا۔ہم مشرقی پاکستان میں اپنے عمل کو ٹھیک کہتے ہیں۔اگرچہ صداقت کبھی کبھی سامنے آجاتی ہے،مگر حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

اس لئے مشکل ہے کہ نئی صدی میں ہم ایسی تاریخ مرتب کرسکیں جو مکمل طور پر صداقت پر مبنی ہو۔

سوال: یہ بتائیں کہ ٹیکنالوجی کے تناظر میں تاریخ کا کیا کردار ہوگا؟

جواب: کچھ مورخوں کا تو یہ خیال ہے کہ جیسے جیسے ٹیکنالوجی ترقی کرے گی، تاریخ اپنی اہمیت کھوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ ٹیکنالوجی انسانی ذہن کو مشینی بنائے گی اور مشینی ذہن کے لئے سماجی شعور کی ضرورت نہیں ہوگی۔

تاہم تاریخ کو موثر ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ٹیکنالوجی کے ساتھ بدلے، اپنی حدود کو بڑھائے، نئے نظریات کو اس میں لائے۔انسان اور معاشرہ کو اور زیادہ سمجھے۔اور اب تاریخ یہ کر رہی ہے کہ وہ صرف سماجی و معاشی و سیاسی سرگرمیوں کا تجزیہ نہیں کر رہی بلکہ انسانی جذبات کی بھی تاریخ لکھ رہی ہے۔وہ اپنا رشتہ دوسرے سماجی علوم اور سائنسی علوم سے بڑھا رہی ہے۔اس لئے تاریخ کا اپنا مستقبل ہے۔اور اگر تاریخ آزادانہ طور پر کام کرے تو وہ انسانیت کو باشعور بنانے میں مدد دے گی۔

(اخبار جہاں: 3 تا 9 جنوری 2000ء)



مرکز کو مضبوط نہیں ہونا چاہیے صوبوں کو خودمختاری دی جائے

جمہوری عمل آگے نہ بڑھا تو انتشار پیدا ہوگا، فوج اپنا رویہ بدلے

پاکستان میں علیحدگی کی تحریکیں دم توڑ چکی ہیں،

بنیاد پرست پاکستان کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں

انٹرویو: سہیل وڑائچ

جنگ: ڈاکٹر صاحب! حال ہی میں بعض تاریخی حقائق کے بارے میں متنازعہ باتیں سامنے آئی ہیں۔ تاریخ پاکستان کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کا قیام ہی غلط تھا اور دوقومی نظریہ ہی غلط تھا۔ اس حوالے سے آپ کا مطالعہ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ کہنا کہ پاکستان کا قیام اور دوقومی نظریہ غلط تھا اب یہ چیز بھی آپ تاریخ کے حوالے سے ہی دیکھیں گے نا؟ تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو انڈیا میں رہتے ہوئے دوقومی نظریہ کا ارتقاء بہت آہستہ آہستہ ہوا یعنی یہ سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی انیسویں صدی کی بات ہے ورنہ اس سے پہلے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی تو اس قسم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ مسلمان کوئی علیحدہ سے قوم ہیں یا ہندو کوئی علیحدہ قوم ہیں کیوں کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی بڑے فرقے تھے کوئی ترک تھا، کوئی مغل تھا اور پھر مختلف ذاتیں تھیں کوئی سیّد، کوئی پٹھان یعنی جس کو ہم کہیں کہ کئی نسلی اور لسانی گروپ تھے۔ تو اگر ہم یہ کہیں کہ مسلمان کوئی ایک قوم یا جماعت تھے تو اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے دوقوم ہونے کا تصور نوآبادیاتی دور میں پیدا ہوا۔

جنگ: لیکن ڈاکٹر صاحب تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تضادات تو کافی پرانے تھے۔ نوآبادیاتی دور سے بہت پہلے بھی اختلافات تو موجود تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں یہ تضادات تو تھے لیکن یہ تضادات ابھر کر سامنے نہیں آئے تھے یعنی مسلمانوں کے دورِ حکومت میں کیونکہ اس زمانے میں کوئی الیکشن تو ہوتے نہیں تھے، اقتدار اور حکومت میں عوام تو حصہ

نہیں لیتے تھے۔ حکمران ہی طاقت میں ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اس زمانے میں یہ تضادات اتنے زیادہ شدید نہیں تھے۔ جب ہندوستان میں مسلمان آئے اور انہوں نے حکومت قائم کی تو ایک فرق تو خود ہندو کمیونٹی میں رہا کیونکہ آپ دیکھیں ہندو کمیونٹی بھی کوئی ایک کمیونٹی نہیں ہے ان کے ہاں بھی ذات پات بڑی شدید قسم کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے ہاتھ کا کھانا بھی نہیں کھاتے تو مسلمانوں کی طرف سے جو ایک ردِعمل تھا کہ کس طرح انہیں الگ تھلگ رکھا جائے۔ وہ یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو ملیچھ قرار دے دیا تھا اور کہا تھا کہ ان کا کسی ہندوؤں کی ذات سے تعلق نہیں ہے اس لئے ان سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے لیکن ان میں سے راجپوت وہ کلاس تھی یا وہ طبقہ تھا جن کے اندر اتنی سختی نہیں تھی مثلاً راجپوت اپنی لڑکیوں کی شادیاں مسلمانوں میں کر دیا کرتے تھے جیسے اکبر نے یا مغل بادشاہوں نے راجپوتوں میں شادیاں کی تھیں تو راجپوتوں کی طرف سے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوا۔ مطلب یہ کہ دوسرے ہندو طبقے مسلمانوں سے شادی بیاہ یا کوئی سماجی ثقافتی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن راجپوت اتنے لبرل تھے اس لئے مغلوں کے ساتھ ان کے تعلقات پیدا ہوئے۔ تو اصل میں ہر قوم کا پورا تصور نوآبادیاتی دور کا ہے اس سے پہلے قوم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اب یہ ہے کہ جب یہاں پر مسلم ارسٹوکریسی اور مسلم مڈل کلاس کی تنظیم بنی تو یہاں پہلی مرتبہ ایک احساس پیدا ہوا اقلیت اور اکثریت کا۔ مثلاً جب یہاں پہلی مرتبہ مردم شماری ہوئی اس میں دیکھا گیا کہ کچھ لوگ مذہبی بنیادوں پر اکثریت میں ہیں اور کچھ لوگ اقلیت میں۔ پھر جب یہاں الیکشن کا رواج شروع ہوا ڈسٹرکٹ کونسل وغیرہ کے الیکشن ہوئے تو وہاں پر یہ احساس ہوا کہ وہی لوگ جیت سکتے ہیں جو اکثریت میں ہوں گے۔ اسی بات نے مسلمانوں میں ایک ڈر اور خوف پیدا کیا اور یہاں سے یہ احساس پیدا ہوا کہ ہمیں اپنا تحفظ کیسے کرنا چاہئے یہ وہ چیز تھی جس نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو آپس میں ملانا شروع کیا۔ لیکن یہ جو دو قومی نظریہ ہے بہت سے محققین اس کے ڈانڈے مغلوں کے زمانے سے ملاتے ہیں اور کوئی شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے دور سے جوڑتا ہے لیکن دیکھا جائے تو ایک واضح فرق اس وقت شروع ہوا جب اردو اور ہندی کا جھگڑا ہوا۔ اس بات نے سرسیّد احمد خاں کو بھی مایوس کیا کہ اگر اس مسئلے پر لڑائی جھگڑا ہوا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں (ہندو مسلم) ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یوں ایک جنگ چلتی ہے جسے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقوق کی جنگ تھی۔ تقسیم کا اس سے پہلے یا اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ صرف یہ خیال تھا کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں۔ تقسیم کا خیال تو بہت بعد کی بات ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ 1937ء کے انتخابات کے بعد جب کانگریس کی حکومت آئی تو اس میں مسلمانوں کو مایوسی ہوئی تو اس کے بعد سے خیال ایک دم پیدا ہوا کہ اب الگ وطن ہونا چاہئے لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کیبنٹ مشن پلان میں بھی قائداعظم نے جو زونل اسکیم دی تھی ان کو مان لیا گیا تھا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اگر مسلمانوں کے حقوق کو تحفظ مل جائے تو ٹھیک ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

جنگ: اس سے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے تضادات ارتقائی شکل میں آگے بڑھے تو اس طرح سے برطانیہ کی طرف سے دو الگ ملک بنانے کی بات تو غلط ثابت ہو جاتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اصل میں بات یہ ہے کہ برٹش انتظامیہ میں کئی لابیز کام کرتی تھیں مثلاً ایک لابی کا تو کہنا یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کو متحدہ حیثیت میں فتح کیا تھا جب ہم جائیں تو اس کو اسی طرح سے متحدہ چھوڑ کر جائیں۔ یہ ہمارا ایک طرف سے فرض بنتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لابیوں کے کام کے علاوہ یہ وہ وقت تھا جب روسی انقلاب آ چکا تھا اور کولڈ وار کا سلسلہ خاص طور سے دوسری جنگ کے بعد بہت زیادہ ہو چکا تھا تو ایک دوسری لابی یہ بھی تھی کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ جائے تو ہم اس صورت میں کمیونزم کا مقابلہ کر سکیں گے۔ پاکستان کو ایک Base بنا کر تو اس طرح مختلف لابیز کام کر رہی تھیں۔ آخر میں ایک یہ بھی بات ہے کہ ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کے جو جھگڑے تھے اور کانگریس کے اندر بھی کئی گروپ کام کر رہے تھے اس میں انتہا پسند ہندو بھی تھے۔ اعتدال پسند اور لبرل ہندو بھی کام کر رہے تھے لیکن آخر میں ان کے ہاں بھی انتہا پسندوں کا غلبہ ہو گیا تھا تو اس وقت ایسی صورت آ گئی تھی جہاں تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔

جنگ: آپ سمجھتے ہیں کہ تاریخی حوالے سے تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی بالکل ناگزیر ہو گئی تھی کیونکہ اس کے علاوہ پھر کوئی دوسری صورت نہیں رہی تھی۔

جنگ: یعنی آپ اس تھیوری سے متفق نہیں ہیں جس میں یہ کہا جا رہا ہے کہ دو قومی نظریہ انگریزوں نے بنایا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں یہ تو خیر بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے دو قومی نظریہ بنایا یہ بات ہمارے ہاں جو تھوڑی سی سازش کی عادت ہے اس کی وجہ سے ہے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ کوئی نظریہ اوپر سے بنا کر نافذ کر دیا جائے۔ نظریات کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ آپ تاریخ دیکھیں نا، خاص طور پر نو آبادیاتی دور میں یہ بات ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

جنگ: قائداعظم محمد علی جناحؒ کو آپ تاریخ میں کس انداز سے دیکھتے ہیں اور تاریخ پاکستان میں ان کا کیا مقام ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: قائداعظمؒ کی چند باتیں بڑی اہم ہیں مثلاً ایک تو وہ بہت آئین پسند اور دیانتدار آدمی تھے ان کی دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ بالکل سیکولر تھے۔ وہ مذہبی حوالے سے ملک کا قیام نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے جناح صاحب نے پورے ایشو کو ایک وکیل کی حیثیت سے اور ایک آئین پسند کی حیثیت سے دیکھا۔ یعنی انہوں نے پاکستان کا جو مقدمہ لڑا ہے انہوں نے بالکل اسی طرح لڑا ہے جیسا کہ ایک وکیل کو یا قانون پسند کو لڑنا چاہئے تھا۔ جناح صاحب آخر میں اس بات پر مجبور ہوئے کہ اور کوئی صورت نہیں رہی تھی کیونکہ جس قسم کا پاکستان بنا ہے اس کے لئے جناح صاحب بھی تیار نہیں تھے کیونکہ جب بنگال کی تقسیم کا مسئلہ

آیا تھا تو ان کا کہنا تھا کہ بنگال کلکتہ کے بغیر ہمارے لئے بے کار ہے کلکتہ ہمیں ملنا چاہئے، لیکن ظاہر ہے کہ جو اصول بنایا گیا تھا اس میں ان کو نہیں مل سکتا تھا تو بلکہ جناح صاحب تو اس پر بھی تیار تھے کہ بنگال کے لیڈروں نے سہروردی کے ساتھ مل کر ایک اسکیم بنائی تھی کہ بنگال کو ایک آزاد ملک بنا دیا جائے۔ جناح صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک ہے میری طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بنگال اگر آزاد ہوتا ہے تو یہاں پر کانگریس نے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں ہم ایک آزاد بنگال نہیں چاہیں گے بلکہ ہم چاہیں گے کہ ویسٹ بنگال ہمارے پاس رہے۔ اسی طرح پنجاب کی تقسیم کے بھی جناح صاحب حامی نہیں تھے کیونکہ جو جناح صاحب کا ایک ویژن تھا وہ یہ تھا کہ پنجاب بھی تقسیم نہ ہو اور بنگال بھی تقسیم نہ ہو اور یہ جو اکثریت کے صوبے ہیں یہ پاکستان کو مل جائیں اور ملک بننے کے بعد ٹرانسفر آف پاپولیشن کا بھی کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہاں سے لوگ یہاں آئیں یا یہاں سے لوگ وہاں جائیں جیسا کہ بڑی تعداد میں لوگوں کا ٹرانسفر ہوا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب یہ دو ملک بن جائیں گے تو پھر جو کوئی جہاں رہتا ہے وہاں رہتا رہے گا کیونکہ جب وہ ہندوستان سے آئے تھے ہندوستان کے مسلمانوں کو کہہ آئے تھے کہ اب یہ تمہارا ملک ہے تمہیں اس کا وفادار رہنا چاہئے تو یہ ان کا ایک پورا ویژن تھا اب جو آپ نے بات کہی ہے کہ اب یہ کہا جاتا ہے ایک تو ہمیں تاریخی حقیقت نظر آتی ہے کہ ایک ایسی اسٹیج آ گئی تھی کہ جہاں پر اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا اور یہ کہ انگریز بھی آخر کار اس پر تیار ہو گئے تھے کہ بھئی اب ہمیں اس ملک سے جانا ہے تو اس کو تقسیم کر کے جانا چاہئے۔ چنانچہ تقسیم خواہ جناح صاحب کی مرضی کے مطابق ہو یا نہ ہو وہ تقسیم ہوئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کو تقسیم کیا مگر ان کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے آخری میٹنگ ہوئی اور اس نے کہا کہ اب ہم تقسیم کرنا چاہ رہے ہیں تو جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ یہ تو ٹوٹا پھوٹا پاکستان ہے۔ یہیں پھر انہوں نے کہا کہ میں مسلم لیگ کی لیڈر شپ سے معلوم کر لیتا ہوں کہ ان کا کیا ارادہ ہے، لیکن آخر میں ان کو بھی معلوم تھا کہ کوئی چوائس نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی اسٹیج تھی جہاں انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ بھی ملک کی تقسیم کے لئے تیار تھی۔ یعنی صورت حال اس طرح سے ہو گئی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت نظر آ ہی نہیں رہی تھی۔

جنگ: پیر پگارا نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ چرچل نے سر سکندر حیات کو قاہرہ میں (1940ء کی قرارداد سے پہلے) کہا تھا کہ پنجاب کے مسلمانوں نے جو بلڈ منی دی ہے میں اس کے ریوارڈ کے طور پر انہیں الگ وطن دوں گا۔

ڈاکٹر مبارک علی: اچھا...... پتا نہیں یہ باتیں ہوئی ہیں زبانی اس لئے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن یہ تھا کہ یہاں پر جو یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے مثلاً خضر حیات...... ان کا کہنا تھا کہ انگریز کا یہاں سے چھوڑ کر جانا بے وفائی ہے کیونکہ ہم نے ان کا اتنا ساتھ دیا ہے اس لئے خضر حیات ٹوانہ پاکستان بننے کے بعد یہاں سے چلے گئے۔

جنگ: خضر حیات ٹوانہ تو پاکستان میں رہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: خضر حیات ٹوانہ امریکہ چلے گئے تھے۔

جنگ: سرگودھا آتے جاتے رہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: لیکن وہ پھر سیاست میں نہیں رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ انگریز کی بے وفائی ہے کہ ہم نے پوری زندگی ان کا ساتھ دیا اور اب وہ اس طرح سے ہمیں چھوڑ چھاڑ کر جا رہے ہیں۔ اس لئے یہاں کے جاگیرداروں نے بالکل آخر وقت میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا ورنہ پاکستان موومنٹ یا مسلم لیگ کی موومنٹ پنجاب میں بالکل مقبول نہیں تھی بلکہ یہاں پر مسلم لیگ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، یونینسٹ پارٹی یہاں پاور میں تھی لیکن جب آخر میں دیکھا کہ کوئی چوائس نہیں ہے۔

جنگ: لیکن 1946ء کے الیکشن میں تو مسلم لیگ کی اچھی پرفارمنس تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ تو بالکل آخر کی بات ہے۔

جنگ: لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ حکومت نہیں بنا پائی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: حکومت نہیں بنا سکتی تھی لیکن 1946ء تو بالکل ایک سال پہلے کی بات ہے نا بالکل آخر میں جاگیردار مسلم لیگ میں شامل ہوئے ہیں۔ سندھ میں بھی یہی حال تھا۔ وہاں بھی جتنے بڑے مسلم لیگی ہیں یہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھے۔ بالکل آخر میں جب 1946ء کا الیکشن ہوا ہے تب ساتھ ہو گئے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کی اصل جنگ تو شمالی ہندوستان میں لڑی گئی تھی جہاں کے مسلمان اقلیت میں تھے چونکہ یہاں مسلمان پہلے سے اکثریت میں تھے تو ان کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا اور یہی صوبہ سرحد میں تھا کہ آپ کو پتا ہے وہاں غفار خاں تھے اور کانگریس کا اثر تھا تو یہ جو علاقے پاکستان بنے یہاں چونکہ مسلمان اکثریت میں تھے اور زیادہ فکر مند نہیں تھے اس لئے ان کو پاکستان بنانے کی اتنی فکر نہیں تھی۔ پاکستان کا نعرہ بھی شمالی ہندوستان میں لگا جب کہ ان کو پتا تھا کہ پاکستان وہاں نہیں بنے گا اور یہ کہ وہاں ان کو ایک ڈر اور خوف تھا مخالفت بھی تھی۔ تو حالات یہاں تک پہنچے اور ایک ایسی اسٹیج آ گئی کہ جہاں پر سب کا مفاد اسی میں ہو گیا تھا اچھا بھئی اب یہ ملک بنا لینا چاہئے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اب جو دوسرا سوال ہے کہ کیا پاکستان بننا چاہئے تھا یا نہیں؟ اس کو ہم اس طرح سے دیکھیں گے آج کے موجودہ حالات کے پیش نظر کہ موجودہ حالات میں پاکستان بننے کے بعد سے ہماری پرفارمنس کیا رہی۔ مثلاً 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہوا۔ اس کے بعد یہ کہ پورے عرصے یہاں فوجی حکومتیں آتی رہیں۔ عام آدمی کو جیسا کہ پاکستان بننے کے بعد لوگوں کو امیدیں تھیں کہ الگ ملک ہوگا ہمیں سہولتیں ملنی چاہئیں اور ملیں گی اب وہ جب نہیں ملی ہیں۔ عام لوگوں کے اندر ایک مایوسی پیدا ہو رہی ہے تو آدمی جب انتہائی فرسٹریشن میں ہوتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ اس سے (پاکستان) نہ بنتا تو اچھا تھا۔ وہ جواب اس فرسٹریشن کا اظہار کیا جا رہا ہے تو سمجھئے کہ یہ جو فرسٹریشن ہے کہ

اس بات کی عکاسی کر رہا ہے کہ اگر ہماری پرفارمنس اچھی ہوتی تو یقیناً ہم آج یہ سوال نہ اٹھاتے۔

جنگ: آپ اس بات سے بالکل متفق نہیں ہیں کہ (جیسا کہ ولی خان اور نیشنلسٹ کہتے ہیں) کہ جناح صاحب نے برطانیہ کے کہنے پر سب کچھ کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں نہیں اس سے میں بالکل متفق نہیں ہوں اگرچہ جناح صاحب کی بہت سی باتیں مجھے پسند نہیں ہیں لیکن کم از کم ان کے کریکٹر کے لحاظ سے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ کسی کے ایجنٹ کے طور پر کام کر سکتے۔ اس معاملہ میں بہت دیانتدار اور سچے، کھرے آدمی تھے جو بھی انہوں نے صحیح سمجھا وہ کیا۔ اب آپ اس کو کچھ بھی کہہ لیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے انگریزوں کے اشارے پر سب کچھ کیا یہ صحیح نہیں اس سے میں متفق نہیں ہوں۔

جنگ: اور وہ جو کہتے ہیں کہ تاریخ کے حوالے سے ہمارے پاس اس کے ثبوت موجود ہیں؟ ولی خان اکثر برٹش ریکارڈ کا حوالہ دیتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، نہیں ان کی جو کتاب ہے Facts and Facts میں بھی کوئی حوالے اور کوئی ریفرنس نہیں ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ''میں نے کہا''، ''میں نے یہ دیکھا'' لیکن انہوں نے ریفرنس وغیرہ نہیں دیئے تو یہ کہنا کہ جناح صاحب انگریزوں کے کہنے پر کچھ کرتے تھے۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ بالکل غلط ہے اور یہ تاریخی حقائق نہیں ہیں اور جب دو قومی نظریئے کی بات آتی ہے تو یہ بات ٹھیک ہے کہ اس تھیوری کی بنیاد پر پاکستان بنانے کی جدوجہد کی گئی لیکن ظاہر ہے 1947ء کے بعد وہ دو قومی نظریہ ختم ہو جاتا ہے۔ پاکستان بن گیا تو اب تو ایک ہی قوم ہے تو ہمیں دو قومی نظریئے کی بات نہیں کرنی چاہئے ہاں تاریخی طور پر آپ بات کریں کہ نظریئے کا ایک تاریخی کردار رہا ہے لیکن جب پاکستان بن جاتا ہے تو پھر دو قومی نظریہ ختم ہو جاتا ہے اب تو ہم آپ ایک قوم کی بات کریں لیکن دو قومی نظریئے کے ضمن میں بھی ایک چیز آپ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے یہاں جو قوم کا نظریہ مذہب کی بنیاد پر تھا اسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد کہا گیا کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور ہمیں اپنی صوبائی شناختیں ختم کر دینی چاہئیں تو یہ بڑی غلط بات تھی کیونکہ ہوا یہ ہے کہ جب آپ کو مذہب کی بنیاد پر ایک قوم کا نام دیا گیا اور اوپر سے نافذ کیا گیا اور سب سے کہا گیا کہ یہ بس آپ کو مان لینا ہے اور سب سے بڑی چیز جو زبان کی شناخت ہوتی ہے اس کا ہم نے انکار کیا مثلاً بنگال کا پورا بحران اس لئے پیدا ہوا کہ ہم نے بنگالی زبان کی اہمیت کو نہیں مانا تھا اور کہا کہ اردو یہاں کی زبان ہو گی۔

جنگ: دنیا میں زبانوں کی بنیاد پر پہلے بھی کہیں ایسا ہوا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بالکل ہوا ہے مثلاً جرمنی کا پورا اتحاد اب جو ہوا ہے وہ جرمن زبان کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہاں پر چھوٹی چھوٹی کوئی تین سو کے قریب ریاستیں تھیں تو خاص طور پر جو جرمن نیشنل ازم ہے اسے ہم کہیں گے کہ خالصتاً لسانی بنیاد پر ہے۔

جنگ: جرمن نسلی طور پر تو ایک ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: جرمن نسلی طور پر ایک ہیں لیکن بہت فرق ہے مثلاً ساؤتھ میں جو لوگ رہتے ہیں یعنی صوبہ بوویریا میں وہ اپنے آپ کو شمال والوں سے بالکل الگ سمجھتے ہیں کیونکہ علاقائی شناخت ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے وہاں بڑا فرق تھا اور آج بھی وہ فرق موجود ہے اس کے باوجود کہ وہ ایک زبان بولتے ہیں لیکن جرمنی کے صوبہ بوویریا والے اب بھی اپنے آپ کو دوسرے جرمنوں سے الگ سمجھتے ہیں۔ جرمنوں کے بعد جو دوسری مثال ملتی ہے وہ عرب نیشنل ازم کی ہے۔ عرب نیشنل ازم بھی زبان کی بنیاد پر ہوا تھا کہ یہ 1960ء کی دہائی کی بات ہے، جس کی بنیاد یہ تھی کہ عربی بولنے والے خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی وہ سب عرب قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنگ: ترکوں کے خلاف جو بغاوت تھی وہ بھی تو اسی بنیاد پر تھی۔

ڈاکٹر مبارک علی: وہ بھی یہی تھی...... مذہب کی بنیاد پر نہیں تھی۔ وہ بھی زبان کی بنیاد پر تھی اور پھر اس کو جو زیادہ فروغ ملا ہے وہ جمال عبدالناصر کے زمانے میں ملا اور پھر اس میں لبنان کے عیسائیوں نے بہت حصہ لیا اور انہوں نے عربی زبان کو ترویج دی۔ انسائیکلوپیڈیا اور کتابیں لکھیں کیوں کہ جتنی زبان طاقتور ہوگی اتنا ہی زیادہ نیشنل ازم مضبوط ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم مذہب کو بھی زبان کے ذریعے سمجھتے ہیں تو زبان مذہب سے زیادہ ضروری ہے تو اس لئے یہاں مشرقی پاکستان کا نیشنل ازم ہے وہ بھی زبان کی بنیاد پر ہوا اور اس وقت جو سندھ کا نیشنل ازم ہے اس کی بنیاد بھی سندھی زبان ہے اور ایم کیو ایم کی جو پوری تحریک ہے وہ بھی اردو زبان کے اوپر قائم ہے۔ تو آپ دیکھیں کہ کس طرح بلوچستان اور فرنٹیئر میں سوائے پنجاب کے باقی سب جگہ زبان کی بڑی اہمیت ہے اور اسی بنیاد پر ان کی شناخت ہو رہی ہے تو یہ ہم نے مذہبی بنیاد پر نیشنل ازم کی جو بنیاد بنائی تھی وہ یہاں نہیں چل سکی۔

جنگ: لیکن ڈاکٹر صاحب! ایران میں مذہبی نیشنل ازم سے انقلاب آیا پھر افغانستان میں بھی یہی ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، نہیں ایران میں مذہبی نیشنل ازم نہیں ہے ایران کا نیشنل ازم تو بہت پرانا ہے مطلب یہ کہ ایرانی جب مسلمان ہو گئے اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنے نیشنل ازم کو باقی رکھا۔ مثلاً جب یہ مسلمان ہوئے تو پوری ایک تحریک چلی جس کو عربی میں کہتے ہیں شعوبیہ یا نیشنل ازم۔ اس کی تحریک چلی جو فردوسی کا شاہ نامہ ہے اسے ایرانی نیشنل ازم کی بائبل کہا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ''لعنت ہے تجھ پر کہ جو چھپکلیاں وغیرہ کھانے والے تھے آج تجھ پر حکومت کر رہے ہیں'' تو ایرانیوں میں عربوں سے بڑی سخت قسم کی نفرت ہے اور پھر ایرانی اپنا ایک متوازن سسٹم بنا لیتے ہیں مثلاً مولانا رومیؒ کی مثنوی کو وہ ''قرآن در زبان پہلوی'' کہتے ہیں تو ان کا نیشنل ازم بھی زبان پر ہے۔ ایرانیوں کی قومیت پرستی بڑی سخت اور بڑی پرانی ہے۔

جنگ: افغانستان کے متعلق کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: افغانستان تو ابھی بے چارہ بکھرا ہوا ہے اس کے نیشنل ازم پر کیا بحث کریں کیونکہ افغانستان تو احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں اس کا نیا نام پڑا ورنہ اس سے پہلے اس کا کچھ حصہ ایران کے اندر تھا۔ کابل اور کچھ حصے مغل سلطنت کے حصے تھے۔ یہ تو ٹکڑے ٹکڑے تھا تو اس لئے افغانوں کے اندر ابھی اس طرح کا نیشنل ازم پیدا نہیں ہوا ہے کیونکہ وہاں دری بھی بولنے والے ہیں، فارسی بولنے والے بھی ہیں، قبائلی نظام بھی ابھی ہے اور ابھی وہ ریاست کی اتھارٹی کو مانتے ہی نہیں ان کے قبائلی اقدار اور قبائلی رسم و رواج بڑے اہم ہیں۔ اسٹیٹ کا ادارہ ان کے ہاں ابھی اس طرح تشکیل نہیں ہوا۔

جنگ: انہوں نے تو روس کو شکست دی؟

ڈاکٹر مبارک علی: اچھا! روس کو شکست پتا نہیں کس نے دی وہ تو آپ بھی جانتے ہیں ایک تو خیر حالات جیسے بھی ہوئے (قہقہہ) آپ کو بھی پتا ہے۔

جنگ: ہم تو افغانستان میں روسیوں کو شکست دینے پر بہت فخر محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں خیر افغانوں نے تو شکست نہیں دی اس میں اور بھی بہت سے فیکٹرز تھے۔ پاکستان بھی اس میں تھا، امریکہ کی پوری سی آئی اے ملوث تھی۔ پورے مغربی بلاک کی شمولیت تھی اور پھر خود روس کے اندر بھی ایسے حالات تھے کہ روس اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا وہ تو ایک بالکل دوسری صورت حال تھی۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! تحریک پاکستان کی طرف واپس آتے ہیں یہ کہا جاتا ہے 1940ء کی قرارداد میں صوبے شامل ہوئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ صوبائی خود مختاری کو تشکیل پاکستان میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں چونکہ ایک تو یہ بات ہے نا کہ 1940ء کی قرارداد جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہے اس میں پاکستان کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا وہ قرارداد لاہور تھی۔ جسے بعد میں قرارداد پاکستان کہہ دیا گیا اور دوسرے اس میں جو بات کہی گئی وہ آزاد ریاستوں کی بات کی گئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھئی خود مختار ریاستیں ہوں گی اور ان کی کوئی کنفیڈریشن ہوگی۔ بعد میں اس کی جو تشریح کی گئی وہ یہ تھی کہ یہ ٹائپ کی غلطی تھی کہ وہ اسٹیٹ تھی اسٹیٹس نہیں تھیں۔ اب کہا جاتا ہے کہ یہ تصور اس غلطی کی وجہ سے پیدا ہوا۔

جنگ: یہ کس کا نقطہ نظر ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو کنفیڈریشن والے ہیں جیسے ممتاز بھٹو وغیرہ۔ وہ تو یہی حوالہ دیتے ہیں کہ قرارداد پاکستان میں اسٹیٹ (State) کا لفظ نہیں اسٹیٹس (States) کا لفظ تھا۔

جنگ: یہ کون کہتا ہے کہ ٹائپ کی غلطی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہمارے ہاں کافی لوگ ہیں جو کہتے ہیں اور اس کا دفاع کرتے ہیں کہ یعنی یہ خود مختار

ریاستوں کا نہیں تھا بلکہ ایک اسٹیٹ کا ذکر تھا ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ وہ ٹائپ کی غلطی ہوگئی تھی۔

جنگ: آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس وقت تک شاید اس طرح سے یہ بات واضح نہیں تھی، ہوگا اسٹیٹس (States) کا لفظ ہی کیونکہ جناح صاحب بہت باریک بین تھے اگر ٹائپ کی اس قسم کی کوئی غلطی ہوتی تو وہ اسی وقت اس کو دیکھ لیتے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! جو میں نے تازہ ترین بات سنی وہ یہ کہتے ہیں کہ بعد میں جب پاکستان کا 1956ء کا آئین بنا تو سہروردی سے قرارداد منظور کروائی گئی جس میں اسٹیٹس (States) والا تصور ختم کر کے برابری کی بنیاد پر مشرقی اور مغربی پاکستان کا نظریہ دیا گیا اس میں پھر اسٹیٹس کا نظریہ تو ختم ہو گیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسٹیٹس کا نظریہ تو جب پاکستان بن گیا تو اسی وقت ختم ہو گیا کیونکہ پھر یہ تھا کہ ایک وفاق ہوگا، صوبے ہوں گے لیکن ابھی آئین تو بنا نہیں تھا، ابھی تک 1935ء کے ایکٹ کے تحت حکومت ہو رہی تھی۔ اچھا آپ کو پتا ہے کہ 1935ء کے ایکٹ میں بھی ترامیم کرائی گئی تھیں مثلاً قائداعظم جب گورنر جنرل بنے تو قائداعظم محض نام کے گورنر جنرل نہیں بننا چاہتے تھے تو اس میں ترمیم کی گئی جو کہلاتی ہے P-9 اس ترمیم کے تحت گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ صوبائی اسمبلی توڑ سکتا ہے، چنانچہ قائداعظم نے پہلے صوبہ سرحد کی اسمبلی ختم کی اور سندھ میں بھی کھوڑو اس وقت چیف منسٹر تھے انہیں ہٹایا گیا۔ 1956ء کے جب انتخابات ہوئے تو مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی آبادی 55 فیصد تھی تو اگر ون مین ون ووٹ کا حساب ہوتا تو اکثریت وہاں سے آتی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہاں ون یونٹ بنایا جائے؟

جنگ: تو اس وقت پھر اسٹیٹس کا تصور تو ختم ہو گیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں ختم ہو گیا کیونکہ آئین بن گیا کسی نے آواز نہیں اٹھائی وجہ یہ تھی کہ شروع کا پیریڈ تھا لوگوں کو اس وقت بھی امیدیں تھیں کہ پاکستان ابھی بنا ہے۔ کچھ حالات ٹھیک ہوں گے۔ اس وقت لوگوں کے اندر مایوسی نہیں تھی لیکن ون یونٹ ایک ٹرننگ پوائنٹ ہے کیونکہ ون یونٹ بننے میں سب سے زیادہ ردِعمل سندھ نے ظاہر کیا ہے۔ سندھ کا سندھ نیشنل ازم ون یونٹ کے دور میں پیدا ہوا۔

جنگ: کیا اس سے پہلے سندھی قوم پرستی کی تحریک نہیں تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس سے پہلے تحریک نہیں تھی۔ ون یونٹ بننے کے بعد میں اصل میں ہوا یہ کہ جب سندھ کو انگریزوں نے فتح کیا تو اس کے دو سال کے بعد ہی اسے بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی سندھ کی اپنی ایک الگ شناخت ختم ہوگئی۔ ون یونٹ کے بعد پتا چلا کہ دوبارہ وہی پوزیشن ہوگئی ہے کہ اب وہ بمبئی کی بجائے لاہور کے تابع ہو گئے تو اس لئے ان کے ہاں سب سے زیادہ ون یونٹ کے خلاف

ردِعمل ہوااوراسی نے پھر یہ نیشنل ازم اور نظریہ پاکستان کو چیلنج کرنے کا ماحول پیدا کیا۔

جنگ: آپ نے ابھی فرمایا کہ تحریک پاکستان میں پنجابیوں کا کوئی حصہ نہیں تھا!

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں تحریک پاکستان میں حصہ نہیں تھا کیونکہ ہوا یہ کہ دیکھا جائے تو تحریک پاکستان میں نہ تو پنجاب کا حصہ تھا اور نہ ہی اس سینس میں سندھ کا کوئی حصہ تھا لیکن اب سندھی بھی کہتے ہیں کہ ہم نے خلافت موومنٹ میں حصہ لیا، ہجرت موومنٹ میں حصہ لیا وہ تو متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر مسلمانوں کی تحریکیں چل رہی تھیں لیکن تحریک پاکستان کے اندر دونوں بالکل آخر میں شامل ہوئے۔

جنگ: سرحد نے بھی حصہ نہیں لیا؟ اور بلوچستان؟

ڈاکٹر مبارک علی: سرحد تو کانگریس کے ساتھ ہی تھا۔ بلوچستان صوبہ ہی نہیں تھا اس وقت......

جنگ: اس کا مطلب ہے کہ تحریک پاکستان میں حصہ صرف بنگال نے لیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: بنگال نے لیا اور اسی کو ہم نے سب سے زیادہ......سزا بھی دی۔

جنگ: آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ موجودہ پاکستان نے تحریک پاکستان میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی: بالکل آخر میں 1946ء کے انتخابات میں یہ اس تحریک میں شامل ہوئے ہیں اس وقت جب یہاں سے زمینداروں نے دیکھا کہ اب ان کے لئے اور کوئی صورت نہیں ہے اور اس وقت پھر جناح صاحب نے بھی دیکھا کہ وہ ان علاقوں میں زمینداروں کی مدد کے بغیر الیکشن نہیں جیت سکتے اس لئے پھر مسلم لیگ نے ان سے معاہدہ کیا۔ ہمارے دوست ہیں حمزہ علوی ان کا تھیسس ہے کہ نارتھ انڈیا کا تنخواہ دار طبقہ پاکستان بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ پاکستان بنے گا تو یہاں ملازمتیں ملیں گی۔ لوگ زیادہ ترقی کر سکیں گے اور سندھ اور پنجاب کا جاگیردار طبقہ تھا یعنی ان دو طبقوں نے مل کر بالکل آخر میں ساتھ دیا پاکستان بنانے میں۔

جنگ: پنجاب کے جاگیردار کا پاکستان بننے میں کیا مفاد تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں کے ساتھ ملنے کی دو وجوہات تھیں ایک وجہ تو یہ تھی کہ کانگریس نے یہ قرارداد پاس کی تھی کہ آزادی کے بعد وہ جاگیرداری نظام ختم کر دے گی اس لئے ان کو یہ خوف تھا کہ اگر مشترکہ انڈیا میں رہے تو جاگیرداروں کا کوئی مستقبل نہیں (انڈیا میں جاگیرداری نظام ختم کر دیا گیا) ایک وجہ تو یہ تھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ یہاں پر جاگیردارانہ نظام آج تک قائم ہے۔

جنگ: ایم کیو ایم کے الطاف حسین کہتے ہیں کہ پنجابی بڑے بزدل ہیں!

ڈاکٹر مبارک علی: یہ چیزیں تو خیر خیالی قصے ہیں۔ انگریز کہتے تھے کہ پنجابی مارشل ریس ہیں۔ بات یہ ہے کہ قومیں نہ تو فطرت کے لحاظ سے بہادر ہوتی ہیں اور نہ بزدل ہوتی ہیں، جیسے حالات اور جیسے چیلنجز ہوتے ہیں اسی حساب سے قومیں ردِعمل کا اظہار کرتی ہیں۔

جنگ: کہتے ہیں کہ پنجاب نے ہر فاتح کو خوش آمدید کہا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں یہ تو خیر ایسے ہی ہے، یہ بات خود پنجابی بھی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی لوگ اپنے آپ پر بھی تنقید کرتے ہیں لیکن ایسی چیز نہیں ہے۔ مثلاً پنجاب کے اندر بھی آپ دیکھیں کہ یہاں سکھوں کا جو پورا دور رہا ہے بڑے بڑے حریت پسند رہے ہیں۔ غدر موومنٹ پوری یہاں سے اٹھی۔ مغلوں کے خلاف سکھوں نے بڑی زبردست بغاوت کی۔ پھر جلیانوالہ باغ کے واقع کے بعد یہاں جو پورا ردِعمل ہوا تھا تو ایسی بات نہیں ہے، جیسے حالات ہوتے ہیں ویسے ہی قومیں اپنے رویے بھی بدل لیتی ہیں لیکن سندھیوں کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا تھا کہ سندھی بھی بزدل ہیں، لڑ نہیں سکتے لیکن جب وقت آتا ہے اور اپنے حق کا دفاع کرنا پڑتا ہے تو لوگ اسی طرح ردِعمل ظاہر کرتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں یعنی مسلمانوں کے ہاں ایک بڑا زبردست امیج جو ہے وہ ہے لڑنے والا، جنگجو کا، بس وہی بہادر ہو سکتا ہے، ساری خوبیاں اسی میں ہو سکتی ہیں۔ جو آدمی پُرامن ہے اور امن و آشتی چاہتا ہے اسے سمجھتے ہیں کہ بزدل ہے۔ یہ بالکل ایک غلط امیج ہے، جو پوری تاریخ میں ہمارے ہاں بنایا گیا ہے۔

جنگ: تو آپ کے خیال میں پنجابی کے اچھا ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جنگجو ہو؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں بالکل نہیں، بالکل نہیں کیونکہ سندھ میں تو حملہ آور بھی آتے رہتے تھے، آپس میں بھی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ پنجابی سکھوں نے افغانوں کے ساتھ بڑی زبردست جنگیں لڑی ہیں اور ان کو شکستیں بھی دی ہیں۔ افغان اور انگریزوں سے بھی جب بھی موقع ملا، مقابلے ہوتے رہے۔

جنگ: کہا جاتا ہے کہ افغان حملہ آور درہ خیبر پار کرتے تھے تو پانی پت تک کوئی روکنے والا نہیں تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: (ہنستے ہوئے) نہیں یہ ایسے ہی خیالی قصہ اور افسانوی بات ہے۔ یہاں پر منگول آتے رہے ان کا مقابلہ یہاں پر ہوتا رہا ہے۔ ملتان، لاہور، دیپال پور یہ ساری چھاؤنیاں تھیں جہاں پر پنجابی مقابلہ کرتے تھے، دوسری چیز ہے پنجاب نے ہمیشہ شمالی ہندوستان کا دفاع کیا ہے۔

جنگ: کیسے؟، کوئی مثال تو دیں۔

ڈاکٹر مبارک علی: جیسے منگولوں سے۔ منگولوں کو انہوں نے روکے رکھا۔

جنگ: کس نے روکا؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ یہیں پنجاب کے لوگ تھے جیسے بلبن کے زمانے کی بات ہے، اس نے یہاں قلعے بنوائے تھے، کمانڈر اگر وہاں سے آتے تھے تو فوج تو یہاں کی ہوتی تھی لیکن بات یہ ہے کہ پنجابی دفاع کرتے رہے، ایسا نہیں ہے کہ کچھ نہ کیا ہو۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے پنجاب نے نارتھ انڈیا کا دفاع کیا ہے کہ نہیں لیکن یہ نہیں ہوا کہ کوئی حملہ آور پنجاب آیا ہو اور آسانی سے شمالی ہندوستان چلا گیا ہو۔

جنگ: لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ پنجابی مسلمانوں نے انگریزوں کے ملازم ہو کے خانہ کعبہ پر بھی گولیاں

چلادی تھیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: 1857ء کا جب ہنگامہ ہوا تو انگریزوں نے یہاں سکھ سرداروں سے یا جن لوگوں نے مخالفت کی ان سے جاگیریں چھین لی تھیں۔

جنگ: 1849ء میں بھی تو پنجاب میں جنگیں ہوئیں۔

ڈاکٹر مبارک علی: 1849ء میں جتنی خوں ریز جنگیں ہوئی ہیں وہ یہیں پنجاب میں ہوئیں ہیں۔

جنگ: شمالی ہندوستان میں کیا خوں ریز جنگیں نہیں ہوئیں۔

ڈاکٹر مبارک علی: انگریزوں سے پنجابی، سکھ اور مسلمانوں کی بڑی زبردست جنگیں ہوئی ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ اس سے زیادہ خوں ریز جنگیں نہیں ہوئیں۔

جنگ: پنجاب میں تو ٹوڈی بھی تھے انگریز کے ایجنٹ بھی تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی: (قہقہہ) نہیں جو ٹوڈی تھے اس کی مثال میں آپ کو بتاتا ہوں۔ بات اصل یہ ہے کہ جن کی زمینیں چھین لی گئی تھیں 1857ء میں وہ سارے زمیندار جن میں سکھ بھی تھے، مسلمان بھی تھے۔ ان کا رابطہ تھا نارتھ انڈیا کے ان زمینداروں سے جنہوں نے بغاوت کی تھی۔ اچھا جیسے ہی ان کو اطلاع ملی تو جان لارنس یہاں کا گورنر تھا، اس نے فوری طور پر لسٹیں تیار کر کے ان کی جاگیریں واپس کر دیں۔ جب جاگیریں مل گئیں تو انہوں نے کہا کہ اب لڑنے کی کیا ضرورت ہے تو ہوا یہ کہ انگریزوں کی جو ایک پالیسی تھی وہ یہ تھی کہ زمینداروں کو نوازا جائے۔ ان کی سرپرستی کی جائے اور ان کے ذریعے سے رعیت کو کنٹرول کیا جائے۔ یہ پالیسی انہوں نے پنجاب میں بھی رکھی اور ٹوڈیز کی جو بات کر رہے ہیں تو یہاں کا جو زمیندار طبقہ تھا جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کے لئے کام کیا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب اس کا ایک اور تاریخی تناظر تو ہے نا؟ کہ پنجاب کے جاگیرداروں کے دہلی حکومت سے معاملات پہلے بھی خراب تھے، اس طرح سے انگریز ان کے فطری حلیف بھی تھے؟

ڈاکٹر مبارک علی: وہ تو خیر مغلوں کے دور میں ان کے تعلقات اتنے خراب نہیں تھے کیونکہ ایک لحاظ سے پنجاب بھی خصوصاً حکومت کا ایک حصہ تھا۔ ایک لحاظ سے یہ مغل ٹاؤن تھا لیکن ہوا یہ ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں کہ جن زمینداروں کی زمینیں چھینی تھیں وہ سب واپس کر دیں پھر جن زمینداروں نے ان کی مدد کی تھی ان کو نئی زمینیں دیں اور 1857ء میں جن لوگوں نے ان کی مدد کی تھی انہیں زمینیں دے کر ایک نیا طبقہ بھی پیدا کیا۔ فوج میں جو لوگ ان کے لئے لڑے تھے ان کو بھی زمینیں دیں تو انہوں نے اپنے حمایتیوں کا ایک طبقہ پیدا کر لیا تھا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب یہاں پر ایک ضمنی سوال پیدا ہوا ہے کہ جو جاگیرداروں کا نظام ہے انہیں انگریزوں نے زمینیں دے کر جاگیردار بنایا اس سے پہلے یہ لوگ کیا کرتے تھے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس سے پہلے یہاں پر ایک خاص بات جو ہے وہ یہ ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے پرائیویٹ پراپرٹی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مثلاً بادشاہ جو جاگیر کسی کو دیتا تھا وہ دو تین سال کے لئے ہوتی تھی پھر یہی جاگیر کسی اور کو ٹرانسفر کر دی، اگر جاگیر لینے والا مر جاتا تو وہ پھر دوبارہ بادشاہ کے پاس آ جاتی تو نجی جائیداد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ نجی جائیداد کا تصور صرف انگریز نے دیا۔

جنگ: آپ نجی جائیداد کے تصور کو ترقی سمجھتے ہیں یا پسماندگی؟

ڈاکٹر مبارک علی: اب یہ تو ان کی اپنی روایت تھی یعنی یورپ کی، تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بغیر پرائیویٹ پراپرٹی کے کام کیسے چل سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پرائیویٹ پراپرٹی ہوگی تو ایک کلاس پیدا ہوگی کیونکہ اگر پرائیویٹ پراپرٹی نہ ہوتی تو کوئی کلاس پیدا نہیں ہوتی تھی، ایک مر گیا تو پھر کوئی اور آ گیا۔ اس لئے انہیں ایک ایسی مستقل کلاس کی ضرورت تھی جو ان کی حمایتی ہو اس لئے انہوں نے نجی ملکیت کا تصور دیا۔ زمینداروں کو تحفظ دیئے اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کی جائیداد تقسیم نہ ہونے پائے۔ جاگیرداروں کے نابالغ بچوں کی وراثت کے لئے کورٹ آف وارڈ بنا دیا جاتا جو اس جائیداد کی حفاظت کرتا تھا جب تک بچے بالغ نہ ہو جاتے تو یہ ان کی پالیسی تھی کہ ہندوستان میں زمینداروں کے طبقے جہاں جہاں ہیں، وہاں ان کی سرپرستی کر کے ان کے ذریعے سے رعایا کو کنٹرول کیا جائے۔ ان کی تعلیم کے لئے یہاں اچی سن کالج کھولا، اجمیر میں میو کالج کھولا، اودھ میں تعلق دار کالج کھولا تاکہ زمیندار طبقے کو یورپین تعلیم بھی ملے۔ انہیں آداب بھی سکھائے گئے، تو انہوں نے اس سلسلے میں پوری کوشش کی کہ اپنے حمایتیوں کی پوری ایک کلاس پیدا کریں۔

جنگ: کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے کرائے کی فوج پیدا کی؟

ڈاکٹر مبارک علی: انگریز ہندوستان میں آئے اور ہندوستان فتح کیا تو وہ ہندوستانی فوجیوں کے ذریعے ہی فتح کیا نا، فوجی ہی تو انہیں چاہئے تھے۔ پنجاب میں جو سکھوں کے ساتھ ان کی جنگیں ہوئی تھیں اس میں انہوں نے اندازہ لگایا کہ پنجابی اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے پنجاب میں دو کام کئے۔ ایک کام تو یہ کیا کہ کینال سسٹم بنایا اور کینال سسٹم آنے سے زراعت نے بہت ترقی کی اور پنجاب کو غلے کا گودام بنا دیا جہاں سے انہیں غلہ ملنا چاہئے تھا۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ جن علاقوں میں انہیں فوجی چاہئے تھے وہاں انہوں نے مثلاً چکوال اور اردگرد کے علاقوں میں ترقی نہیں ہونے دی۔ تاکہ وہاں کے لوگوں کے لئے کوئی متبادل روزگار نہ ہو تو پھر وہ فوج میں آئیں لیکن اس زمانے میں پنجاب سے ہی نہیں اور علاقوں سے بھی فوج میں جایا کرتے تھے مثلاً بنگال، پوربیا، راجپوت اور سکھ بھی ہوتے تھے کیونکہ وہ تو ایک پروفیشنل کیریئر تھا تو پنجابی اس میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے کیونکہ وہ زیادہ وفاداری، زیادہ محنت اور زیادہ بہادری سے لڑے اور ایک لحاظ سے پنجابیوں کا کریکٹر ہے کہ یہ مہم جو بہت ہیں اور کوئی

زیادہ پروانہیں کرتے جیسے آپ نے کہا کہ۔ ۔ نہ کعبہ پر گولی چلادی۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے کیا فرق پڑتا ہے (قہقہہ) تو وہ ایک لحاظ سے سیکولر کردار کے حامل تھے لیکن دوسری طرف یہاں پنجاب میں مذہبی شدت پسندی کی شہادت بھی ملتی ہے۔

جنگ: مثلاً

ڈاکٹر مبارک علی: مثلاً یہاں جتنی فرقہ وارانہ تحریکیں اٹھیں وہ بھی پنجاب سے اٹھیں ہیں۔ آریہ سماج، احمدیہ تحریک اور احرار بھی یہاں سے پیدا ہوئے۔ خاکسار بھی یہیں سے اٹھے۔

جنگ: لیکن تاریخی حوالے سے پنجاب کا عمومی کردار کیا رہا؟

ڈاکٹر مبارک علی: عمومی کردار کے لحاظ سے تو عام طور پر ہم ہر چیز کا ذمے دار پنجابیوں کو ہی ٹھہراتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے، اس لئے کہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ سب سے زیادہ آبادی ہے۔ ساری فوج پر ان کا قبضہ ہے۔ بیوروکریسی میں وہی ہیں۔ صنعت وحرفت کے اندر بھی وہ ہیں، تو ظاہر ہے کہ جب اس طرح سے کوئی بھی قوم یا گروپ چھا جائے تو اس کے خلاف ایک مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔

جنگ: کہیں تاریخ کے حوالے سے یہ بھی تو ہوسکتا ہے نا کہ پنجابی بہت ذہین ہوں وہ آگے نکل گئے یا اور کوئی بھی اس کی وجوہ ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں ہوتا ہے۔ ایک چیز تو ہے نا کہ پنجابیوں میں مہم جوئی (ایڈونچرازم) ہے۔ اب بہت سے سندھی اپنی زمین سے بہت زیادہ جڑے ہوئے ہیں یا آپ یہ کہہ لیں کہ زراعت سے بہت جڑا ہونا یا اس سے باہر نہ نکلنا پنجاب میں چونکہ نوآبادیاتی دور میں جو ترقی ہوئی ہے تو یہاں کیپٹل ازم بھی اپنی خام شکل میں آیا تو پھر ہوتا یہ ہے کہ زمین سے رشتہ اتنا نہیں رہتا پھر آدمی انٹرپرائزز ہوجاتا ہے۔ مہم جو ہوجاتا ہے۔ جہاں بھی مواقع ملیں وہ چلا جاتا ہے۔ پنجاب اس لحاظ سے ایڈوانس تھا تو یہاں پر زمین سے رشتہ اتنا مضبوط نہیں رہا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! آپ تاریخی حوالے سے کیا سمجھتے ہیں کہ چھوٹے صوبوں کو کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مطمئن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صوبائی خودمختاری دے دینی چاہئے۔ پہلی چیز تو یہ ہے پھر مرکز کو اتنا مضبوط نہیں ہونا چاہئے۔

جنگ: لیکن تاریخی حوالے سے تو یہ ثابت ہے کہ جو مضبوط مرکز کی حکومتیں تھیں وہی چلتی رہی ہیں۔ کمزور مرکز کی حکومتیں زوال پذیر ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی: لیکن یہ بھی ہمارا ایک پرانا تصور ہے نا لیکن اب وفاق کا جو تصور ہے اور ہے اور پھر دنیا بدلتی بھی رہتی ہے۔ اب وقت بدل رہا ہے۔ پہلے جمہوری روایات اتنی مضبوط نہیں تھیں اب زیادہ ہوگئی ہیں،

اس لئے اب لوگوں کو اپنے انفرادی حقوق کا بھی اور قومی وصوبائی حقوق کا زیادہ احساس ہو گیا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے اب مضبوط مرکز کا زمانہ نہیں رہا ہے اگر صوبوں کو ہم خودمختاری دے دیتے ہیں اور ان کے حوالے کر دیتے ہیں تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ پھر ان کی اپنی ذمے داری ہوگی۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! یہ جو مہاجرین کا مسئلہ ہے دنیا میں اور بھی اس طرح ہجرتیں ہوئی ہوں گی، لوگ مکس ہوئے ہوں گے تو یہ مسئلہ صرف ہمارے یہاں پیدا ہوا ہے یا دنیا میں اور جگہوں پر بھی ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں یہ مسئلہ تو تقریباً سب جگہ رہا ہے لیکن اس کا عمل مختلف رہا ہے۔ اب مثلاً یہاں سے بھی بہت سے لوگ بھارت گئے ہجرت کر کے لیکن وہاں پر یہ مسئلہ اب نہیں رہا وہ ایڈجسٹ ہو گئے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ جو سب سے بڑی ہے کہ یہاں سے جو لوگ ہجرت کر کے گئے۔ مثلاً سندھ سے ان کی اکثریت تاجر طبقے کی تھی۔ تو تاجر طبقے کو ایڈجسٹ کرنا آسان ہوتا ہے۔ ایک تو ان کی نقل وحرکت بہت ہوتی ہے۔ ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا لگا رہتا ہے، چنانچہ وہاں جتنے بھی سندھی گئے تھے بڑی جلدی ایڈجسٹ ہو گئے، اپنی تجارت کر رہے ہیں، خوشحال ہیں، ان کا کوئی پرابلم نہیں ہے لیکن وہاں سے جو لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں، خاص طور پر سندھ میں، وہ زیادہ تر ملازم پیشہ لوگ تھے۔ ملازم پیشہ افراد کی ذہنیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو نقل وحرکت ان کے اندر نہیں ہوتی، اپنی ترجیحات اور اسٹیٹس کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں تو یہاں ان کو ایڈجسٹ کرنے میں دقتیں پیش آئیں۔ ایک تو ان کی توجہ چند شہروں کی طرف رہی۔ مثلاً سندھ کے شہری علاقوں میں رش رہا، دوسرا ان کا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں زیادہ تر پروفیشنل کالجز میں جانا چاہئے۔ ڈاکٹر، انجینئر بننا چاہئے۔ قومی ملازمتیں لینی چاہئیں تو یہ ایک محدود دائرے میں رہے اور اپنے آپ کو آگے بڑھا نہیں سکے اس وجہ سے ان کا ملاپ اور رچنا بسنا نہیں ہوا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! تاریخی حوالے سے تو پنجاب میں بھی شروع میں یہ احساس رہا کہ بیوروکریسی اور سوسائٹی کا اوپری طبقہ جو تھا وہ اردو بولنے والوں کا تھا لیکن پنجاب نے تو اس طرح سے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا جس طرح پنجاب کے حوالے سے ردِعمل ہوتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں پنجاب کا مسئلہ دوسرا تھا کہ پنجاب کا اپنا شیئر بھی ٹھیک ٹھاک تھا یعنی فوج میں بھی، ملازمتوں میں بھی ٹھیک تھا اور دوسرے پنجاب، سندھ کے مقابلے میں اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا، سندھ تو بالکل ترقی یافتہ نہیں تھا۔ سندھ میں تو کوئی یونیورسٹی بھی نہیں تھی، لے دے کے ان کے ہاں اگر کوئی تعلیم یافتہ کلاس تھی تو وہ ہندوؤں کی تھی اور وہ تقسیم کے بعد چلے گئے تو اس لئے ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا تھا، اس خلا کو مہاجروں نے آگے پُر کیا پھر وہاں زبان کا فرق بھی ہوا۔ یہ دوسری زبان بولتے تھے۔ سندھی دوسری بولتے تھے۔ یہ شہری کلچر تھا، سندھی کلچر ابھی تک دیہاتی کلچر تھا، دونوں کے اندر ایک بڑا فرق رہا، ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے اور اس فرق کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔

جنگ: کیا انڈیا جانے والے وہاں مدغم ہو گئے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں وہاں مدغم ہو گئے ہیں۔

جنگ: تو یہاں کیوں نہیں ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہاں تھوڑا سا شاید وقت لگے کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک تو انڈیا بہت بڑا ملک ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ ان میں نقل و حرکت بہت تھی۔ یہاں سے زیادہ تر تاجر گئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ پنجاب سے بھی جو ہندو وہاں گئے ہیں ان کی زیادہ تعداد بھی تاجروں کی تھی۔ اب آپ دہلی جا کر دیکھیں سب بزنس کر رہے ہیں اور سب بہت خوش ہیں کسی کو کوئی پرابلم نہیں ہے یہاں جو مہاجروں کے ساتھ مسئلہ ہے کہ وہ ملازمتیں چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل بننا چاہتے ہیں، اس لئے یہ پرابلم رہا۔ دوسرا یہ کہ جب اتنا فرق ہو تو پھر مدغم ہونے اور سمانے کا عمل بہت آہستہ ہوتا ہے اور آپ دیکھیں کہ جو لوگ دیہاتوں میں آباد ہیں وہ بالکل سما گئے ہیں۔ اب آپ انہیں پہچان نہیں سکتے۔ پنجابی بھی اور سندھی بھی۔ مثلاً یہ جو قائم خانی ہیں، خان زادے ہیں، یہ زیادہ تر لوگ زراعت کرنے والے ہیں جیسے ہی راجستھان سے آئے تو وہ گاؤں کے اندر آ کر ہی سیٹل ہو گئے ہیں، وہ سب سندھی بولتے ہیں۔ آپ ان کو بالکل پہچان نہیں سکتے لیکن جو شہر میں آتے ہیں تو شہر میں چونکہ اکثریت اردو بولنے والوں کی ہے اس لئے شہر میں آنے کے بعد مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ کراچی میں آپ دیکھیں کہ ایک بڑی تعداد پٹھانوں کی ہے۔ اب وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی روایات بدل رہے ہیں۔ اب اگرچہ ان کے لئے بھی مشکل ہے کہ اپنی روایات ہر کوئی باقی رکھنا چاہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ دو تین نسلوں کے بعد مجھے کئی پٹھان بچے ملے وہ ایسی اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بولتا ہے پتا چلا کہ وہ جس محلے میں رہتے ہیں، جن بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کی بھی وہی زبان ہو گئی ہے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! کیا تاریخی حوالے سے ہم کوئی اور مثال پیش کر سکتے ہیں؟ جس طرح پاکستان میں مہاجروں کا مسئلہ پیدا ہوا دنیا میں اور کہاں ایسا ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اب خیر امریکہ کی مثال تو یہ ہے کہ وہاں تو سارے ہی مہاجر ہیں اور وہاں جو بھی جاتا ہے وسائل بہت ہیں۔ اس لئے لوگ کوشش کرتے ہیں کہ لوگ مدغم ہو جائیں تو وہاں ایک نسل کے بعد مل جاتے ہیں لیکن ابھی تک تمام باتوں کے باوجود جیسے وہاں اٹالین کمیونٹی ہے اس کی اپنی الگ سے پہچان ہے۔ آئرش کمیونٹی ہے اس کی اپنی پہچان ہے۔ جرمن الگ ہیں اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پورے طریقے سے جیسے ہم کہیں مدغم نہیں ہوتے۔ لیکن پھر بھی جہاں وسائل زیادہ ہوں، مواقع زیادہ ہوں، وہاں ادغام جلدی ہو جاتا ہے، اتنی زیادہ مزاحمت نہیں ہوتی۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! تحریک پاکستان کی طرف واپس آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سر آغا خاں، سرسیّد خان یہ سارے تو انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی: آغا خان کے تو ٹھیک ہیں انگریز حکمران کلاس سے بڑے تعلقات تھے لیکن سرسیّد کی مثال ذرا دوسری ہے۔ سرسیّد کے بارے میں، میں نے کافی لکھا بھی ہے۔ 1857ء کے بعد ہندوستان میں دوقسم کی تحریکیں چلی ہیں اور دوقسم کے رجحانات تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت ختم ہو رہی تھی خصوصاً ارسٹوکریسی نے دیکھا کہ اب کہاں جائیں تو ایک رجحان تھا جس کی وجہ سے دیوبند قائم ہوا کہ اب مسلمانوں کی کوئی سرپرستی نہیں رہی، سیاسی طور پر بالکل بے بس ہوگئے ہیں تو ان کی مذہبی شناخت کسی طریقے سے برقرار رکھی جائے تو ایک علیحدگی کا تصور تھا جو یہاں پر پیدا ہوا، دیوبند نے پیدا کیا، جیسے انہوں نے دارالافتاء قائم کیا کہ بھئی کوئی بھی آپ کے مسئلے مسائل ہوں ان کے فتوے ہم دیں گے یعنی اب آپ کو کورٹ میں جانے یا برٹش لاء کی ضرورت نہیں۔

جنگ: فتوے دینے کا رواج کب پیدا ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں فتوؤں کا رواج تب ہوا اور مختلف قسم کے تقریباً آٹھ دس ہزار فتوے ان کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ پراسیس چلا تھا ماڈرنائزیشن کا تو بہت دلچسپ سوالات آتے تھے۔ مثلاً ایک صاحب نے سوال پوچھا کہ فٹ بال کھیلنا جائز ہے یا نہیں، تو ان کا جواب تھا کہ یہ بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ یہ نیکر پہن کر کھیلا جاتا ہے اور جو نماز پڑھنے کے لئے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ ریڈیو سننا جائز ہے یا نہیں، تو انہوں نے کہا کہ نہیں بالکل جائز نہیں کیونکہ اس پر گانے آتے ہیں تو آپ گانے اور اچھی باتیں ساتھ کیسے سن سکتے ہیں (یہ دیوبند کے فتوی رشید یہ جو مولانا رشید گنگوہی کے چھپے ہوئے مجموعے میں یہ سب ہیں) کسی نے پوچھا تصویر بنانا تو آپ کو پتا ہے کیمرے کے علاوہ ہاتھ سے تصویر بنانے کے لئے بھی منع کیا تو کسی نے کہا اگر کوئی میڈیسن پڑھ رہا ہو تو انہوں نے کہا کہ اس صورت میں آپ پورے جسم کی تصویر نہ بنائیں بلکہ ہر عضو کی الگ الگ بنائیں اور اگر پورے جسم کی بنائیں تو چہرہ نہ بنائیں پھر کسی نے پوچھا کہ منی آرڈر سے پیسے بھیجنا کیسا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں منی آرڈر سے پیسے بھیجنا بھی جائز نہیں، تو یہ ایک بات بڑی دلچسپ تھی کہ نئی آنے والی چیزوں کے لئے یہ لوگ کس طرح ری ایکٹ کر رہے تھے یعنی روایت پسند تھے، ٹریڈیشنل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلم سوسائٹی اپنی روایات پر قائم رہے اور اس کی مذہبی شناخت رہنی چاہئے۔ یہ دیوبند تھا جس کے تعلیم یافتہ لوگوں نے ہندوستان میں جگہ جگہ مدرسے کھولے، اور سرسیّد احمد کی پالیسی اس سے مختلف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو مسلم ارسٹوکریسی ہے جس کا مغلوں کے بعد اب کوئی سہارا نہیں رہا ہے اس کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ ایک تو یہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسرا یہ اس حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ گورنمنٹ ملازمتوں میں جائیں جیسے مغلوں کی ملازمتیں کرتے تھے۔ اب انگریزی تعلیم حاصل کر کے انگریزی حکومت کی ملازمتیں کریں۔ یہی ایک راستہ ہے ان کی ترقی کرنے کا۔ 1857ء کا جو تجربہ تھا اس نے ان کے سامنے ایک چیز کو واضح کر دیا تھا کہ ہم لڑ کر یا جنگ کر کے یا مزاحمت کر کے ہم کچھ حاصل نہیں کر سکتے

لہٰذا سر سیّد احمد خان اس کے بعد سے سیاست کے بھی بہت مخالف تھے کہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔حکومت کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کا مستقبل اس میں پوشیدہ ہے کہ جدید تعلیم حاصل کریں اور حکومت کے وفادار رہیں اور ملازمتیں حاصل کر کے معاشی طور پر ترقی کریں۔ یہ تو مثالیں تھیں ایک دیوبند دوسرا سر سیّد کا اور دونوں کا ہندوستان کی مسلم کمیونٹی پر اثر ہوا تھا کیونکہ آپ دیکھیں کہ جہاں ایک طرف جہاں پورے برصغیر میں مدرسے کھل رہے تھے دوسری طرف سر سیّد کی طرز پر اسکول اور کالج کھل رہے تھے۔

جنگ: ان میں تضاد بھی واضح تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: بالکل دونوں میں تضاد تھا۔ دونوں میں مخالفت چلتی تھی کیونکہ دیوبندی تو بالکل علیحدگی کے حامی تھے کہ ہمیں بالکل نہ ہندوؤں سے تعلق رکھنا چاہئے نہ انگریزوں سے، ہمیں اپنی شناخت کو قائم رکھنا چاہئے۔ ہمیں حکومت کی ملازمتیں نہیں لینی چاہئیں۔ ہمیں بالکل اپنے آپ کو الگ کر کے اپنے دین کو اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہئے جب کہ سر سیّد کا موقف یہ تھا کہ ہمیں جدید زمانے کی جدیدیت اختیار کرنی چاہئے۔نئی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ حکومت سے تعاون کرنا چاہئے اور اسی سے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ یہاں پر پھر انجمن حمایت اسلام نے اسی طرح کالج کھولے۔ سندھ میں سندھ مدرسہ اور اس کے مقابلے پر دوسرے اسکول کھلے تو یہ دونوں سلسلے نو آبادیاتی دور میں چلتے رہتے تھے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب! یہ فرمائیں کہ کیا مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں سب سے بڑا کردار زبان کا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی: ان کا نیشنل ازم یہیں سے شروع ہوا ہے۔ اس کو ایسے کہیں کہ بنگالی نیشنل ازم زبان پر بنیاد رکھتا ہے۔ نیشنل ازم کی کئی چیزیں ہیں۔ لسانی نیشنل ازم، مذہبی نیشنل ازم بھی ہوتا ہے، علاقائی نیشنل ازم بھی ہوتا ہے، تو اس کی کئی شکلیں ہیں تو ان کا یعنی بنگالیوں کا لسانی نیشنل ازم تھا لیکن دوسری وجہ یہ تھی کہ جیسے آپ کو ہمیں معلوم ہے شروع ہی سے جو ان کے ساتھ سلوک کیا گیا، لہٰذا آزادی کے بعد بھی ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور انہیں کالونی کی طرح ٹریٹ کیا گیا یہ ہمارے یہاں کے بیوروکریٹس وہاں جا کر اسی طریقے سے برتاؤ کرتے تھے جو پہلے انگریزوں کے زمانے میں ہوتا تھا اور اس سے بڑھ کر ایک چیز یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں پاکستان کے فارن ایکسچینج کا سب سے بڑا ذریعہ پٹ سن تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ پٹ سن سے حاصل ہونے والا فارن ایکسچینج ان کی ترقی کے لئے خرچ ہونے کے بجائے مغربی پاکستان میں خرچ ہو رہا ہے تو جہاں اور وجوہات ہوئی ہیں کہ ان کو سیاست میں پورا حصہ نہیں مل رہا، وہاں ان کے ذہن میں یہ بھی ایک چیز تھی کہ جو فارن ایکسچینج کمایا جا رہا ہے وہ ان پر خرچ نہیں ہو رہا بلکہ اس کا بڑا حصہ مغربی پاکستان پر خرچ ہو رہا ہے تو چیزیں بڑھتی رہیں، اختلافات بڑھتے رہے لیکن اگر یہاں الیکشن ہوتے رہتے، جمہوری عمل جاری رہتا تو شاید صورت حال اس طرح سے نہ ہوتی اگرچہ میرا خیال یہ بھی ہے کہ ملک کے ان دونوں حصوں کے درمیان جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی طور پر اتنا فرق تھا تو شاید ہم بہت عرصے تک

ایک ساتھ رہ بھی نہیں سکتے تھے لیکن یہ تھا کہ اگر یہ علیحدگی پُر امن طریقے سے ہوتی اور اچھے طریقے سے ہوتی تو پھر وہ جو المیہ ہوا ہے، یہ نہ ہوتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کسی نہ کسی اسٹیج پر الگ تو ہونا ہی تھا کیونکہ یہ یونین فطری معلوم ہوتی نہیں تھی یعنی جس طرح کے سوالات تھے اور جو صورت حال تھی اس میں زیادہ دیر تک ساتھ رہنا مشکل تھا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب یہ پاکستان میں بنیاد پرستی کب پیدا ہوئی اور مختلف ادوار میں اس نے کیسے کیسے رخ بدلے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ بھی بہت دلچسپ بات ہے کہ ہم خاص طور پر پنجاب کے حوالے سے پھر بات کریں گے۔ یہ ایک ایسا صوبہ تھا جہاں پر سارے لوگ بہت متحرک تھے۔ مثلاً عیسائی مشنریز بھی یہاں پر جب آئے تو چونکہ شروع کے پیریڈ میں یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس میں انہوں نے انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے لوگوں کے مذہبی جذبات کو زیادہ نہیں چھیڑنا چاہئے پھر 1813ء میں جب ان پر بڑا دباؤ پڑا تو یہاں مشنریز آنا شروع ہوئے اور جب مشنریز آئے تو بلکہ 1857ء کے ہنگامے کی ایک بڑی وجہ سر سیّد اور دوسرے رہنما یہی بتاتے ہیں کہ مشنریوں کی وجہ سے لوگوں کو خطرہ تھا کہ اب حکومت ہمارا مذہب بدلنا چاہ رہی ہے۔ پنجاب میں جب مشنریز آئے تو سکھوں میں بھی تبدیلی مذہب ہوئی، ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ہوئی تو اس کا احساس تب ہوا جب یہاں مردم شماری کی رپورٹیں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ مثلاً 1881ء میں اور پھر 1891ء میں جب لوگوں نے دیکھا، مثلاً سکھوں میں اتنے سکھ عیسائی ہوئے اور اب اتنے عیسائی بڑھ گئے۔ اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے دیکھا تو وہ ایک دم اس طرف سے محتاط ہو گئے اور ایک شعور بیدار ہوا اور دوسرا یہ تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں مناظرے بہت ہوا کرتے تھے۔ مثلاً یہاں انارکلی کے اندر کوئی مشنری آیا اور ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اس نے تبلیغ شروع کر دی اور لوگ اس کے اردگرد جمع ہو کر باتیں سننا شروع کر دیتے تھے، اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ (کیونکہ مذہب کے دفاع کا مسئلہ تھا) ہندو بھی آئے، مسلمان بھی آگے آئے تو مناظروں کا ایک سلسلہ شروع ہو چونکہ اس زمانے میں کوئی تفریح نہیں تھی اس لئے ایک طرح سے انٹرٹینمنٹ بھی بن جاتا تھا لیکن اس نے ہر ایک کے اندر ایک مذہبی شناخت کو ابھارا۔ یعنی خواہ وہ ہندو ہو، سکھ ہو یا مسلمان ہو۔ ان سب میں ایک احساس ان مناظروں کی وجہ سے پیدا ہوا یعنی مشنریز کی وجہ سے، مردم شماری کی رپورٹس کی وجہ سے اور مناظروں کی وجہ سے اور پھر جب یہاں آریہ سماج کا اثر ہوا کیونکہ آریہ سماج بنی تو بمبئی میں لیکن سب سے زیادہ پذیرائی اس کی پنجاب میں ہوئی کیونکہ پنجاب کے شہروں میں مڈل کلاس ہندو بہت خوش حال بھی تھا اور اس کو اپنی مذہبی شناخت کا بھی احساس تھا، تو اب یہ ہوا کہ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان بھی کنورٹ کرتے ہیں، عیسائی اور سکھوں میں بھی کنورشن ہوتا ہے، ہندوؤں میں کنورشن نہیں ہے اس لئے انہیں یہ ڈر رہا کہ ہم تو

ایک دن ختم ہو جائیں گے۔اس لئے انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ جو ہندو مذہب سے دوسرے مذہب میں چلے گئے ہیں ان کو شدھی بنا دیا جائے یعنی انہیں دوبارہ سے ہندو کر دیا جائے۔آریہ سماج نے شدھی کے تصور کو پہلی بار پیش کیا اب اس کی وجہ سے انہوں نے بہت سے لوگ شدھی بنائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے اب ایک جماعت بنائی۔انہوں نے دیکھا کہ بہت سے قبائل ایسے ہیں۔ مثلاً میؤ تھے جو مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ان میں بہت سی ہندوانہ رسومات ابھی باقی تھیں اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں تھا، نام ان کے مسلمان تھے لیکن ان کی روایات ہندوؤں کی تھیں مثلاً قاضی نکاح پڑھاتا تھا تو وہ سات پھیرے بھی لگایا کرتے تھے تو انہوں نے کہا کہ جس طرح ہندو شدھی کر کے انہیں ہندو بنا رہے ہیں ایسے ہندو جو آدھے ہندو آدھے مسلمان ہیں، اسلام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، ہمیں انہیں پوری طرح مسلمان بنانا چاہئے تو مسلمانوں نے ایسے لوگوں اور ایسی برادریوں میں تبلیغ شروع کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی شناخت اور مذہبی جذبہ ایک دم بڑی شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا اور جب ہر ایک اپنے مذہب کی سچائی اور بھلائی کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر آدمی بہت محتاط ہو گیا اور پنجاب میں خاص طور پر یہ سب کے سب بہت متحرک تھے، پھر ہندوستان کے دوسرے علاقے بھی ظاہر ہے اس سے متاثر ہوئے لیکن اس وقت چونکہ ہم پنجاب کی بات کر رہے ہیں تو یہاں پر آریہ سماجی بھی، تبلیغی بھی، سکھ بھی، مشنریز بھی متحرک تھے پھر سکھوں میں بھی یہ تبدیلی آئی کہ اس وقت تک ان کے بہت سے گوردواروں کے نگراں مہنت یعنی ہندو ہوا کرتے تھے۔اس کے بعد انہیں بھی احساس ہوا کہ گوردواروں کو اپنے قبضے میں لیا جائے، اس کے لئے باقاعدہ انہوں نے پمفلٹ لکھے کہ سکھ ہندو نہیں ہیں بلکہ سکھ ایک علیحدہ مذہب ہے تو یہ ساری چیزیں نوآبادیاتی دور میں پیدا ہوئی ہیں، کبھی یہ سب شدت اختیار کر لیتی تھیں کبھی کم ہو جاتی تھیں۔پاکستان بننے کے بعد جو ایک سب سے بڑا مسئلہ تھا جو احرار نے اٹھایا تھا، وہ قادیانیوں کے خلاف تھا تو پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف ایک تحریک رہی 1953ء میں یہاں ہنگامہ ہوا، مارشل لاء لگا لیکن یہ تھا کہ اس کے علاوہ مذہبی جماعتیں اتنی طاقتور نہیں تھیں، جماعت اسلامی بھی پاکستان کے ابتدائی دور میں پاکستان میں اتنی طاقتور نہیں تھی بلکہ خود جماعت اسلامی کے اندر اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ ہمیں صرف دین تک رہنا چاہئے یا سیاست میں بھی حصہ لینا چاہئے۔آپ کو معلوم ہے اسی ایشو پر امین احسن اصلاحی جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔مولانا مودودی چاہتے تھے کہ ہمیں سیاست میں آنا چاہئے۔اس وقت تک یہ جماعتیں اتنی زیادہ فعال نہیں تھیں، اب ہم جو بنیاد پرستی کی بات کریں تو سمجھ لیجئے کہ دس پندرہ سال سے اتنی شدت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور اس کے پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ ہماری جمہوری اور فوجی حکومتوں کی ناکامی ہے۔مثلاً ایوب خان کے زمانے تک آرمی کا ادارہ بھی سیکولر تھا اور ایوب خان نے ڈکٹیٹر ہونے کے باوجود اس بات کی کوشش کی کہ جب آئین بنایا تو پہلے اس کا نام دیا تھا آئین پاکستان لیکن بعد میں پھر دباؤ کے تحت

اسلامک ری پبلک آف پاکستان کا نام دیا ورنہ شروع میں ایسا نہیں تھا پھر فیملی لاء اس نے پاس کئے تو ایک حد تک بنیاد پرستی دبی ہوئی تھی، میرے اپنے خیال میں بنیاد پرستی کو فروغ دینے والے ذوالفقار علی بھٹو ہیں، ایوب خان کے زمانے تک ماحول لبرل تھا بلکہ ایوب خان کے زمانے میں یہ تھا کہ انہوں نے جیسے مولانا مودودی کی مخالفت میں بھی لوگوں کو تیار کیا۔ غلام احمد پرویز کی تحریک بھی اس دور میں جاری تھی۔ ایوب خان چاہتے تھے کہ بنیاد پرستی کو اس طرح کاؤنٹر کیا جائے یا پھر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جو اسلام آباد میں کھولا ہے جس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر پروفیسر فضل الرحمٰن تھے، اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ ایک ترقی پسند اسلام کا تصور دیا جائے اور یہ جو انتہا پسند اور راسخ العقیدگی ہے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ ایوب خان کا زمانہ لبرل تھا اور اسلام کی بھی لبرل انٹرپریٹیشن...... کی اسٹیٹ کی طرف سے کوشش کی گئی۔

جنگ: بھٹو نے بنیاد پرستی کیسے شروع کی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جب بھٹو صاحب کے ہاتھ سے پاور نکل گئی اور وہ غیر مقبول ہونا شروع ہوئے تب انہوں نے مذہب کو استعمال کیا اور مذہب کو لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ مثلاً انہی کے زمانے میں خانہ کعبہ کے امام کو بلایا گیا کہ نمازیں پڑھائیں، قرات کانفرنسیں، سیرت کانفرنسیں کرائیں، خانہ کعبہ کے غلاف پاکستان سے جانے کا اہتمام ہوا پھر آگے چل کر جمعہ کی چھٹی کرانا اور پھر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا وغیرہ۔ انہی کے زمانے میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اسلامیات اور پاکستان اسٹڈیز تعلیمی سطح پر لازمی قرار دی جائے تو وہ ایک پراسیس بھٹو نے یہاں شروع کیا اور جو 1973ء کا آئین ہے۔ اس کی بات یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ یہ کہا گیا کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا۔ اس سے پہلے نہیں تھا، یہ تو تھا کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ مسلمان ہوگا لیکن یہ نہیں تھا کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا تو اس کی وجہ سے جو مذہبی اقلیتیں تھیں وہ بالکل غیر محفوظ ہوگئیں اور ضیاء الحق کو پورا موقع ملا اور بھٹو کے شروع کئے ہوئے پراسیس کو پوری طرح آگے بڑھایا تو ضیاء کے پیریڈ میں یہ پراسیس اپنی انتہا کو پہنچ گیا جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ کس طریقے سے انسٹی ٹیوشنز کو اسلامائز کیا گیا اور جب جمہوری عمل کم ہو جائے، انتخابات نہ ہوں تو پھر ایسے مواقع پر مذہبی جماعتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں، اچھا اب اس وقت جو صورتحال ہے وہ یہ ہے کہ جیسا لوگ کہتے ہیں کہ افغان بحران میں ان جماعتوں کو بہت زیادہ سپورٹ ملی اور بہت زیادہ پیسہ بھی ملا۔ اب اس وقت جماعت اسلامی کے پاس اتنا پیسہ ہے، ظاہر ہے سوچنے کی بات ہے کہاں سے آیا؟ اس کے ساتھ ان جماعتوں کی فنڈنگ کا ایک بہت بڑا ذریعہ وہ لوگ ہیں جو امریکہ اور یورپ میں رہ رہے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ ہے کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام آجائے گا اور یہی لوگ نظام لے کر آئیں گے تو حالات ٹھیک ہو جائیں تو اس لئے جتنی بڑی جماعتیں ہیں ان کے لوگ دوروں پر جاتے ہیں اور وہاں جا کر پیسے لے کر آتے ہیں تو اس لحاظ سے یہ مذہبی جماعتیں بڑے پیسے والی ہوگئی ہیں، افغان جنگ نے ان کو بہت زیادہ فائدہ دیا۔ یہ سمجھتے تھے کہ

جمہوری طریقے سے انہیں طاقت میں آنا چاہئے لیکن جو دو چار الیکشن ہوئے ان میں ان کو ناکامی ہوئی مذہبی جماعتوں کو، اب وہ جماعتیں بڑی تیزی کے ساتھ ابھر رہی ہیں جو جمہوری پراسیس پر یقین نہیں رکھتیں جیسے دعوۃ الارشاد والے ہیں، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت بالکل بے کار ہے، ہم لوگ مسلح جدوجہد سے طاقت میں آسکتے ہیں تو اس لئے ان جماعتوں میں جو ایک دوسرا کلچر آیا ہے، خاص طور پر دعوۃ الارشاد میں کہ اب وہ شہروں پر توجہ نہیں دے رہے بلکہ ان کی زیادہ توجہ دیہاتوں میں ہے جہاں وہ اپنے مدرسے بھی کھول رہے ہیں، اپنے سینٹر بھی کھول رہے ہیں، لوگوں کو ٹرینڈ بھی کر رہے ہیں تو یہ جو مسلح جدوجہد کا بھی خیال ہے کہ کشمیر میں جہاد کیا جائے، افغانستان میں جہاد کر چکے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے تو مطلب یہ کہ پھر پاکستان میں جو مخالف قوتیں ہیں یہ جہاد ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آنے والے دور میں پاکستان کے وجود کو ایک بڑا خطرہ ان مسلح جماعتوں کی وجہ سے ہوگا۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب تاریخی حوالے سے بتائیں کہ اس طرح کے مسلح گروپ پہلے بھی کبھی مسلمانوں میں بنے ہیں؟ اور اس کا کیا ردِ عمل ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ جو آپ نے بات کہی ہے نا کہ مسلح گروپوں کی تو یہ اس سے پہلے بھی ہوتے تھے، جب عثمانیہ سلطنت قائم ہوئی تو اس وقت بھی سرحدوں کے اوپر کچھ لوگوں نے جہادی گروپ بنائے تھے جو کہ مسلح جدوجہد کرتے تھے۔ یہ پندرہویں اور سترہویں صدی کی بات ہے۔ ایسے گروپ کا ہمیں اس زمانے میں پتا چلتا ہے لیکن اس وقت اسٹیٹ اتنی طاقتور تھی کہ جب اسٹیٹ قائم ہوئی تو یہ ختم ہو گئے۔ یہ تھا کہ اس زمانے میں سرحدوں پر نوجوانوں کے ایسے گروپ موجود تھے جو اپنے آپ کو غازی کہتے تھے۔

جنگ: سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان بھی ان میں سے ایک تھے؟

ڈاکٹر مبارک علی: عثمان تو بادشاہ بن گیا تھا، حکومت قائم کر لی تھی لیکن مشرقی یورپ کی سرحدوں کے اوپر عیسائیوں سے لڑائیاں ہوتی تھیں وہاں پر اس قسم کے گروپ بنے ہوئے تھے جو غازیوں کے گروپ کہلاتے تھے وہ پھر سرحد پار جا کر عیسائیوں سے لڑائیاں لڑتے تھے اور جب سلطان کی فوج جایا کرتی تھی تو اس میں بھی شامل ہو جایا کرتے تھے، تو اس قسم کے گروپ بنے ہوئے تھے جو غازیوں کے گروپ کہلاتے تھے وہ پھر سرحد پار جا کر عیسائیوں سے لڑائیاں لڑتے تھے اور جب سلطان کی فوج جایا کرتی تھی تو اس میں بھی شامل ہو جایا کرتے تھے، تو اس قسم کے گروپ وقتاً فوقتاً رہے ہیں لیکن اس زمانے میں ہتھیاروں کی اتنی فراوانی نہیں تھی اور پھر اسٹیٹ پاورفل ہوگئی تو سارے گروپ ختم ہو گئے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب اب ذرا اسلامی نظام کے حوالے سے بات کریں کہ یہ جو سب مسلمان ملک ہیں، چالیس، بیالیس۔ ان سب میں جمہوریت نہیں ہے؟ ان میں عدم استحکام بھی ہے۔ مسائل بھی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا اور اپنا کوئی مربوط نظام نہیں بنایا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں یہ آپ کا سوال کافی اہم ہے چونکہ جتنے بھی اسلامی ملک ہیں سب میں یا تو بادشاہتیں ہیں یا وہاں پر ڈکٹیٹرز ہیں۔ اب جہاں بادشاہتیں ہیں وہ بھی بعد کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی بہت خاندانی یا پرانی بادشاہتیں ہیں، وہ تو عباسیوں کے بعد یہ سلسلہ سارا ختم ہو گیا تھا اور یہ آپ کا سوال واقعی سوچنے والا ہے کہ آخر ایسا مسلمانوں کے اندر ہی کیوں ہے؟ اس میں ایک تو ہماری تاریخ میں مسلمان قوم کی جو سائیکی بنی ہوئی ہے اس میں ایک اسٹرونگ مین کا تصور بہت زیادہ راسخ ہو گیا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی طاقتور اور خوبیوں والا آدمی آئے گا تو ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی کیونکہ ہم ہمیشہ ہیروز کی تلاش میں رہتے ہیں اور جیسے خود اقبال کے ہاں بھی مرد مومن ہمارا جو ہے وہ بہت اسٹرونگ اور پاورفل ہے تو جہاں جن قوموں کے اندر اسٹرونگ آدمی کا تصور ہو وہاں ہمیشہ اینٹی ڈیموکریٹک عناصر پھلتے پھولتے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں بھی یعنی 1944ء سے پہلے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ان کے ہاں بھی سپرمین کا تصور تھا اور ان کے ہاں بھی طاقت ایک آدمی کے پاس ہو تو سمجھتے تھے کہ وہ نجات دہندہ ہو گا، اس لئے ہٹلر بھی ان کے یہاں مقبول ہوا لیکن 1945ء کے بعد جو سارا کرائسس ہوا ہے تو اس سے انہوں نے ایک سبق حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو نجات دلانی چاہئے اور گراس روٹ ڈیموکریٹک ویلیوز کو ابھارنا چاہئے اور ہمارے ہاں ابھی تک اسٹرونگ مین اور ہیرو کا تصور بہت مضبوط ہے۔ یہ ڈکٹیٹرشپ اور اینٹی ڈیموکریٹک ہے اور آپ اقبال کی پوری شاعری پڑھ لیں اس میں مردِ مومن سپرمین کے طور پر سامنے آتا ہے۔

جنگ: آپ سمجھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری غیر جمہوری ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بالکل غیر جمہوری ہے، وہ تو بالکل آمرانہ حکومت کا درس دیتے ہیں نہ صرف آمرانہ بلکہ یہ کہیے کہ میل شاونسٹ (مردانہ تفاخر) قسم کی ان کی شاعری ہے جس میں عورتوں کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسے نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد/یعنی عورت کچھ نہیں کر سکتی۔

جنگ: لیکن ان کی شاعری کا بھی بڑا اثر پڑا اور پاکستان بنانے میں ان کی شاعری کا بڑا کردار رہا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسی کا تو منفی اثر پڑا ہے پھر آج تک:

جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اور

آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

تو یہ دیکھیں نا ان کا بڑا زبردست اینٹی ڈیموکریٹک، اینٹی ویسٹ، اینٹی فائن آرٹس رویہ ہے۔ وہ پینٹنگ، مجسمہ سازی سب کے خلاف تھے۔

جنگ: لیکن ان کے جو لیکچرز ہیں ان میں تو وہ کہتے ہیں کہ جمہوریت ہونی چاہئے، روحانی ڈیموکریسی ہونی چاہئے۔

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں اس میں بھی وہ جمہوریت نہیں کہتے ہیں، لیکچرز میں انہوں نے کوشش یہ کی ہے کہ ویسٹ کی ان کے زمانے کی فلاسفی جہاں تک پہنچی تھی اس کو کیسے جدید کر کے مذہب کو اس میں شامل کیا جائے ورنہ ان کی شاعری تو پوری بڑی زبردست قسم کی شاونسٹ شاعری ہے۔

جنگ: آپ کے خیال میں سرسیّد کی بجائے اقبال کا منفی اثر ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں! اقبال کا ہوا، سرسیّد کا میں نہیں کہتا کہ اتنا منفی اثر تھا، چونکہ سرسیّد کے ہاں تو یہ تھا کہ انہوں نے ایک راستہ نکالا تھا جو وقتی طور پر ایک راستہ تھا۔

جنگ: اقبال نے تو عام لوگوں کو روحانی اور نظریاتی تحریک دی؟

ڈاکٹر مبارک علی: لیکن اقبال کے ہاں شاعری سے مشتعل کرنے کا بھی سلسلہ ہے۔ اقبال نے تو ماضی کے بارے میں بہت زیادہ یہ کیا ہے اور جنگ جویانہ ذہنیت کو ابھارا ہے جیسے

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں

وغیرہ۔

جنگ: تو کیا یہ غلط ہے سب؟

ڈاکٹر مبارک علی: کسی کو آپ یہ پیغام دیں گے تو بنیاد پرستی اور تشدد تو اس سے لازمی بڑھے گا۔

جنگ: تو کیا آپ کا خیال ہے بنیاد پرستی کو انہوں نے فروغ دیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ان سے بڑا اسہارا ملا ہے، ان تمام اشعار سے کہ

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

وغیرہ یہ تمام چیزیں جب کسی قوم کو الگ کر کے دوسروں سے ممتاز بنائیں کہ سب بہادری شجاعت اور ایمان کی خوبیاں ان کے اندر ہیں اور کسی اور کے اندر نہیں ہیں تو یہ تو بڑی شدت پسندی اور انتہا پسندی آ جاتی ہے نا تو اقبال کی شاعری کے بڑے منفی اثرات ہوئے ہیں اس قوم کے اوپر اور آج تک ہو رہے ہیں اور اسی لئے اقبال حکومت کا شاعر ہے اور جو بھی حکومت آتی ہے اقبال انہیں سوٹ کرتا ہے۔

جنگ: اقبال عوام کا بھی تو شاعر ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پتا نہیں عوام کا کتنا شاعر ہے لیکن حکومت کا شاعر ضرور ہے۔

جنگ: آپ کا خیال ہے اسلامی نظام سے مسئلے حل ہو جائیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اصل میں ایک سب سے بڑا سوال جو ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کیا ہے، ایک تو یہی بڑے جھگڑے کی بات ہے نا چونکہ کوئی پولیٹیکل سسٹم اسلام نے ڈیفائن (Define) نہیں کیا تھا، خود ہم

شروع سے دیکھتے آئے ہیں کہ جیسے حالات ہوئے ویسے حالات کے تحت سیاسی نظام آتا رہا۔ ایک تو یہ ہے کہ اسلام کے اندر کوئی کسی بھی قسم کا کوئی سیاسی، معاشی یا کوئی اس قسم کا نظام نہیں ہے، یہ حالات کے تحت ہے کہ آپ کو اپنے مذہب کو ایڈجسٹ کرتے رہنا چاہئے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ صوفیاء نے اسلام پھیلایا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسلام پھیلنے میں ایک فیکٹر صوفیاء کا بھی ہے لیکن جو سارا کریڈٹ ہم صوفیاء کو دیتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہے، اسلام پھیلنے کی بھی مختلف وجوہات ہیں، اس میں سیاست بھی رہی ہے۔ مثلاً جب یہاں مسلمان حکمران ہوئے بادشاہتیں قائم ہوئیں تو بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کو مسلمان ہونے کے بعد فوائد ملنے کی توقع تھی وہ بھی مسلمان ہوئے۔ ہندوؤں کا اپنا ایک سسٹم تھا یعنی نیچی ذات کے اچھوت لوگ تھے ان کے لئے بھی ایک چارم تھا کہ مسلمان ہو جائیں گے تو ہمارا اسٹیٹس بڑھ جائے گا، اقتصادی مفادات کے لئے بھی لوگ مسلمان ہوئے اور اسلام جو یہاں پھیلا ہے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کو کسی نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہو ایسا شاید ایک دو ہی ہوں گے، ہوا یہ ہے کہ مثلاً کسی قبیلے کا ایک سردار یا برادری کا کوئی چیف ہے جو کسی وجہ سے مسلمان ہو گیا تو ساری برادری اس کے ساتھ مسلمان ہو گئی۔

جنگ: بلا سوچے سمجھے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں بلا سوچے سمجھے...... یہ کہ ہمارا سردار ہو گیا ہے مسلمان تو چلیں ہم بھی ہو جاتے ہیں، اب اس کی اپنی سیاسی سوچ بھی ہو سکتی ہے، معاشی سوچ بھی ہو سکتی ہے، یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ مذہب صحیح ہو، ہر قسم کی سوچ ہو سکتی ہے یعنی یہ اسلام اس طرح سے آہستہ آہستہ پھیلا ہے یعنی اس کی باقاعدہ سے تبلیغی سرگرمیاں بہت کم تھیں، اچھا صوفیاء کا یہ طریقہ تھا کہ وہ کبھی بھی یہ نہیں کہتے تھے کہ بھئی مسلمان ہو جاؤ چونکہ صوفیاء کی اکثریت جیسے چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ سوائے نقشبندیوں کے وہ سب وحدۃ الوجود پر یقین کرتے ہیں تو ان کے لئے تو ہر مذہب سچا ہے جیسے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے بارے میں ہے کہ ان کے ہاتھ پر صرف ایک آدمی مسلمان ہوا اور وہ بھی بڑی ناراضگی کے ساتھ کیونکہ یہ تو کنورشن کی تبلیغ پر یقین نہیں کرتے تھے کہ خدا ہر چیز میں موجود ہے۔ ہر جگہ موجود ہے۔ ہر مذہب میں موجود ہے تو کیوں کسی کا مذہب بدلا جائے۔

جنگ: علامہ اقبال نے اورنگ زیب عالم گیر کو آئیڈیل حکمران کے طور پر پیش کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اچھا اورنگ زیب کے زمانے میں ضرور اس نے کوشش کی ریاست کی طرف سے کہ ہاں مواقع ملیں۔ مثلاً ایسا ہوتا تھا کہ کوئی جنگی قیدی آئے ان کی چوائس ہوتی تھی کہ آپ مسلمان ہونا چاہتے ہیں کہ نہیں؟ اگر مسلمان ہو گئے تو انہیں معاف کر دیا گیا تو اس لئے بہت سے لوگ جان بچانے کے لئے مسلمان ہو جاتے تھے۔

جنگ: کیا برصغیر کے مسلمانوں کے عروج کا زمانہ اورنگ زیب کا زمانہ ہی تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایک مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نظر آ رہا ہے کہ وہ سلطنت ٹوٹ بھی رہی ہے۔ اورنگ زیب ایک لحاظ سے بڑی عجیب وغریب شخصیت تھے۔ مثلاً یہ کہ پاکستان میں جو سیکولر لوگ ہیں وہ اورنگ زیب کو برا بھلا کہتے ہیں اور جو مذہبی لوگ ہیں وہ تعریف کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بالکل الٹ ہے وہاں سیکولر اورنگ زیب کا دفاع کرتے ہیں اور جو بنیاد پرست ہیں وہ اورنگ زیب کی مذمت کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے جو تحقیق کہتی کہ اورنگ زیب ایک سیاست دان تھا اور اسی لحاظ سے وہ حکومت کرنا چاہتا تھا جہاں اس کو ضرورت ہوتی تھی وہاں مذہب کے بارے میں وہ سختی کرتا تھا جہاں ضرورت نہیں ہوتی تھی وہاں رواداری برتتا تھا اس نے مندروں، جین مندروں اور گوردواروں کو اس نے زمینیں بھی دی ہیں۔

جنگ: فقہ حنفیہ کی تدوین بھی تو اسی دور میں ہوئی، فتاویٰ عالم گیری کا حوالہ اسی لئے ہی دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی: فقہ حنفیہ کی تدوین بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں اورنگ زیب کہتا ہے کہ میں نے فقہ کی مستند کتاب ترتیب دے دی ہے تاکہ علماء سے نجات مل جائے یعنی کتاب میں سب موجود ہے علماء کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ فقہ تدوین کر رہا ہے اب سب اسی کو تسلیم کریں اور اس میں یہ ہے مذہب کو اورنگ زیب نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا۔

جنگ: کہتے ہیں اس کے زمانے میں کرپشن بھی بہت تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: بہت کرپشن تھی اب مثلاً اس نے جو دارا شکوہ کو مروایا ہے تو ظاہر ہے وجہ تو سیاسی تھی لیکن اس نے سیاسی طریقے سے نہیں مروایا بلکہ علماء سے فتویٰ لیا کہ اس کو ملحد قرار دو اور قتل کر دو، دوسرے بھائی مراد کے بارے میں بھی اس نے اس شخص سے قصاص کا دعویٰ دائر کروایا جس کا باپ اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا حالانکہ اس نے مروایا تو سیاسی وجوہ کی بنا پر تھا لیکن سہارا مذہب کا لیا تو اورنگ زیب نے مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جہاں اس کو ضرورت نہیں تھی وہاں اس نے نہیں کیا لیکن اورنگ زیب اور اکبر میں جو فرق ہے کہ اکبر کی پالیسی صلح کل کی پالیسی تھی۔

جنگ: اورنگ زیب کا تو قاضی القضاۃ بھی سنا ہے رشوت لیتا تھا اور اس کی مرضی کے فتوے دیتا تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں اس کا قاضی القضاۃ عبدالوہاب رشوت لیتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ بغاوت کے کچھ قیدی آئے جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی تو اورنگ زیب نے قاضی سے پوچھا کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مسلمانوں نے بغاوت کی ہے انہیں قتل کر دیا جائے اور ہندو اگر مسلمان ہو جائیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے تو اس نے کہا کہ تمہیں فقہ حنفیہ کے علاوہ اور کوئی فقہ نظر نہیں آتا؟ دوبارہ دیکھو تو پھر قاضی نے کہا کہ اچھا بغاوت کی سزا موت ہے تو سب کو موت کی سزا ہونی چاہئے اس طرح سب کو قتل کر دیا گیا کیونکہ

اورنگ زیب انہیں قتل کروانا چاہتا تھا لہٰذا ان سب کو قتل کروادیا تو وہ اپنی مرضی کے فتوے لے لیتا تھا کہ ایسا نہیں ایسا فتویٰ چاہئے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب آپ فرمارہے تھے اورنگ زیب اور اکبر کی پالیسی کا فرق......؟

ڈاکٹر مبارک علی: اکبر کی پالیسی تھی صلح کل کی کہ سب مذاہب کے ماننے والوں کو برابر کا سمجھا جائے اور مساوی سلوک کیا جائے خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں، سکھ ہوں، عیسائی یا جینی یا پارسی ہوں لیکن اکبر سے پہلے کے بادشاہ کا اور اورنگ زیب کا یہ طریقہ تھا دیگر مذاہب کے ساتھ صلح کل یا مساوی سلوک کی بجائے رواداری کا سلوک ہو اور رواداری ہمیشہ طاقتور کمزور کے ساتھ برتتا ہے۔اس میں توازن نہیں ہوتا، اورنگ زیب نے اکبر کے ماڈل کو ختم کر کے پھر دوبارہ سے پہلے کے بادشاہوں کا رویہ اختیار کیا یعنی دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا سلوک انہیں کم تر سمجھ کر اپنے عقائد و مذاہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت ہو۔

جنگ: مغلیہ دور میں اسلامی نظام نافذ تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسلام نہ مغلیہ دور میں تھا نہ سلاطین کے دور میں، یہ پورا مسلمان پیریڈ ایک لحاظ سے بالکل سیکولر پیریڈ تھا۔

جنگ: اورنگ زیب کے زمانے میں تو اسلام نافذ تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں اسلام تو اورنگ زیب کے زمانے میں بھی نہیں تھا کیونکہ اورنگ زیب نے بھی کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے شریعت کا پورا نفاذ کر دیا ہے۔اور اصول یہ تھا کہ آئین جہاں بانی و جہاں داری اور ہے شریعت اور ہے تو اس لئے ان کا کہنا یہ تھا کہ سیاست کے تقاضے اور ہیں، شریعت کے تقاضے اور ہیں، دونوں کو مکس نہیں کرنا چاہئے۔مثلاً اورنگ زیب کا ایک بڑا مشہور خط ہے۔اس سے کسی نے کہا کہ ''آپ کی انتظامیہ میں بہت سے شیعہ ہیں ان کو نکال دینا چاہئے'' تو اورنگ زیب نے لکھا کہ ''سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں انہیں آپس میں ملانا نہیں چاہئے۔''

جنگ: اب ہم چلتے ہیں عہد اموی اور عہد عباسی میں؟

ڈاکٹر مبارک علی: (ہنستے ہوئے) اب آپ کہاں لا رہے ہیں مجھے! اچھا چلیں!

جنگ: ذرا اظہار خیال فرمائیں کہ ہم خلافت سے ملوکیت کی طرف کیسے آئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اصل میں اسلام عرب میں آیا۔ایک قبائلی سوسائٹی میں اور قبائلی سوسائٹی میں اندرونی طور پر جمہوریت ہوتی ہے اور ان کے یہاں اسلام سے پہلے کوئی ریاست بھی نہیں تھی۔سب سے پہلی ریاست مدینے میں قائم ہوئی۔تو وہ جو ٹرائیبل اسپرٹ تھی عربوں کی، وہ اسلام کے بعد جب تک تو وہاں رہی لیکن جب فتوحات کے ذریعے سے شام، ایران اور عراق میں آئے تو یہاں کی ساری روایات مختلف تھیں۔مثلاً شام اور عراق کے اندر بازنطینی روایات تھیں۔یہاں پر اس وقت کا بادشاہ بہت اہم تھا۔ایران

میں ساسانی اور ایرانی روایات تھیں۔ جس میں بادشاہ خدا کا نائب ہوا کرتا تھا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی جب ان کو پتا چلا کہ حضرت معاویہؓ بڑی شان وشوکت کے ساتھ رہتے ہیں تو حضرت معاویہؓ نے یہی کہا تھا کہ وہاں کے لوگوں کی نفسیات ایسی ہے کہ اگر میں عام لوگوں کی طرح رہوں تو میری کوئی بات نہیں مانے گا۔ تو یہ ایک جواز تھا کہ ہمیں یہ طریقہ اختیار کرنا ہے۔

جنگ: تو کیا اس زمانے میں اسلام نافذ تھا یعنی عہد اموی اور عہد عباسی میں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسلام کی جو ہم بات کرتے ہیں سیاست کے تحت وہاں کے حالات بدل رہے تھے۔ جیسی سیاسی ضروریات تھیں اسی کے مطابق قوانین بن رہے تھے۔ یعنی اموی پیریڈ میں بھی اور عباسی پیریڈ میں بھی۔ ایک تصادم جو بعد میں پورے عروج پر پہنچا، یہ عباسی زمانے میں پہنچا۔ ایرانی بیوروکریٹس تھے، وہ مسلمان ہونے کے بعد انتظامیہ میں چھائے ہوئے تھے تو ان کے اور عرب علماء کے درمیان ایک تصادم ہوا۔ علماء یہ چاہتے تھے کہ بادشاہ کو لامحدود اختیارات نہیں ملنے چاہئیں۔ اس کو شریعت کے اندر رہنا چاہئے لیکن ایرانی بیوروکریٹس کا ماڈل ایرانی بادشاہ تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ بادشاہ کے پاس ساری طاقت ہونی چاہئے اور شریعت کو بالکل الگ کر دینا چاہئے۔ ہوا یہ کہ اس میں علماء کو شکست ہوئی اور ایرانی بیوروکریٹس کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عباسی خلیفہ کو ساسانی بادشاہ بنا دیا جو تخت پر بیٹھتا تھا اور دربار لگا ہوتا تھا اور جس کے سامنے سجدہ بھی کیا جاتا تھا، اس کے ہاتھ پیر بھی چومے جاتے تھے۔

جنگ: یعنی شریعت نافذ نہیں تھی۔

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں شریعت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے قاضی اور مفتی وغیرہ رکھ رکھے تھے لیکن جہاں بادشاہ کی اپنی مرضی ہوتی تھی وہ خود ہی فیصلے کرتا تھا جس کو چاہا مروا دیا، جس کو چاہا چھوڑ دیا، جس کو چاہا انعامات دے دیئے۔

جنگ: ناؤنوش چلتی تھی...... دربار کا ماحول کیا ہوتا تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں ناؤنوش چلتی تھی، رقص ہوتے تھے اور جب بادشاہ چاہتا تھا تو فتوے بھی لے لیتا مثلاً نبیذ کا پینا جائز قرار دے دیا گیا۔

جنگ: کس کا؟

ڈاکٹر مبارک علی: کھجور سے جو شراب بنائی جاتی ہے اسے نبیذ کہتے ہیں۔

جنگ: یہ کس نے جائز قرار دے دی؟

ڈاکٹر مبارک علی: عباسی دور میں اسے جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی طرح حرم میں کنیزوں کا رکھنا بڑی تعداد میں بھی جائز قرار دے دیا تھا تو بادشاہ جب چاہتے تھے علماء سے اپنی مرضی کے فتوے لے لیتے تھے۔ اس لئے مذہب ہمیشہ سیاست کے تابع رہا ہے۔ پورے اموی عباسی پیریڈ میں بھی اور آخر میں بھی۔ ایک

دکھاوے کے طور پر عدالت ہوتی تھی۔ قاضی اور مفتی بھی ہوتے تھےلیکن بادشاہ کولامحدود اختیارات تھے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ ٹیپو سلطان کا تاریخ میں کیا کردار ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ٹیپو سلطان کے بارے میں ایک بات تو یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کو انگریزوں نے بہت بدنام کیا اور بدنام اس لئے کیا کہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں بہت دور رس تھے، انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

جنگ: بدنام کیسے کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: بدنام اسی طرح سے کیا کہ مثلاً وہ بہت سخت مذہبی تھا۔ اس نے زبردستی اسلام پھیلایا۔ ہندو رعایا پر اس نے بڑے مظالم کئے وغیرہ لیکن اب جو نئی ریسرچ ہوئی ہے اس میں یہ سارے الزامات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے عیسائیوں کو نہ صرف یہ کہ بلایا بلکہ بہت مراعات بھی دیں اور اس کی انتظامیہ میں بڑی تعداد میں ہندو بھی شامل تھے، وہ بالکل ایک جدید سیکولر تھا۔ نئے زمانے کے حالات سے واقف تھا یعنی یہ وہ آدمی تھا جس نے فرانسیسی انقلاب میں سرنگا پٹم میں ٹری آف لبرٹی (آزادی کا درخت) لگایا تھا۔ جب فرانس میں انقلاب آیا تو ٹیپو کے انقلابی حکومت سے تعلقات تھے جس کی وجہ سے اس نے باقاعدہ سرنگا پٹم میں ٹری آف لبرٹی لگایا تھا پھر نپولین کے ساتھ بھی اس کی خط و کتابت تھی اور بہت بعد میں اس نے فرانسیسی افسروں کو بھی بلایا تھا۔

جنگ: نپولین سے بھی اس کی خط و کتابت رہی اور یہ بھی کہا کہ میں اپنے بچے وہاں پڑھانا چاہتا ہوں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں تو وہ تو بہت ماڈرن تھا لیکن سب سے زیادہ خطرہ انگریزوں کو اسی سے تھا، اسی لئے جب ٹیپو کا خاتمہ ہوا ہے تو انگریزوں کو بہت سکون ملا ہے اور آپ نے دیکھا ہوگا وکٹورین الزبتھ میوزیم میں اس کا مجسمہ جس میں ایک شیر انگریز کو دبائے ہوئے ہے۔ ٹیپو کا کتب خانہ بھی بہت بڑا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ میں 1991ء میں بنگلور گیا تو وہاں ٹیپو سلطان کا ایک سرمائی محل ہے، وہاں جب میں گیا تو گائیڈ وہاں آنے والوں کو بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ ''ہمارے ٹیپو سلطان نے یہ کیا اور ہمارے ٹیپو سلطان نے وہ کیا'' تو ساؤتھ انڈیا میں اس کا بہت احترام کیا جاتا ہے اور میرے خیال میں ہمارے یہاں تاریخ میں ٹیپو سلطان کو ابھی وہ مقام نہیں ملا جو اسے ملنا چاہئے۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ محمد بن قاسم کے حوالے سے کئی باتیں اور بیانات شائع ہوتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی: ابھی حال ہی میں سندھ کی ہسٹری کانفرنس ہوئی تھی۔ محمد بن قاسم کے بارے میں جو تاریخ نویسی ہے اس میں دو رجحانات ہیں۔ ایک رجحان تو وہ ہے جسے ہم اسلام پسند کہیں یا رائٹسٹ کہیں، ان کا کہنا ہے کہ انہیں فخر ہے کہ محمد بن قاسم کی وجہ سے یہاں سب سے پہلے اسلام آیا، سندھ باب الاسلام بنا اور

سید سلیمان ندوی کا یہ کہنا ہے کہ دیکھا جائے تو صحیح اسلام سندھ میں ہی آیا چونکہ یہ عربوں کے ذریعے سے آیا اور عرب اسلام سے واقف تھے جب کہ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یہ لوگ ترک تھے۔ یہ اسلام سے اتنے واقف نہیں تھے تو شمالی ہندوستان کے اندر جو اسلام آیا وہ ایک طرح سے اتنا صحیح نہیں تھا۔ ایک نظریہ تو یہ ہے لیکن جب ون یونٹ کے بعد پنجاب کا حصہ بنا دیا گیا اور سندھ کی اپنی شناخت ساری ختم ہو گئی تو وہاں پر جو اپنی الگ شناخت ختم ہونے پر خفگی اور کشیدگی کا اظہار ہوا تو اس کے بعد جی ایم سیّد نے ایک نیا پوائنٹ آف ویو دیا جو آگے آئے گا اور جو ردِعمل ہوا کہ ہمیں باب الاسلام ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں ملا۔ تو اس کا بھی ایک ری ایکشن تھا کہ اپنی الگ شناخت کیسے ہونی چاہئے اور اپنی الگ شناخت کو پیدا کرنے کے لئے جی ایم سیّد نے جو بات کہی کہ محمد بن قاسم تو غاصب تھا اور حملہ آور تھا اور جی ایم سیّد نے جو دلیل دی وہ بالکل وہی تھی جو سلیمان ندوی نے دی تھی۔ جی ایم سیّد کا کہنا تھا کہ محمد بن قاسم جب سندھ آیا ہے تو خود عربوں کے اندر بھی اس وقت ملوکیت آ چکی تھی۔ اسلام سے وہ دور ہو چکے تھے اور عرب امپیریلزم تھا تو محمد بن قاسم امپیریل ازم کا نمائندہ تھا کوئی اسلام کا نمائندہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسلام کا نمائندہ تھا یا سندھ میں اسلام لایا جیسے دوسرے اور حملہ آور آئے اسی طرح محمد بن قاسم بھی آیا اور یہ غاصب اور جارح تھا۔ یہ محمد بن قاسم کے بارے میں جی ایم سیّد اور دوسرے سندھی نیشنلسٹوں کا رویہ ہے اور یہ کہتے ہیں کہ جس نے ملک کا دفاع کیا یعنی راجا داہر نے وہ ایک لحاظ سے ہمارا ہیرو ہے محمد بن قاسم ہیرو نہیں ہے۔

جنگ: آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میری بھی رائے تو یہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ راجا داہر کو ہیرو مان لیا جائے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی عرب امپیریل ازم کی ایک توسیع تھی یا ایک حصہ تھا کیونکہ عرب اسپین بھی جا رہے تھے۔ سینٹرل ایشیا میں بھی جا رہے تھے۔ عرب میں بھی امپیریل ازم بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک عرب ایمپائر کی وسعت تھی اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جنگ آپ یہ فرمائیں کہ محمود غزنوی اور افغان یہاں پر حملہ آور ہوئے ہیں، ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ بھی ظاہر ہے کہ حملہ آور تھے اور محمود غزنوی بھی، وہ یہاں آیا، وہ وسعت کے لئے بھی نہیں آیا بلکہ محض مال و دولت کے لئے یہاں آیا تھا کیونکہ سومنات سمیت جتنی بھی جگہیں فتح کیں، وہاں سے دولت لوٹی اور لے گیا اور اس نے سوائے پنجاب کے اور کسی علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔

جنگ: سومنات والا واقعہ کس حد تک درست ہے۔ ہندو تاریخ نویس اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: سومنات کا واقعہ یہاں تک تو سچا ہے کہ دولت لوٹی لیکن وہ جو واقعہ ہے نابت کو توڑنے والا وہ متنازعہ ہے کہ واقعی اس نے ایسا کیا کہ نہیں کیونکہ اس کے بارے میں ایک بہت اچھا آرٹیکل

رومیلہ تھاپر نے جو انڈیا کی مورخ ہیں، انہوں نے لکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فرشتہ اور دوسرے مورخوں نے بت توڑنے کی جو بات کہیں تو وہ ایک لحاظ سے محمود غزنوی کا اسٹینس بڑھانا چاہتے تھے۔ تاریخی طور پر بات درست نہیں ہے، اس کا مقصد صرف یہاں کی دولت حاصل کرنا تھا اور اس کے ذریعے سے ہی وہ وسطی ایشیا میں اپنی ایمپائر بنانا چاہتا تھا۔ یہ ایک انوسٹمنٹ تھا کہ یہاں سے لوٹا جائے وہاں انویسٹ کیا جائے۔ اسلام یا مذہب کا اس میں کوئی مقصد نہیں تھا اور یہی شہاب الدین غوری کا تھا۔ یہ سب امپیریلسٹ تھے۔ وسعت اور طاقت چاہتے تھے۔ مذہب کو انہوں نے استعمال ضرور کیا ہے یعنی اپنے سیاسی مقاصد کے لئے لیکن یہ نہیں تھا کہ سیاست مذہب کے تابع ہو بلکہ مذہب سیاست کے تابع تھا۔

جنگ: آپ کشمیر کے حوالے سے کیا دیکھتے ہیں۔ جب بھی اس قسم کی آزادی کی تحریک ہوئی ہے اس کا کیا نتیجہ نکلا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس قسم کی تحریکوں میں دو قسم کے نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخر کار بڑی قربانیاں دینے کے بعد کامیابی ہوتی ہے اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر بہت زیادہ کچلا جائے، بہت زیادہ طاقت سے دبایا جائے تو اس کو ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں ہوتی ہیں تو اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جہاں بھی اس قسم کی تحریکیں ہوتی ہیں ان کے اپنے وسائل کیا ہیں۔

جنگ: ڈاکٹر صاحب تاریخی حوالے سے اسٹیٹ آف پاکستان 53 سال سے قائم ہے۔ اب دنیا کے بدلتے تناظر میں اسٹیٹ آف پاکستان کے بارے میں جن شبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے تاریخ کے مطالعے سے کیا واقعہ لگتا ہے کہ پاکستان خطرے میں ہے؟ اور کیا تاریخی مطالعے سے پاکستان کے ٹوٹنے کے خدشات موجود ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: دیکھیں اس سے پہلے تو یہ تھا کہ یہاں علیحدگی کی بڑی تحریکیں تھیں لیکن اس وقت وہ علیحدگی کی تحریکیں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ مثلاً سندھ، بلوچستان اور فرنٹیئر میں جتنی بھی تحریکیں تھیں اب کوئی نہیں ہے۔ بہت محدود قسم کی ہیں اور ان کو پاپولر سپورٹ نہیں ہے تو فی الحال تو میں نہیں سمجھتا کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسی چیز ہو جس میں کہا جائے کہ اندرونی طور پر ایسی طاقتیں ہیں جو اس ملک کو توڑنا چاہتی ہیں۔ میرے خیال سے ایسی بات نہیں ہے لیکن اگر جیسی ہماری صورت حال ہے ہمارا سیاسی نظام چل رہا ہے اور لوگوں کے اندر مایوسی اسی طرح سے پیدا ہوتی رہی اور ان کی کوالٹی آف لائف بہتر نہ ہوئی تو آگے چل کر شدت کے ساتھ کچھ تحریکیں ابھریں گی۔ اس وقت وہ تحریکیں دبی ہوئی ہیں اور میرے خیال سے یہ موقع ہے پاکستان کی رولنگ کلاسز کے لئے اور پاکستانی فوج کے لئے کہ جس طریقے سے پاکستانی فوج نے پورے پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ کر ساری مراعات اپنے لئے لے لی ہیں۔ میرے خیال میں ان کو اپنے اس رویے کو بدلنا بڑا ضروری ہے۔

جنگ: تاریخ میں کوئی ایسی مثال ہے کہ کسی نے ایسا رویہ اپنایا ہو پھر اس کے......

ڈاکٹر مبارک علی: انڈونیشیا میں ایسا ہوا وہاں بھی آرمی نے یہ کیا تھا لیکن اب دیکھیں اس کے نتیجے میں انڈونیشیا میں ایک کشمکش جاری ہے۔ برما میں بھی یہی ہو رہا ہے، اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔

جنگ: کہتے ہیں برما میں فوجی بڑے کامیاب جا رہے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ابھی نظر تو ایسا ہی آتا ہے نا لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے تو یہ وقتی طور پر شاید ہمیں نظر آ رہا ہو کہ ہر طرح سے بالکل سکون ہے لیکن اندر ہی اندر لاوا پکتا رہتا ہے۔

جنگ: طالبان کی تحریک کا آپ کس طرح تجزیہ کریں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ جو طالبان کا Phenomenon ہے، یہ افغانستان کے لئے بڑی زبردست تباہی لایا ہے۔

جنگ: طالبان کی وجہ سے تو امن قائم ہوا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: امن تو لے کر آئے لیکن کس قیمت پر امن لے کر آئے۔ مثلاً جیسے کہ کہا جائے کہ آپ جنگ میں سب کو قتل کر دیں اور امن ہو جائے اس کے بعد کچھ بھی نہ بچے۔ طالبان افغانستان میں جس طریقے سے جس پسماندگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

جنگ: تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہے مسلم بنیاد پرست اس قسم کی پسماندگی لے کر آئے ہوں۔ کیا طالبان جیسا نظام کبھی پہلے بھی قائم رہا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں کبھی اس سے پہلے بنیاد پرست اس طرح سے کبھی کہیں پاور میں نہیں آئے۔ مطلب یہ کہ مولوی جو ہیں ایران میں سب سے پہلے ان کو سیاسی طاقت ملی ہے ورنہ اس سے پہلے بھی مولویوں کو سیاسی طاقت نہیں ملی ہے۔ مولوی ہمیشہ سیاست کے تابع رہے ہیں، یہ پہلی دفعہ ایران میں ہوا ہے۔ یہ بالکل نئی صورت حال ہے۔

جنگ: تو یہ آگے بھی پھیل سکتا ہے؟ طالبان پاکستان میں آ سکتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: آگے بھی پھیل سکتا ہے اور یہ کہ پاکستان میں اس وقت اس کے لئے پورا گراؤنڈ موجود ہے۔

جنگ: لیکن امام غزالیؒ نے تو کہا ہے کہ بنیاد پرستی بیس سال کے بعد ختم ہو جاتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں امام غزالیؒ تو خود بہت بڑے بنیاد پرست تھے۔ انہوں نے تو اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے کہ کوئی اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے کسی کا کہنا ہے کہ امام غزالیؒ نے اسلام کو بہت پیچھے کر دیا۔

جنگ: لیکن مسلمان انہیں ابھی بھی بہت مانتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں کیونکہ بہت بڑے بنیاد پرست تھے، وہ بہت زیادہ تو اس لئے جو بنیاد پرست ہیں انتہا پسند ہیں۔ ان کے لئے تو آج بھی وہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ اس سے پہلے مدرسے نہیں ہوتے تھے یہ جو مدرسوں کا سلسلہ شروع ہوا جب فاطمیوں نے الازہر قائم کیا۔ انہوں نے یہ اپنے داعیوں کی تربیت کے لئے کیا تھا۔ اس کا جواب دینے کے لئے نظام الملک جو سلجوق حکمران تھے، انہوں نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا۔ نظام الملک طوسی کے نام پر اس کے پہلے پرنسپل امام غزالیؒ تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ جو فاطمی پراپیگنڈہ ہے اسے روکا جائے تو وہ راسخ العقیدگی کے بڑے علمبردار تھے۔

جنگ: پنجاب کے آخری حکمران رنجیت سنگھ کو کافی غیر سنجیدگی سے لیا جاتا ہے آپ کی اس حوالے سے کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: وہ بھی مسلمانوں کا ہی رویہ ہے کہ رنجیت سنگھ کو نہیں مانتے اور وجہ اس کی یہ ہے پنجابی ہمیشہ پنجاب کو پنجابی مسلمان یا پنجابی ہندو سکھ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جو نسلی پنجابی نیشنل ازم ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ یہاں یہ فرق رہا اس لئے سکھ شاہی وغیرہ کہہ کر پورے سکھ پیریڈ کو اپنی تاریخ سے نکال دیتے ہیں جیسے سندھ والے اپنی تاریخ کو سب کچھ شامل کر کے پیچھے تک لے جاتے ہیں لیکن پنجاب میں یہ چیز شامل نہیں ہے تو یہ کہ پنجاب کے حوالے سے یہ سوالات بہت اہم ہیں جو یہاں بھی لوگوں کے ذہن میں ہیں کہ آخر پنجابیوں نے اپنی الگ سے ہسٹری اور اپنی شناخت کیوں نہیں لکھی، ہمیشہ مرکز سے متعلق ہسٹری لکھی ہے حالانکہ دیکھا جائے تو رنجیت سنگھ کا وہ پیریڈ ہے جس میں پنجاب خود مختار ریاست کے طور پر اٹھا ہے تو اس کو تو یہاں کے لوگ بالکل نظر انداز ہی کرتے ہیں شامل ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک سوال ہے جس کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ میں بھی اس بارے میں سوچتا ہوں سب قیاسات ہیں جن کے بارے میں آدمی سوچتا ہے کوئی شہادتیں نہیں جن کی بنیاد پر کوئی بات کی جائے۔

جنگ: آپ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کیا پیش گوئی کرتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اگر اسی طرح سے فوجی حکومتیں رہی اور جمہوریتیں اسی طرح ختم رہیں۔ پولیٹیکل پراسیس یہاں نہیں بڑھا تو آگے چل کر کافی انتشار اور بے چینی اور عوام کے خراب حالات نظر آتے ہیں اور اسی لئے لوگ بڑی تعداد میں یہاں سے بھاگ رہے ہیں خاص طور پر پڑھے لکھے اور پروفیشنل لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔

جنگ: اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کچھ آپ کہنا چاہئیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں صرف ایک چیز کہنا چاہوں گا کہ ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ کو نصاب سے بھی خارج کر دیا اور نصاب کی کتابوں میں ہم تاریخ کو جس طرح سے پیش کر رہے ہیں وہ ہم

پوری قوم کے ذہن کو بگاڑ رہے ہیں۔

جنگ: مثلاً کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: مثلاً جتنا بھی ہمارا قدیم دور ہے وہ ہم نے تاریخ سے بالکل نکال دیا ہے تو ہمیں کچھ پتا نہیں اس کے بارے میں اور ثابت اب یہ کیا جا رہا ہے کہ یہ جو پورا علاقہ ہے وہ کبھی ہندوستان کا حصہ ہی نہیں تھا، وہ ہمیشہ ہی تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے علیحدہ ہی رہا ہے اور ہمارے ثقافتی رشتے وسطی ایشیا سے زیادہ ہیں ہندوستان سے کم ہیں تو یہ جس قسم کی تاریخ ہم نصاب کی کتابوں میں پڑھا رہے ہیں خاص طور پر ہندو دشمنی اور انڈیا دشمنی اس کے اندر ہے، میں سمجھتا ہوں یہ ہمارے لئے بڑی خطرناک ہے۔ جب تک ہم اپنی تاریخ کو صحیح طریقے سے خاص طور پر نصاب کی کتابوں میں نہیں پڑھائیں گے ہم اپنی اگلی نسلوں کو صحیح معلومات نہیں دیں گے اور جب کسی کے بارے میں آپ نفرت پیدا کر دیتے ہیں تو پھر لوگوں کو ان کے بارے میں جاننے کا شوق بھی نہیں ہوتا، دوری اور فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔

جنگ: تھینک یو سر!

ڈاکٹر مبارک علی: آپ کا بھی شکریہ۔

(جنگ: سنڈے ایڈیشن 28 جنوری 2001ء)



تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی

انٹرویو: عمران

ڈاکٹر مبارک علی کا شمار ملک کے ممتاز ترقی پسند مورخین میں ہوتا ہے۔ اردو اور انگریزی متعدد جرائد میں تاریخ اور سماجی موضوعات پر ان کے عالمانہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ ہی کے مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً چالیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون ملک ہونے والے متعدد سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں برطانوی راج (ایک تجزیہ)، تاریخ ٹھگ اور ڈاکو، بدلتی ہوئی تاریخ، جاگیرداری، مغل دربار، تاریخ اور سیاست، نجی زندگی کی تاریخ، تاریخ اور معاشرہ، اکبر کا ہندوستان، جہانگیر کا ہندوستان، تاریخ اور دانشور، تاریخ کھانا اور کھانے کے آداب، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ، تاریخ اور عورت، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ کی روشنی، تاریخ شناسی، شاہی محل، المیہ تاریخ، اچھوت لوگوں کا ادب، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ اور مذہبی تحریکیں، غلامی اور نسل پرستی، تاریخ کیا کہتی ہے، سندھ: خاموشی کی آواز، علماء اور سیاست، ملحد کا اوور کوٹ، کیتھارینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت اور خود نوشت ''در در ٹھوکر کھائے'' شامل ہیں۔ ان کی زیر ادارت سہ ماہی ''تاریخ'' 1999ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

☆......کیا تاریخ کے حوالے سے مروجہ نظریات دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں یا ان نظریات میں بھی اصلاحات کی ضرورت ہے؟

O......آجکل تاریخ کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ کے مضمون کی موجودہ زمانے میں ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ صنعتی دور تیز رفتار ہوتا ہے اور تاریخ اس رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ان کے نزدیک تاریخ زرعی معاشروں کے لئے تو مفید ہے مگر آگے چل کر غیر مفید ہو جاتی ہے دوسری رائے یہ ہے کہ قوموں کو ماضی کے بجائے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہئے۔ تاریخ چونکہ ماضی کا ریکارڈ ہوتی ہے اس لئے ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب ماضی کو بہت زیادہ سوچا جائے اور پیچھے کی طرف دیکھا جائے تو ترقی کی راہ میں رکاوٹ آتی ہے۔ ایک تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ تاریخ اہل اقتدار یا حکمران طبقوں کے لئے تو مفید ہوتی ہے

کیونکہ وجہ اس کے ذریعے اپنے خاندان، قبیلے اور ذات کی برتری ثابت کرتے ہیں اور یہ جواز دیتے ہیں کہ چونکہ ہماری نسلیں حکومت کرتی رہی ہیں اس لئے ہمیں اقتدار میں رہنا چاہئے۔ یہ نقطہ ہائے نظر روایتی تاریخ نویسی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن جو جدید تاریخ لکھی جارہی ہے اس کا دائرہ سیاست تک نہیں بلکہ اس میں ثقافت، معیشت، روزمرہ کی زندگی وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ جدید یا غیر روایتی تاریخ یعنی نچلی سطح کی تاریخ۔ اس تاریخ میں یہ کوشش کی جارہی ہے کہ تاریخ میں ان طبقات کا ذکر ہو جنہیں اب تک تاریخ سے خارج کئے رکھا گیا ہے کیونکہ تاریخ بنانے کے عمل میں ان نچلے طبقات کا بہت حصہ ہوتا ہے۔ جیسے خانہ بدوش، چرواہوں یا تاجروں کی تاریخ ہے۔ اگر کسی طبقے کو تاریخی عمل میں شامل نہ کیا جائے تو اس کو معاشرے میں بھی کوئی درجہ نہیں دیا جاتا۔ انہیں بغیر تاریخ والے لوگ (History Less People) کہا جاتا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کو بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اگر ان کے حصے کو تاریخ کی تشکیل میں شامل کیا جائے تو انہیں معاشرے میں عزت اور احترام ملتا ہے۔

جدید تاریخ نویسی کی روایت نے اپنے دائرہ کار کو بڑھا لیا ہے یہاں تک کہ اب انسانی جذبات کی تاریخ لکھی جارہی ہے جیسے ایک کتاب ''غصے کی تاریخ'' شائع ہوئی ہے۔ ایسی کتابوں کو پڑھ کر معاشرتی برتاؤ اور رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تاریخ پورے انسانی رویوں جذبات اور رجحانات کو اپنے دائرہ کار میں لارہی ہے۔ تاریخ ماضی اور حال کو ملاتی ہے اور ہمیں ان تبدیلیوں سے آگہی ہوئی ہے جو تاریخی عمل کا حصہ ہیں۔ اس لئے معاشرے میں اگر تاریخی شعور ہو تو وہ تبدیلی سے نہیں گھبراتا ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ لوگ تبدیلی سے ہمیشہ گھبراتے ہیں۔

☆......جغرافیہ اہم ہے یا تاریخ؟

O......میرے نزدیک تو تاریخ ہی زیادہ اہم ہے کیونکہ تاریخ کا دائرہ کار جغرافیہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

☆......تاریخ اور ادب کا باہمی رشتہ کیا ہے؟

O......تاریخ اور ادب دونوں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ معاشرے اور انسانی ذہن کا تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن دونوں کے طریقہ کار میں فرق ہے۔ تاریخ واقعات اور شہادتوں پر انحصار کرتی ہے جبکہ ادب اس قید و بند سے آزاد ہوتا ہے اور وہ مورخ سے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے تخیل کی مدد سے معاشرے کی عکاسی کر سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال تقسیم ہند ہے۔ مورخ جب تقسیم کے بارے میں لکھتا ہے تو وہ محض واقعات پر بھروسہ کرتا ہے۔ اس میں وہ انسانی جذبات اور دکھ نہیں ہوتے جنہیں ایک ادیب بہتر طریقے سے محسوس کر کے لکھتا ہے۔ منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے افسانوں کے ذریعے تقسیم کے حوالے سے جو جذبات سامنے آتے ہیں وہ مورخ کی نسبت زیادہ بھرپور ہیں۔ اس ضمن میں میں یہ کہوں گا کہ مشتاق احمد یوسفی کی ''آب گم'' میں تقسیم سے پہلے اور بعد کے المیے کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ادب کی اس اہمیت کو دیکھتے ہوئے مورخ اب ادب کو بھی بطور ماخذ استعمال کرنے لگے ہیں۔

☆...... ''تاریخ کا جبر'' سے کیا مراد ہے؟

O...... یہ اصطلاح اب متروک ہوگئی ہے کیونکہ یہ نظریہ فرد اور معاشرے کے کردار کو ختم کر دیتا ہے اس لئے مورخ اب یہ کہتے ہیں کہ فرد اور معاشرے تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں۔ کارل مارکس کا جملہ ہے کہ ''انسان اپنی تاریخ خود بناتا ہے مگر اس طرح سے نہیں جیسے اس کی خواہش ہوتی ہے'' کیونکہ ایک طرف انسان کا اپنا ارادہ، عزم اور منصوبہ ہوتا ہے اور دوسری طرف سیاسی، سماجی، معاشی طاقتیں ہوتی ہیں جو تاریخ کی تشکیل میں اپنا حصہ ادا کرتی ہیں۔

☆...... آج کل دہشت گردی اور انتہا پسندی کا بہت چرچا ہے۔

O...... دہشت گردی اور انتہا پسندی کی کوئی ایک تعریف تو نہیں ہو سکتی دہشت گردی کے خاتمے کا اعلان امریکہ کر تو رہا ہے لیکن دوسری طرف وہ خود بھی دہشت گردی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایک طرف فرد اور جماعتیں اگر دہشت گرد ہوتی ہیں تو دوسری طرف ریاستیں بھی دہشت گرد ہوتی ہیں جو اپنے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کو سختی سے کچل دیتی ہیں۔ میرے نزدیک امریکہ اور اسرائیل دونوں دہشت گرد ریاستیں ہیں۔

☆...... پاکستان میں جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس تاریخی المیے کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

O...... پاکستان کی تاریخ کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ یہاں پر جمہوری ادارے مستحکم نہیں ہو سکے اور فوج کی بار بار مداخلت نے دوسرے اداروں کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت فوج ہی کا ایک ادارہ رہ گیا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے ہر شعبے کو چلانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم بیوروکریسی اور تمام سویلین عہدوں پر فوجی تعینات ہیں۔ اس کی وجہ سے غیر فوجی ادارے ناکارہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا اثر آنے والے وقت پر بہت مضر ہوگا۔

☆...... ہمارا بنیادی تعلیمی مسئلہ؟

O...... تعلیم کا حق ہر فرد کو نہیں دیا جا رہا ہے۔

☆...... اور بنیادی قومی مسئلہ؟

O...... حکومت میں عام لوگوں کا حصہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ریاست اور عوام میں بہت دوری آ گئی ہے۔

☆...... حکومت دینی مدارس کے حوالے سے کچھ اصلاحات متعارف کرا رہی ہے۔ اس ضمن میں آپ کی رائے؟

O...... میرا خیال ہے کہ محض انگریزی، کمپیوٹر یا کمپیوٹر کی تعلیم یا سائنسی مضامین کے پڑھنے سے سائنسی سوچ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نصاب تعلیم ایسا ہو جو ذہن کو فکر کی آزادی دے اور سوچنے کا

موقع دے۔ ورنہ انگریزی پڑھے لکھے بھی بنیاد پرست ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک نصاب کو تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ سکولوں کا اور مدرسوں کا بھی اس وقت تک روشن خیال اور لبرل ذہن پیدا نہیں ہو سکیں گے۔

☆......معاشرتی اصلاح احوال کے سلسلہ میں اہل دانش کے کردار سے آپ مطمئن ہیں؟

O......کسی بھی معاشرہ کے بنانے میں اور سوچ کو تبدیل کرنے میں دانشوروں کا بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ دانشور کو ریاست کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسے ریاست واقتدار سے باہر رہ کر تنقیدی نظر سے حالات کا جائزہ لینا چاہئے۔

☆......گیارہ ستمبر کا واقعہ بین الاقوامی زندگی میں کچھ زیادہ ہی اہمیت اختیار نہیں کر گیا؟

O......گیارہ ستمبر کا واقعہ اور اس کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ ایک یہ امریکہ میں ہوا دوسرا اس کے پس پردہ میڈیا کا پروپیگنڈہ لیکن اگر دیکھا جائے تو اس سے زیادہ تباہ کن اور دوررس اثرات کے واقعات تو ہو چکے ہیں، جیسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کا گرانا اور ان کی تباہی۔ ویت نام میں امریکہ مداخلت و جنگ، لیکن ان واقعات کو اس لئے پس منظر میں رکھا جاتا ہے کہ یہ امریکی مفادات میں نہیں ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد افغانستان میں امریکی بمباری سے جتنے شہری مارے گئے ہیں ان کی تعداد ورلڈ سنٹر میں مرنے والوں سے زیادہ ہو گئی ہے لیکن تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ جس کے پاس طاقت ہوتی ہے سچائی پر بھی وہ اپنی اجارہ داری قائم کر لیتا ہے۔ امریکہ اس جنگ کو مہذب دنیا اور غیر مہذب دنیا کے درمیان ایک تصادم قرار دیتا ہے لیکن تہذیب کے نام پر جو قتل وغارت گری اور انسانی حقوق کی پامالی امریکہ نے کی ہے اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے اور گیارہ ستمبر کا ایک اہم اثر جو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کا جبر اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ نئے قوانین نے حقوق انسانی کو سلب کر لیا ہے اور فرد کی آزادی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

☆......ڈاکٹر صاحب انسان نے تھری پیس تو پہن لیا لیکن قابیل کے ہاتھ اب بھی اپنے بھائی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں آپ کیا کہیں گے ترقی انسان نے کی ہے یا انسانیت نے؟

O......بعض مفکروں کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ اپنے ابتدائی دور میں انسان کو اپنی بقا کے لئے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی اس لئے اس میں بربریت، وحشت، خودغرضی، لالچ کی خصلتیں پیدا ہوئیں۔ تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ معاشروں کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس کی جارحانہ خصلتوں کو دبا کر اس کے کردار کی اس طرح سے تشکیل کی جائے کہ وہ باہمی طور پر مل جل کر رہ سکیں، لیکن جب بھی فرد یا معاشرے کو بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت اس کی یہ تمام خصلتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں اور تہذیب کا وہ لبادہ جو اوڑھے ہوئے ہوتا ہے وہ اتار پھینکتا ہے۔

☆......کیا تاریخ واقعی ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟

O......تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں ہے یہ پرانا تصور ہے۔ تاریخ ہمیشہ آگے کو جاتی ہے، تاریخ

کی حرکت کے چار نظریے ہیں پہلا گردش کا دوسرا ایوترقی کا، تیسرا پنڈولم کبھی دائیں کبھی بائیں۔ چوتھا قوموں کے عروج زوال See-Saw کا۔ یہ تاریخ کی چار حرکتیں ہیں لیکن تاریخ کا دہرانے والا نظریہ اب غلط ہو چکا ہے۔

☆......ڈاکٹر صاحب پانچواں موسم کیا ہوتا ہے؟

O......وہ جو آپ کو پسند نہیں آئے۔ گرمی بہت پڑتی ہے تو اچھی نہیں لگتی ہر موسم کے اندر ایک موسم ہوتا ہے جو آپ کو پسند بھی آتا ہے اور نہیں بھی پسند آتا۔

☆......کبھی ملک سے باہر گئے ہیں، پاکستان سے باہر جا کر کیا محسوس ہوا؟

O......اگر یورپ جانا ہو تو خواہش ہوتی ہے کہ پاکستان بھی ایسے ہی ہو یہاں تک کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو بھی دیکھ کر بھی جیسے تھائی لینڈ وغیرہ تو بھی احساس ہوا کہ کیا پاکستان ایسا نہیں ہوسکتا؟

☆......یہ احساس کیوں کر ہوا؟

O......صفائی، قانون کی پابندی، لوگوں کے بولنے کا مہذب انداز، شہروں کا نظم وضبط، گاؤں اور دیہاتوں کی خوبصورتی، تاریخی مقامات کی حفاظت، ان سب چیزوں کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اگر ہم بھی اس جیسا ہونے کی کوشش کریں تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔

☆......لاہور کے تاریخی مقامات آپ نے بھی دیکھے ہوں گے؟

O...... پاکستان میں لاہور ہی ایک ایسا شہر ہے کہ جس میں سلطنت اور مغل عہد کی تاریخی عمارتیں سب سے زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ سے اس شہر کے ماحول اور فضا میں تاریخ چھائی ہوئی ہے اور شہر کی زندگی میں ہم اس تسلسل کو دیکھ سکتے ہیں جو تاریخی طور پر اس کے ورثے میں آیا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے ان تاریخی آثار اور عمارات کی وہ حفاظت نہیں کی جس کی یہ مستحق ہیں۔ کیونکہ ان عمارتوں کے ذریعے ہم اپنی ماضی کی نسلوں کے ہنر، دستکاری، فن تعمیر اور احسان جمالیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ عمارتیں لاہور کے لئے ایسی ہی ہیں جیسے کہ زنگ لگے زیورات جو خوبصورتی کو مدھم کر رہے ہیں۔

(نوائے وقت: سنڈے میگزین 23 جنوری 2002ء)

☆☆☆

تاریخ کا تعلق طاقت سے ہے

انٹرویو: توقیر چغتائی

ڈاکٹر مبارک علی کا شمار ان روشن خیال تاریخ دانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ کے حقیقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور پاکستان کی نوجوان نسل میں تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کا شعور بیدار کیا۔ تاریخ کے موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف اور مرتب کیں۔ آج کل لاہور کے ایک اشاعتی ادارے فکشن ہاؤس کے پلیٹ فارم سے ایک سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ یہ رسالہ تاریخ کے طالب علموں اور روشن خیال قارئین کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی نئی راہیں متعین کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات کے دوران جو بات چیت ہوئی اسے ''جفاکش'' کے قارئین کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال: تاریخ کا ایک روایتی اور سرکاری طریقہ ہے، اسے توڑنے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: جب سے نوآبادیاتی نظام ختم ہوا اور نیشنل اسٹیٹس قائم ہوئیں تو ہر اسٹیٹ کی ضرورت تھی کہ اس کی اپنی ایک تاریخ ہونی چاہئے۔ جسے وہ قومی تاریخ کہتے ہیں۔ لہٰذا جب قومی تاریخ لکھی جاتی ہے تو ان چیزوں کا ہی زیادہ چرچا ہوتا ہے جنہیں اسٹیٹ پسند کرتی ہے۔ اور یوں تاریخ کے مسخ ہونے کا آغاز ہوتا ہے۔ دوبارہ تاریخ اس وقت مسخ ہوتی ہے جب کوئی ریاست نظریاتی ریاست ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس صورت میں صرف وہی چیزیں لکھی جاتی ہیں جو ان نظریات کو مضبوط کرتی ہیں، اور ایسی چیزیں نہیں لکھی جاتیں جو ان نظریات سے ٹکراتی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں طریقوں سے تاریخ مسخ ہوتی ہے۔ یعنی قومی ریاست اور نظریاتی ریاست کے تصورات نے تاریخ کو ہمیشہ مسخ کیا۔

پاکستان میں یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلیں۔ ایک تو پاکستان قومی ریاست کے حوالے سے ایک نیا ملک بنا تھا اور اس کا جواز بھی چونکہ تاریخی حوالے سے پیش کرنا تھا اس لئے انہی چیزوں کو تاریخ میں شامل کیا گیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے بنانے کی جو جدوجہد کی گئی ہے وہ صحیح تھی اور جو وجوہات تھیں ان میں قومی نظریہ بھی ہے جسے آگے چل کر انہوں نے نظریہ پاکستان کا نام دیا۔ تاریخ کو مزید مسخ اس وقت کیا گیا جب

ریاست میں ایک نظریہ کو داخل کیا گیا۔ لہٰذا ہمارے ہاں تاریخ کو دو طرح سے مسخ کیا گیا۔ قومی ریاست کے تصور سے اور نظریاتی ریاست کے تصور سے۔ تاریخ کو چاہے جتنا بھی محدود کیا جائے (جیسا کہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر نے کیا) لیکن بہت سے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کو اگر چھوڑ دیا جائے تو پھر تاریخ کو پورے طریقے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم نے جب پاکستان کی تاریخ پڑھنا شروع کی جو ہمارے کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی تو ہمیں محسوس ہوا کہ اس میں بہت ساری چیزیں اور بہت سارے پہلو ایسے ہیں جو کہ پورے طریقے سے واضح نہیں ہیں۔ اس لئے انسان کو تجسس ہوتا کہ ان دوسرے عناصر کو بھی دیکھیں ان پہلوؤں کو دیکھیں جنہیں نظر انداز کیا گیا۔ چنانچہ اس شوق اور تجسس نے کہ تاریخ کے نظر انداز کئے گئے پہلوؤں کو سامنے لایا جائے اور تاریخ کا جو روایتی اور ریاستی نقطہ نظر ہے جس نے ذہن کو ایک ہی دائرے کے اندر محدود کر کے رکھ دیا ہے اس سے ذہن کو چھٹکارا دلانا چاہئے۔ کیونکہ علم کا سب سے بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہن کو آزاد کرے، ریاست کا کام ہوتا ہے کہ ذہن کو قید کر کے، اس لئے اس قسم کی کوشش ہر جگہ رہی ہے کہ ریاست کے نظریات کو چیلنج کیا جاتا رہا ہے اور ذہن کو آزاد کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ تاریخ کا جو روایتی یا ریاستی تصور ہے اسے چیلنج کر کے یہ کوشش کی جائے کہ ایک وسیع نقطہ نظر کو جس کے اندر عورتیں اور اقلیتیں بھی شامل ہیں ان سب کو تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ تاریخ کا حصہ نہیں ہوں گے اس وقت تک ان کی حیثیت کو یا ان کی شناخت کو معاشرے کے اندر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

سوال: آپ نے ریاست کی باتیں کی تو میں ضیاء الحق کے دور کی بات کروں گا جس میں پاکستان کی تاریخ پر ڈھیروں کتابیں لکھوائی گئیں ان اداروں اور کتابوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ضیاء الحق کے دور میں تاریخ کو مسخ کرنے کا جو سلسلہ تھا وہ تیز ہو گیا۔ ورنہ یہ سلسلہ اس سے قبل شروع ہو چکا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی نئی ریاست بنی تو یہ سوال تھا کہ اب کریڈٹ کس کو دینا چاہئے۔ تو پھر ہم ہیروز بناتے ہیں۔ تاکہ سیاست پر ان کی اجارہ داری قائم رہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں جو سیاسی خاندان ہیں ان کے بارے میں کہا گیا کہ چونکہ انہوں نے پاکستان کو بنانے میں اہم رول ادا کیا لہٰذا انہیں سیاسی اجارہ داری ملنی چاہئے۔ ایک چیز تو یہ تھی۔ دوسری چیز یہ تھی کہ عوام کے کردار کو کس طرح ختم کیا جائے۔ چنانچہ جب عوام کے کردار کو ختم کریں گے تو جمہوریت کے بجائے آمریت کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فوج کے کردار کو بڑھایا گیا جو ایوب خان کے دور سے ہوا کہ فوج صرف حفاظت کر سکتی ہے۔ سیاست کی جو گرد ہے اسے صاف کر سکتی ہے۔ ملک کو بہتر بنا سکتی ہے یہ نقطہ نظر شروع ہوا۔ اب ہوتا یہ گیا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہمارے ہاں نہ جمہوریت کی وجہ سے استحکام رہا نہ فوجی حکومت کی وجہ سے اور ملک کمزور ہوتا چلا گیا، اور جب ملک کمزور ہوتا ہے تو قوم پرستی اور نیشنل ازم کے نعروں سے سہارا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا قوم پرستی اور نیشنل ازم کے نعرے ہمارے ہاں لگائے گئے۔ یہ ایک نیا فیکٹر تھا، ہمارے میڈیا اور نصاب کے اندر۔

ہمارے ہاں سب سے نازک مرحلہ اس وقت آیا جب مشرقی پاکستان الگ ہوا، اور پھر ایک نئے پاکستان کا تصور تھا۔ یہ نئے پاکستان کا تصور اس زمانے میں بھٹو صاحب کے دور میں آیا۔ اب یہ تھا کہ جو نیا پاکستان ہے اس کی بنیاد کیا ہونی چاہئے۔ کیونکہ جو پرانا پاکستان تھا اس کے دوقومی نظریے کی بنیاد تو ختم ہوگئی تو نئی بنیاد کیا ہونی چاہئے لہٰذا آپ یہ جو بات کر رہے ہیں تاریخ اور اداروں کی تو سب سے پہلے بھٹو صاحب کے دور میں ہسٹاریکل اور ریسرچ سوسائٹی بنائی گئی۔ جواب اسلام آباد میں موجود ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مورخ کسی طریقے سے یہ ثابت کریں کہ نئے پاکستان کی بنیادیں بہت پرانی ہیں۔ یعنی موہنجوڈرو سے شروع ہوتی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک زمانے میں یہاں ''ثقافت'' نام کا ایک رسالہ نکلا کرتا تھا۔ اس میں ایسے مضامین لکھے گئے کہ پاکستان کا علاقہ تاریخی طور پر کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا بلکہ پاکستان ہمیشہ سے آزاد رہا۔ یہی بات اب اعتزاز احسن نے اپنی کتاب ''انڈس ساگا'' میں کہی ہے۔ یہی بات اس سے پہلے قدرت اللہ فاطمی کہہ چکے تھے کہ یہاں دریا یوں بہتے تھے اور یہاں کے پہاڑ اس طرح ہیں اور ہم صرف پانچ سو سال تک ہندوستان کا حصہ رہے ورنہ ہمیشہ آزاد رہے۔ بعد میں جو ڈاکٹر دانی صاحب نے بات کہی وہ یوں ہے کہ اس علاقے پر جو ثقافتی اثرات ہیں وہ وسط ایشیا کے زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم وسط ایشیا سے زیادہ قریب ہیں۔ تو اب پاکستان کی ایک نئی شناخت کا جو سلسلہ تھا وہ یہاں سے شروع ہوا کہ ہمارے رابطے ہندوستان کی بجائے وسط ایشیا سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ یعنی 70ء کے بعد کے پاکستان نے ایک نئی تاریخ کو جنم دیا۔ یہ چیزیں بھٹو کے دور سے شروع ہیں اور ضیاء الحق کے دور میں انہیں عروج دیا گیا۔ ایک تو یہ کہ اسلامیات اور پاکستان اسٹڈی کو لازمی کیا گیا تھا تا کہ ہم اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید دونوں نہیں ہیں۔ تیسرا نقطہ نظر جو ضیاء الحق کے دور میں آیا وہ یہ تھا کہ ہم مسلم امہ یا مسلم ورلڈ کا حصہ ہیں۔ تو یہ ایک لحاظ سے ایک قدم اور آگے تھا۔ یعنی اب انڈیا سے واسطہ ختم ہوا سنٹرل ایشیا بھی نہیں رہا اور ہوا یہ کہ ہم مسلم امہ کا حصہ ہو گئے اور بھٹو صاحب کے دور میں ہمارے جو عرب ممالک سے تعلقات بنے تھے ضیاء الحق کے دور میں انہیں عروج حاصل ہوا کہ ہمارے تعلقات ان ممالک سے اور زیادہ گہرے ہوں۔ لہٰذا ہماری مسلم شناخت زیادہ مضبوط ہوگئی اور کہا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں بعد میں پاکستانی ہیں، کیونکہ اس سے ہمیں امید تھی کہ ہم عربوں سے زیادہ سے زیادہ پیسے لے سکیں گے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب موجودہ حکومت کے مفادات بدلے اور مجاہدین کے خلاف ایکشن لیا گیا تو انہوں نے نعرہ لگایا کہ ہم پہلے پاکستانی ہیں اور بعد میں مسلمان ہیں اور ٹی وی پر اس کی تشہیر ہو رہی ہے کہ ''پہلے پاکستان۔''

ظاہر ہے ان باتوں کا اثر ہمارے ذہنوں پر بھی ہوتا ہے، نصاب کی کتابوں اور پھر تاریخ پر بھی ہوتا ہے کہ تاریخ کو کس طرح ریاست کے نقطہ نظر سے اور اس کے مفادات کو تحفظ دینے کے لئے لکھا جاتا ہے۔

سوال: تاریخ کو شاہد بنا کر نسلی برتری کی بات کی جاتی ہے اور طبقاتی جبر کو چھپایا جاتا ہے۔ اسے

کیسے توڑا جائے؟

جواب: دو چیزیں ہیں۔ایک تو آپ نے نسلی برتری کا بالکل درست کہا اور دوسرا نیشنل ازم بھی ہے۔ جب نیشنل ازم آتا ہے تو نیشنل ازم کے اندر طبقاتی فرق ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں نسل کا تصور آئے وہاں بھی طبقات کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔اب پاکستان کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ یہاں نیشنل ازم مضبوط نہیں ہے۔اس لئے کہ پاکستان کا نیشنل ازم حکومت کی طرف سے میڈیا کے راستے آیا ہے۔لہٰذا لوگوں میں اس کی اتنی زیادہ پذیرائی نہیں ہے۔لیکن ہمارے صوبائی نیشنل ازم بہت مضبوط ہے۔خاص کر سندھ اور بلوچستان کے اندر اور سرحد میں بھی ہے۔مگر پنجاب کے اندر بالکل نہیں ہے۔اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں استحصالی طبقے کو بھلا دیا جاتا ہے۔مثلاً جب ایک ہاری پہ اس کا مالک جبر کرتا ہے تو اسے بھلا دیا جاتا ہے، اور نسل میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اگر نسل کے حوالے سے لوگ کوئی جدوجہد کرتے ہیں تو اپنے استحصالی طبقے کو نہیں دیکھتے جو ہمارے سیاسی شعور کو پیدا کرنے میں رکاوٹ ہوتا ہے اور ہمارے اپنے حقوق کی جنگ میں بھی ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔لہٰذا جب تک مختلف دھڑوں میں ظالم طبقوں کی نشاندہی نہیں ہوگی اور طبقاتی فرق کو ذہنوں میں واضح نہیں کیا جائے گا میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی شعور نہ تو پختہ ہوگا اور نہ ہی ہم اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکیں گے۔

سوال: گو کہ تاریخی میدان میں آپ نے تمام موضوعات پر لکھا اور صحیح تاریخ کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے آپ ایک سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' بھی مرتب کر رہے ہیں اس کے باوجود آپ کے خیال میں عام آدمی کو تاریخ سے کیسے باخبر رکھا جائے؟

جواب: ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ایک انگریزی دان طبقہ ہے اور ایک اردو دان طبقہ۔پھر آپ صوبوں میں جائیں جیسا کہ سندھ میں تو وہاں ذریعہ تعلیم سندھی زبان ہے تو وہاں سندھی پڑھنے والوں کی اکثریت ہے، اور بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں ہمارا لٹریسی ریٹ بہت کم ہے تو ایک عام آدمی جو پڑھ نہیں سکتا ظاہر ہے کہ اس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔پھر ایک تو ذریعہ یہ ہے کہ آپ اپنی تحریروں کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچیں جو پڑھ نہیں سکتے ہیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو عوام کی زبانوں میں لکھنا چاہئے۔لہٰذا جب ہم اردو میں لکھتے ہیں تو سادہ اور آسان زبان میں تاکہ لوگوں تک بات پہنچ سکے۔دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ آج کل الیکٹرونک میڈیا کا دور ہے۔وڈیو اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے مگر ہمارے ہاں ایسی تنظیمیں نہیں ہیں جو ان چیزوں کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔اگر ہمارے ہاں ایسی تحاریک یا تنظیمیں ہوتیں تو وہ یہ کام کر سکتی تھیں کہ لوگ دیکھ کر یا سن کر باخبر ہوں۔لوگوں کے اندر تجسس ہوتا ہے۔ریاست کے ریڈیو اور ٹی وی ہیں ظاہر ہے ہم ان سے توقع نہیں کر سکتے۔لہٰذا متوازی طور پر ایسی تحریکیں چلنی چاہئیں جو عوام کے لئے شعور کا کام کر سکیں۔مگر وہ نہیں ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو یہ کام سیاسی جماعتوں کے کرنے کا ہوتا ہے لیکن سیاسی پارٹیوں پر بھی چونکہ جاگیرداروں کا قبضہ ہے لہٰذا ان کی بھی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسری ہماری NGO's بھی یہ کام کرسکتی ہیں۔ لیکن ان کا ایجنڈا بھی باہر سے آتا ہے اور اس کے لئے پیسے بھی باہر سے آتے ہیں۔ وہ ڈونر کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے نصاب اور زبانوں کی بات کی ہے تو مادری زبانوں میں تعلیم دینے کے حوالے سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اس میں تو کوئی زیادہ جھگڑے کی بات ہی نہیں ہے کہ مادری زبان میں تعلیم دینی چاہئے۔ اس لئے کہ بچے کا ذہن اس کا عادی ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں جہاں اس بات کی کوشش ہو رہی ہے اس کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔ باقی تمام لوگ اس پر متفق ہیں۔ صرف پنجاب کا مسئلہ ہے اور اس کی بھی بہت ساری تاریخی وجوہات ہیں کہ پنجاب نے کیوں اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر اردو زبان کو اپنایا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ آدمی جب بھی اپنی محسوسات بیان کرتا ہے تو وہ صرف اپنی مادری زبان میں ہی کرتا ہے، اور بچہ اسی کو بہتر سمجھتا ہے اور ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہوتی ہے۔ آگے چل کر بچے کے لئے مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی بھی زبان سیکھے۔

سوال: ہمارے ہاں اس بات پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں ہیرو کو ڈاکو کے روپ میں اور ڈاکو کو ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا؟

جواب: تاریخ میں یہ جو مسئلہ ہے کہ دہشت گرد کون ہیں، ہیرو کون، باغی کون ہیں تو آزادی سے قبل انگریزوں کے خلاف جنہوں نے بھی جدوجہد کی انہیں دہشت گرد اور غدار قرار دیا گیا۔ جیسے کہ سندھ میں حروں کی جو آزادی کی تحریک تھی انگریز اسے دہشت گردوں کی تحریک کہتے تھے، یا 1857ء کی جنگ کو جسے وہ غدر کا نام دیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ جب ملک آزاد ہوئے تو انہوں نے اپنی تاریخ کو دوبارہ سے لکھا۔ لیکن اس میں تھوڑی سی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کہ جب آپ تاریخ کو نوآبادیاتی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اپنے نقطہ نظر سے پیش کریں تو کوشش ہونی چاہئے کہ ہمیں بلاوجہ ہیرو نہیں بنانے چاہئیں، اور اس میں توازن رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو تاریخ کا تعلق بھی طاقت سے ہوتا ہے جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ اپنی مرضی کی تاریخ بنوالیتا ہے جس کے پاس طاقت نہیں ہوتی تاریخ میں اسے نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ آج کے دور میں جہاں لوگ پاور کے سرکل میں نہیں ہیں وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے وجود کو تاریخ میں لے کر آئیں حالانکہ وہ اس دھارے سے کٹے ہوئے ہیں اور مین سٹریم میں نہیں ہیں، پھر بھی انہیں جگہ مل گئی ہے جو اس سے پہلے ملتی ہی نہیں تھی۔ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے بغاوتیں کیں، مزاحمتیں کیں، حق کے لئے لڑے مگر آج تاریخ میں ان کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ طاقتور گروپوں کے ساتھ لڑے تھے مگر آج کی دنیا میں ہر چیز واضح ہوگئی ہے کہ کچھ لوگ تاریخ لکھ کر کم از کم اپنا ریکارڈ تو درست کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن یہ ہیرو اور

باغی بھی پاور کے ساتھ ختم ہوتے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔

سوال: نصاب میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے آپ اس سے کہاں تک مطمئن ہیں؟

جواب: نصاب کا مسئلہ بہت حساس ہوتا ہے یہ صرف پاکستان کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے سارے ملکوں کے لئے ہے۔ چونکہ ہر جگہ نیشنل اسٹیٹس میں تو ہر ایک کہتا ہے کہ بچے کو اپنے نیشنل ازم کے فریم ورک کے اندر تاریخ پڑھانی چاہئے۔ برطانیہ ہو جرمنی یا دوسرے بڑے اور ترقی یافتہ ملک وہاں نصاب پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچوں کو ایسے موضوعات نہ پڑھائے جائیں جن میں تضادات ہوں ان کو صرف وہی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں جن سے ان کے اندر نیشنل ازم کا جذبہ ابھرے۔ لیکن کچھ جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو قاعدے کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ کچھ جگہ حد سے زیادہ۔ پاکستان کے اندر چونکہ کہا گیا کہ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے تو یہاں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ آپ اگر نصاب کی کتابیں دیکھیں تو اس کے اندر سے ''ہندو'' ہے تو وہ بالکل غائب ہے۔ اس میں نیشنلسٹ مسلمان غائب ہیں۔ کسی کو آزادی کے بارے میں پتہ نہیں۔ حکیم اجمل خان کے بارے میں پتہ نہیں، ڈاکٹر انصاری کے بارے میں پتہ نہیں۔ حالانکہ یہ سب مسلمان تھے۔ لیکن چونکہ یہ نیشنلسٹ مسلمان تھے کانگریس کے ساتھ تھے اس لئے انہیں ہمارے نصاب کی کتابوں سے نکال دیا گیا، ہم نے اپنے نصاب کی کتابوں میں صرف ان کو رکھا جو ہمیں سوٹ کرتے تھے۔

آج کل ہندوستان کے اندر بھی کافی مباحثہ ہو رہا ہے کیونکہ بی جے پی کی حکومت بھی تاریخی کتابوں کو تبدیل کر رہی ہے، بہت سے جملے نکال دیئے گئے مثلاً ''فلاں جملہ سکھوں کے جذبات کو مجروح کرتا ہے۔'' کئی کہتے ہیں ''فلاں جاٹوں کے جذبات کو مجروح کرتا ہے۔'' اگر آپ تاریخ میں یہ دیکھنے لگ جائیں کہ کون سی چیز کس کو مجروح کرتی ہے تو پھر تاریخ، تاریخ تو نہیں رہے گی نا۔ تاریخ یہ نہیں دیکھتی کہ کس کے جذبات کیا ہیں۔ تاریخ تو حقائق کو دیکھتی ہے۔ وہاں بھی آج کل بہت کوشش ہو رہی ہے۔ نصاب کی جو کتابیں ہوتی ہیں وہ تو اسٹیٹ کے اپنے نظریہ کی شکار ہوتی ہیں۔ یہ پاکستان میں زیادہ ہے اور ہندوستان میں بھی اس وقت یہ سلسلہ چلا ہوا ہے۔ بی جے پی کی حکومت جب سے آئی ہے سب سے زیادہ وہ تاریخ پر توجہ دے رہے ہیں کہ کس طرح تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق لکھوایا جائے۔

دوسرے ملکوں میں یہ ہوتا ہے کہ نصاب کی کتابوں میں تو یہ سلسلہ ہوتا ہے مگر جب وہ کالج یا یونیورسٹی میں جاتے ہیں تو کھل جاتے ہیں۔ وہاں تاریخ دان اپنی مرضی سے لکھتے ہیں وہ ریاست کے قاعدے اور قوانین کی پابندی نہیں کرتے۔ پاکستان میں ساری یونیورسٹیاں بھی اس دائرے کا شکار ہیں جن میں نصاب لکھنے والے شامل ہیں اور یونیورسٹیوں کے اندر بھی کوئی آزاد قسم کی تحقیق نہیں ہو رہی۔

سوال: تعلیمی اداروں کی بدحالی اور طلبہ کی باہمی کشمکش کو آپ کس نظر سے دیکھیں گے؟

جواب: دیکھیں نوآبادیاتی نظام میں جہاں بے شمار خامیاں تھیں۔ وہاں یہ تھا کہ پولیس کسی تعلیمی ادارے میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ ایوب خان کے دور میں سب سے پہلے پولیس کالجوں میں داخل ہوئی اور لڑکوں کو مارا پیٹا اس وقت میں بھی اسٹوڈنٹ تھا۔ ہمارے ہاں یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں بھی یہی ہوا چونکہ طالب علموں کی طرف سے ایوب خان کی زبردست مزاحمت ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کا یہ مسئلہ تھا کہ اس کو کیسے ختم کیا جائے۔ انہوں نے ایک تو یہ قدم اٹھایا کہ طلبہ تنظیموں پر پابندی لگادی۔ یہ جو تنظیموں کے الیکشن ہوتے تھے یہ ایک طرح سے اسٹوڈنٹ کی تربیت کرتے تھے۔ وہ انہوں نے بالکل ختم کردی۔ اس سے پہلے مباحثوں کی روایت تھی اور بڑے متضاد موضوعات ہوا کرتے تھے۔ جب پابندی لگی تو اس طرح کی ساری سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی ادارے بالکل بند ہوگئے۔ یہ کہا گیا کہ طالب علم آئیں، تعلیم حاصل کریں اور چلے جائیں۔ حالانکہ تعلیم صرف اس طرح سے حاصل نہیں کی جاتی یونیورسٹی سے باہر بھی تعلیم کا تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا ایوب خان کے دور سے طالب علموں کو غیر سیاسی بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کوئی طالب علم ملکی مسائل پر توجہ نہیں دیتا۔ ہیومن رائٹس کا مسئلہ ہے، غربت کا مسئلہ ہے یا خود تعلیم کا مسئلہ ہے۔ تعلیمی اداروں سے اب کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس کا ملکی مسائل سے تعلق ہو۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ان حالات سے سیاسی پارٹیوں نے فائدہ اٹھایا اور ریاست نے بھی انہیں استعمال کیا۔ اب طالب علموں کی جو سیاست ہے وہ صرف تعلیمی اداروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہاسٹل کا مسئلہ، روم کی الاٹمنٹ کا مسئلہ، ایڈمیشن کا مسئلہ ہے بس یہی مسئلے رہ گئے ہیں۔ لہٰذا ایوب خان کے دور سے جس تباہی کی ابتداء ہوئی تھی وہ اب عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب طالب علموں کو غیر سیاسی بنا کے یونیورسٹیوں میں محدود کردیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ اپنے اساتذہ کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ جس سے تعلیمی ادارے خود بھی تباہ ہوگئے۔

سوال: پچھلے دنوں افغانستان میں بدھ کا مجسمہ تباہ کردیا گیا۔ اس ثقافتی اور تاریخی نقصان کو آپ کس نگاہ سے دیکھیں گے؟

جواب: یہ تاریخ کا طالبان کا نقطہ نظر تھا۔ ہمارے ہاں بھی بہت سارے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے کی جو چیزیں ہیں ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ان کو محفوظ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بہت عرصہ قبل ایک جماعت کے رہنما نے کہا تھا کہ موہنجودڑو کو بلڈوز کردینا چاہئے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام سے قبل اندھیرا ہی اندھیرا تھا لہٰذا ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ طالبان کا بھی یہی نقطہ نظر تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایسا کیا۔ لیکن تاریخ میں ہمیشہ سے دو چیزیں چلتی ہیں۔ ایک ہوتا ہے تسلسل، کچھ روایات ایسی ہوتی ہیں جو تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ کسی علاقے کی تاریخ کن کن مراحل سے گزری ہے۔ اگر آپ اس کی تاریخ کی شاخوں اور کڑیوں کو ختم کردیں تو پھر آپ کو پتہ نہیں ہوگا کہ

آپ کا ماضی کیا تھا۔ پھر آپ کو اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا ہوگی اور جو پہلے تجربات تھے یا ورثہ تھا وہ آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ جن ملکوں میں تاریخی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں وہاں جو باشعور لوگ ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کو تلاش کر کے تسلسل قائم کیا جائے مگر جہاں یہ تسلسل قائم نہیں رہتا وہاں تاریخی شعور بھی ناپختہ رہ جاتا ہے۔ افغانستان میں بھی جو نقصان ہوا ہے اس سے افغان قوم کا تاریخی شعور پختہ نہیں ہوا ہے۔ اب ان کی تاریخ بھی مسخ ہوگئی ہے اور یہ ایسا نقصان ہے جو اب پورا نہیں ہوسکتا۔

سوال: اہل علم اور لکھنے والوں کی خواہشات بھی بہت معصوم ہوتی ہیں۔ تاریخ لکھنے کا جو بیڑا آپ نے اٹھایا ہے اسے مکمل کرنے کے لئے آپ کی مزید کیا خواہش ہے۔ آپ مزید کیا لکھ رہے ہیں۔ کیا کوئی انسٹیٹیوٹ بنانے کا ارادہ ہے؟

جواب: اہل علم دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو علم سے پیسہ کماتے ہیں اور وقت پڑنے پر ریاست کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسری طرف نہیں جاتے کیونکہ وہاں پیسہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اہل علم ہوتے ہیں اور ریاست کے نظریات کو چیلنج کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں انہیں دور کر کے عام لوگوں کے لئے کوئی راستہ متعین کریں۔ میری خواہش یہ ہے کہ ہم تاریخ کا کوئی ایسا ادارہ قائم کریں جس میں ایسے نوجوان آئیں جنہیں تحقیق کا شوق ہے اور وہ وہاں سے فائدہ حاصل کریں۔ فرد کا کام تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی ادارہ ہو تو اس کا کام چلتا رہتا ہے۔ اب ترقی یافتہ ملکوں میں تو ایسے نجی ادارے اور یونیورسٹیاں ہیں مگر ہمارے ہاں اس کا فقدان ہے۔ وہاں پر وہ ریسرچ کرنے والوں کی مالی امداد کرتے رہتے ہیں اور آزادانہ تحقیقات کرواتے رہتے ہیں۔

پاکستان میں بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پر ایسے کوئی ادارے نہیں ہیں۔ اب کسی نے اگر ادارہ بنایا تو سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا ہوتا ہے۔ جس قسم کا ہمارا معاشرہ ہے وہاں لوگ ثواب کی خاطر تو بہت پیسے دیتے ہیں لیکن کوئی علم اور تحقیق کے لئے پیسہ نہیں دیتا تاکہ اس دنیا کو بہتر بنایا جائے۔ ظاہر ہے جن کے پاس پیسے ہیں وہ یا تو صنعت کار ہیں یا جاگیردار، وہ کبھی نہیں چاہتے کہ یہاں لوگوں کے اندر شعور آئے۔ لہٰذا وہ کیوں یہ چاہیں گے کہ لوگوں کی امداد کی جائے۔ ہم نے یہاں ''تاریخ'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ شروع کیا ہے۔ اس میں فکشن ہاؤس کا تعاون ہے جس کی وجہ سے یہ چل بھی رہا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ تاریخ کے جو مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں ان کو ہم اس رسالے کے ذریعے لوگوں تک پہنچائیں۔ دوسرا اہم نے ''انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ'' کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا ہے۔ ہماری کوشش تو ہے کہ ہم اس ادارے کی طرف سے کوئی فیلوشپ قائم کریں تاکہ نوجوان تحقیق کاروں کو کچھ مالی امداد دی جاتی رہے۔ لیکن ابھی تک ہمارے مالی وسائل کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم جو تھوڑا بہت کر سکتے ہیں اس میں بھی فکشن ہاؤس کا تعاون ہے۔ مثلاً پچھلے دو سال سے ہم ایک دن کی کانفرنس کرتے ہیں۔ پہلی تاریخ کانفرنس ہم نے 2000ء میں کی تھی اور اس میں

پاکستان میں تاریخی روایات پر ہم نے کچھ مضامین پڑھوائے تھے۔ اس بار جو ہم نے کانفرنس کروائی اس میں لاہور کے متعلق مضامین پڑھے ہیں اور پڑھوائے ہیں۔ وہ ہم اس رسالے میں چھاپتے ہیں لہٰذا ہمارے اپنے جو وسائل ہیں ان سے ہم کوشش تو کر رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اتنے کم وسائل سے کوئی ایسا کام نہیں ہوتا جس کے اثرات مرتب ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا سندھ اور بلوچستان کے نوجوانوں پر اثر ہو رہا ہے اور اب وہ تاریخ کو نئے نقطہ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے حملہ آوروں کو سبھی ہیرو کہتے تھے لیکن اب کم از کم ان پر سوال کیا جانے لگا ہے۔ یہی باتیں لوگوں کے ذہنوں کو بدل رہی ہیں، اور ہمیں یہی امید کرنی چاہئے کہ اس طرح لوگوں کی راہیں متعین ہوں گی۔

(جفاکش: فروری 2002ء)



بے باک باتیں

پینل انٹرویو

سوال: دوقومی نظریہ جس کو کہتے ہیں کیا وہ ایک ریاست کا نظریہ ہوسکتا ہے؟ کیا قرارداد پاکستان کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کی جاسکتی ہے؟ کیا اس کو ایسی دستاویز سمجھا جاسکتا ہے جو ریاست کی فکری بنیاد ہو؟

جواب: جس زمانے میں پاکستان کی جدوجہد ہورہی تھی اس وقت یہ بات کہی گئی تھی کہ پاکستان کی تحریک کے لئے عمومی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو اکٹھا کیا جائے۔ دوقومی نظریہ کی بنیاد یہ تھی کہ ہماری تہذیب علیحدہ ہے، کلچر علیحدہ ہے، مذہب علیحدہ ہے، یہ ایک لمبی فہرست تھی۔ 1947ء تک یعنی پاکستان بننے تک جو دوقومی نظریہ کی بات کی گئی وہ ایک خاص وقت کے لئے تھی اس کے بعد دوقومی نظریہ کا کوئی جواز نہیں رہتا چونکہ پاکستان بن گیا، پاکستان کا بننا خود ایک قومی ریاست کا بننا تھا۔ ایک قومی ریاست ہمیشہ ایک قوم ہوتی ہے دوقومیں نہیں ہوتیں، تو دیکھا جائے تو دوقومی نظریہ 1947ء تک چلتا ہے اس کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ جناح نے ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا کہ اب تم اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھو یعنی اس سے پہلے جو ساری باتیں کہی جاتی تھیں یعنی مثلاً الگ تہذیب، الگ کلچر، الگ مذہب، 1947ء کے بعد ان کا اچانک ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اطلاق ختم کردیا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا تضاد تھا۔ دوقومی نظریہ ایک خاص ماحول اور ایک خاص وقت کی پیداوار تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوقومی نظریہ کسی قومی ریاست کا نظریہ ہو ہی نہیں سکتا۔ Nation State میں جو بھی ایک جغرافیائی دائرہ میں رہتا ہے اس کا تعلق ایک قوم سے ہوتا ہے۔ دوقومی بنیاد پر کبھی ایک Nation State وجود میں نہیں آتی۔

سوال: دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے سیاسی ارتقاء میں وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے پاکستان کی ریاست کو مجبور کیا کہ وہ دوقومی نظریئے کو پاکستان کے وجود کی فکری بنیاد قرار دے؟ بنگلہ دیش کے بننے کے بعد بھی بدستور دوقومی نظریئے پر اصرار کی کون سی سیاسی وجوہات ہیں؟

جواب: نظریہ پاکستان کے نام پر جس Frame Work کو تشکیل دیا گیا ہے اس سے دوقومی نظریہ بہت وسیع تر چیز بن گئی ہے۔ اس کے اندر پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کی بات بھی کی گئی ہے اور اردو

زبان کو بھی۔ دراصل حکمران طبقات کے پاس عوام کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو Legitimacy دینے اور اپنے وجود کو جائز ثابت کرنے کے لئے انہیں کسی نظریئے کی ضرورت تھی جس کی بناء پر لوگوں کو مطمئن کیا جا سکے اور لوگوں کو ہمنوا بنایا جا سکے۔ نظریہ پاکستان کی اصطلاح بہت بعد میں استعمال ہوئی اس سے پہلے نظریہ اسلام کی بات ہوا کرتی تھی جس کے نظریہ ساز اشتیاق حسین قریشی تھے۔ نظریہ پاکستان کے اصطلاح یحییٰ خان کے زمانے میں جنرل شیر علی خان جوان کے وزیر اطلاعات تھے انہوں نے استعمال کی۔ ابھی تک نظریہ پاکستان کی اصطلاح بہت غیر واضح ہے، اس کو جس طرح آپ چاہیں پہنا دیں۔ یہ نظریہ جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستی ڈھانچے میں کوئی کمزوری موجود ہے اور اس کمزوری کا ازالہ اس نظریئے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ پاکستان کی ریاست کی فکری بنیاد کو صحیح طور پر Define کیا ہی نہیں جا سکتا اور ضرورت کے مطابق ریاست کے مختلف وقتی مقاصد کو نظریہ پاکستان کا حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جب ون یونٹ بنا تو یہ کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب مسلمان ہیں تو یہ ایک صوبہ ہے۔ جب مشرقی پاکستان کے تشخص سے انکار کیا گیا اس میں بھی یہی بنیاد بنائی گئی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے علیحدہ شناخت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہماری سیاست اور وجود جو جھوٹ و فریب کی بنیاد پر چل رہے ہیں تو کیا اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہم نے کبھی اپنی فکری اساس کے بنیادی تضاد کو چیلنج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاریخ اور نظریہ کی غلطی کو چیلنج کئے بغیر ہم آگے کس طرح سے بڑھ سکتے ہیں؟

جواب: دیکھیں اس میں بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے تو دو قومی نظریہ کی بات کی گئی لیکن پاکستان بننے کے بعد مضبوط مرکز پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ سارے پاکستانی ایک قوم ہیں اور جب سندھی، بلوچ یا مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اپنی شناخت کی بات کی تو اسے صوبائی تعصب قرار دیا گیا، ان کے علیحدہ قومیتی وجود سے انکار کیا گیا اور کہا گیا کہ صوبائی شناخت ختم کر کے اسے قومی شناخت میں ضم کر دیا جائے۔ اقلیتوں کے سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ کیا انہیں بھی قوم کا حصہ سمجھا جائے یا الگ قوم مانا جائے۔ مذہب کی بنیاد پر تمام مسلمان تو ایک قوم ہیں لیکن یہاں جو ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں ان کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ سارے تضادات ہیں جن کی وجہ سے نہ تو کوئی قوم بن سکی ہے نہ کوئی قومی کلچر بن سکا۔ جب مضبوط مرکز کی بات کی گئی اور ریاستی اداروں کی طرف سے لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی علاقائی شناخت ختم کر دیں تو اس کا شدید ردِعمل ہوا۔ جس بات پر پہلے زور دیا تھا یعنی یہ کہ پاکستان میں قوم کی شناخت مذہب پر ہے جغرافیہ پر نہیں اسے سب سے پہلے مشرقی پاکستان کے لوگوں نے زبان کی بنیاد پر چیلنج کیا۔ مشرقی پاکستان لسانی نیشنل ازم کی بنیاد پر علیحدہ ہوا۔ یہی صورتحال سندھ میں ہے۔ سندھی نیشنل ازم کی بنیاد لسانی نیشنل ازم پر ہے، سندھی زبان پر ہے، مذہب پر نہیں۔ آپ یہ بھی دلچسپ بات دیکھیں گے کہ یہاں جب ایم کیو ایم کا

سلسلہ شروع ہوا تو ایم کیو ایم نے بھی اپنی شناخت اور اردو زبان کی بنیاد پر بنائی۔ جتنی بھی علاقائی تحریکیں انھیں بشمول ایم کیو ایم کی تحریک کے سب ہی نے مذہبی نیشنل ازم کو رَد کر دیا مذہبی نیشنل ازم پر اصرار، لسانی نیشنل ازم کے فروغ کا باعث بنا، ریاست جو اوپر سے مسلط کرنا چاہتی تھی وہ نہیں ہوا۔ اب اس وقت ہمارے یہاں علاقائی شناخت کی زیادہ اہمیت ہوگئی ہے قومی شناخت کے اوپر لوگ اتنا فخر نہیں کرتے جتنا علاقائی شناخت کے اوپر۔ یہ تضادات اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ اس ملک کی کوئی فکری اساس نہیں تھی۔ ملک بنانے کے وقت اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ اس ملک کا سیاسی و معاشی نظام کیا ہوگا اور آگے چل کر اس کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی۔

سوال: دو قومی نظریئے اور نظریہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اور بہت ساری باتیں ہمارے ریاستی نظریئے اور قومی تشخص کے ساتھ شامل ہوگئی ہیں۔ لگتا ایسا ہے کہ وہ محض خانہ پری کے لئے شامل کی گئی ہیں۔ جیسا کہ یہ نعرہ ''اتحاد، ایمان اور تنظیم''۔ بہت سی ریاستوں میں مختلف قسم کے نعرے اپنائے گئے ہیں لیکن ان کے پیچھے کچھ ٹھوس روایتیں اور حقیقتیں ہیں جو خالی خولی نہیں ہیں۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب کا نعرہ Liberty, Equality, Fraternitly اس پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب: آپ نے جو اتحاد، ایمان اور تنظیم کی بات کہی ہے تو اس کے بارے میں ایک لطیفہ ہے، اتحاد تو یحییٰ خان کے زمانے میں ختم ہوگیا جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا۔ تنظیم کو بھٹو نے ختم کر دیا اور ایمان ضیاء الحق نے ختم کر دیا۔ اگر آپ گہرائی میں جائیں تو دیکھیں گے کہ اتحاد کا نعرہ بسا اوقات بہت خطرناک چیز بھی ہوتی ہے۔ اس سے فاشزم جنم لیتا ہے۔ اگر آپ پوری قوم کو جذبات کی بنیاد پر اکٹھا کر دیتے ہیں جیسے ہٹلر کے زمانے میں جرمنی متحد ہوا تو ایسا اتحاد بہت خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ فسطائی قومی نظریئے میں بھی اتحاد پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہی حال تنظیم کا ہے۔ تنظیم ہونی چاہئے لیکن اس کے ساتھ دماغ اور فکر بھی ہونی چاہئے۔ ایمان تو آپ جانتے ہیں کہ عقل سے ماوراء ہوتا ہے اس میں کوئی دلیل کام نہیں کرتی۔ تو ان تینوں نعروں کا اگر آپ گہرائی میں جا کر تجزیہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان میں غور و فکر، دلیل، انفرادیت اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں اور یہی ہوا کہ جب بھی مرکز کے خلاف کوئی بات کہی گئی تو جواب ملا کہ یہ صوبائی تعصب ہے، اتحاد اور قومی سالمیت کے خلاف ہے۔ دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے کہ یہ جو نعرے دیئے جاتے ہیں کہ ان کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے، وقتی طور پر لوگوں کو Mobilize کیا جاتا ہے۔ نعروں کے ساتھ کوئی عملی کام نہ کیا جائے تو یہ بے سود ہوتے ہیں اور ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

سوال: پاکستان میں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ نعرے اب جذبات کو بھی نہیں ابھارتے؟

جواب: بھٹو کے زمانے میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا تو لوگوں کے جذبات بہت ابھرے اور لوگوں نے سمجھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت آئے گی تو یہ سب چیزیں مل جائیں گی۔

سوال: جب کسی ملک سے متعلق کسی شخصیت کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے حوالے سے کوئی ٹھوس حقیقت اور ایک پورا تاریخی Process ابھرتا ہے، جیسا کہ امریکہ میں جب جارج واشنگٹن یا تھامس جیفرسن کا ذکر آتا ہے تو کچھ نظریاتی اصول ہوتے جو ان سے وابستہ ہیں، وہ ذہن میں آتے ہیں۔ جب روسو یا والٹیئر کی بات کرتے ہیں تو کچھ فلسفہ، سماجی نظریات، ریاستی ڈھانچہ وغیرہ سے متعلق اصول ذہن میں ابھرتے ہیں جنہیں ان شخصیات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب آپ ہمیں بتائیں کہ پاکستان کے عوام کو یا نوجوان نسل کو جن شخصیات کی مثال دی جاتی یہ تو کیا ان شخصیتوں کے ذکر سے یا ان کے نام سے کوئی ایسی چیز یا ٹھوس حقیقت ابھرتی ہے جس سے ماضی اور حال کے درمیان کوئی تسلسل قائم ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کا عام آدمی ہو یا کسی اسکول کا بچہ ہو ان کے لئے نظریہ پاکستان سے وابستہ شخصیات کا ہماری آج کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان شخصیات سے منسوب کوئی ایسی فکر یا ایسا نظریہ ہے جو ہمیں آج کے حالات میں راستہ ڈھونڈنے میں مدد دے سکے۔

جواب: شخصیتوں کو اتنا بڑھانا ضروری نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سمجھا جاتا تھا کہ شخصیتیں ہی قوم کو بناتی ہیں اور شخصیتیں ہی معاشرے تخلیق کرتی ہیں لیکن اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ شخصیتوں کو اتنی اہمیت دینا ٹھیک نہیں ہے اور بھی دوسری قوتیں ہیں جو کہ معاشرے کو بناتی ہیں۔ یہ چیز بالکل واضح ہونی چاہئے کہ شخصیت پرستی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پاکستان ہو یا دنیا کا کوئی اور ملک وہاں شخصیتوں یا ہیروز کو بالکل پاک وصاف کر کے پیش کیا جاتا ہے، ان کی خامیوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لنکن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے غلاموں کو آزادی دلائی لیکن لنکن کی نسل پرست تحریریں بھی موجود ہیں۔ شخصیتوں کو ابھارنے کا عمل اس لئے ہوتا ہے کہ اس سے آنے والی شخصیتیں فائدہ اٹھائیں۔ مثلاً اس سے خاندان بن جاتے ہیں۔ بھٹو خاندان بن گیا، شریف خاندان بن گیا۔ شخصیت پرستی کی وجہ سے ان کے خاندان کے لوگ حکومت کرنے کا حق لے لیتے ہیں۔ شخصیات کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ ہمیں متاثر کر سکیں بنیادی طور پر غلط ہے۔ ہمارے ہاں یہی ہوا ہے، اس کی وجہ سے ہم نے تاریخ کو شخصیات کے پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہم نے معاشی، سماجی اور سیاسی قوتیں جو تاریخ کی تشکیل میں کام کرتی ہیں، ان کو نظر انداز کر دیا ہے اسی وجہ سے تاریخ کے حوالے سے ہمارا ذہن بڑا نا پختہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں محمد بن قاسم کی ضرورت ہے، ہمیں پھر کسی صلاح الدین کی ضرورت ہے۔ شخصیت پرستی کی وجہ سے لوگوں کے اندر جو صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شخصیتیں سب کچھ بنا دیں گی، ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نقطہ نظر بہت منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

سوال: پاکستان کے بننے کے بارے میں ہر قسم کی توجیہہ موجود ہے۔ تاریخ داں کچھ چیزوں پر متفق ہیں کچھ پر نہیں، لیکن کیا تحریک پاکستان جو کہ پاکستان بنانے پر منتج ہوئی ہے اسے کسی بھی نقطہ نظر سے ایک جدید

دور کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا پاکستان کے بننے کو اور پاکستان کی ریاست کے تشکیل میں آنے کو قوم سازی کا نقطہ آغاز قرار دینا درست ہے؟

جواب: پاکستان کے بننے یا نہ بننے کے بارے میں دونوں قسم کی آراء موجود ہیں بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ کیا ہندوستان کے سارے لوگ انگریزوں سے چھٹکارا پانا چاہتے بھی تھے کہ نہیں۔ ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جو کہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہئے بلکہ یہیں رہنا چاہئے۔ بہت سے ایسے طبقات اس سوچ کے حامل تھے اور بہت سی ایسی ریاستیں بھی تھیں جو کہ انگریزوں کے اقتدار کے دائمی طور پر قائم رہنے کی قائل تھیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کو کس نے بتایا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کانگریس کی ہٹ دھرمی نہ ہوتی تو آج پاکستان نہ ہوتا کیونکہ Cabinet Mission کے پیش کردہ منصوبے کو قائداعظم نے مان لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کا جو مطالبہ تھا اسے انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ یہ تو الگ بحث ہے لیکن جب یہ ملک بن گیا ہے تو اس کو اب صحیح طریقے سے چلایا جائے۔ جب ہم صحیح طریقے سے چلانے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہاں پر جمہوریت ہو، یہاں پر لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق ملیں، ان میں خوشحالی آئے تو پھر ہم سمجھیں گے کہ ہمارے کچھ خواب پورے ہوئے ہیں۔ لیکن 1947ء سے جو لوگ اقتدار میں آئے اور جس طریقے سے انہوں نے اس ملک کو چلایا اس نے فوراً ہی لوگوں کو مایوس کرنا شروع کر دیا۔ یہ مایوسی بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ ملک کب تک برقرار رہے گا اور کب ٹوٹ جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی چیز بنائی جائے جس کی بنیاد مضبوط نہ ہو یا مصنوعی ہو تو ایسے سوالات لوگوں کے ذہن میں آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہمارے سیاست دانوں، ہمارے سیاسی نظام اور ہمارے اداروں کی ناکامی کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس میں عوام کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ یہاں جمہوری دور بہت کم رہا ہے۔ یہاں پر زیادہ عرصے تک فوج کی حکومت رہی ہے اور فوج جب بھی آتی ہے لوگوں سے پوچھ کر نہیں آتی ہے بلکہ لوگوں پر مسلط ہو جاتی ہے لیکن ملک کے ٹوٹنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے یا تقسیم ہونے سے یہ مسائل کم نہیں ہو جائیں گے۔ لوگوں کی بے زاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ لوگ یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ یہ ملک جس طرح سے قائم ہے شاید اس سے ہمارے مسائل حل نہ ہو سکیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ بتایا کہ پاکستان بنانے کی جتنی وجوہات تھیں وہ ایک بہانہ تھیں ان کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی تو پھر اس ملک کو بنانے کا محرک کیا تھا؟

جواب: ہمارے دوست حمزہ علوی نے بہت آسان اور بہتر طریقے سے سمجھایا ہے کہ ہمارا متوسط طبقہ ہندوؤں سے مسابقت نہیں کر سکتا تھا۔ جب مسلمان متوسط طبقہ ملازمتوں میں آیا تو اس کو اپنا مستقبل بہت درخشاں نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد وہ ہندوؤں کے مقابلے میں تنہا رہ جائیں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر الگ ملک مل جائے تو ان کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ دوسرے سندھ اور

پنجاب کا جاگیردار طبقہ متفکر تھا کہ اگر انگریز چلا گیا تو ان کی سرپرستی کون کرے گا۔ آپ کو پتہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے خضر حیات نے ایک موقع پر کہا تھا کہ انگریز ہمیں اس طرح بے سہارا چھوڑ کر کیوں جارہے ہیں یعنی یہ اگر چلے گئے تو ہمارا کون ہو گا تو ان طبقوں کے مفادات تھے کہ اس ملک کو بنایا گیا۔

سوال: تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک کی بنیاد ہی میں کچھ طبقات کے مفادات تھے؟

جواب: جی ہاں بالکل کچھ طبقوں کے مفادات تھے۔

سوال: بنیادی طور پر یہ سمجھا جارہا ہے کہ آزادی کی جو تحریک تھی، وہ انگریزوں کے خلاف تھی اور پاکستان کی تقسیم ایک غلطی تھی۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: یہ تحریک انگریزوں کے خلاف تھی کیونکہ وہ نو آبادیاتی آقا تھے لیکن پاکستان میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک انگریزوں کے خلاف بھی تھی اور ہندوؤں کے خلاف بھی تھی۔ ہندو یہ کہتے ہیں کہ ہماری تحریک صرف انگریزوں کے خلاف تھی اس لئے ہم زیادہ کریڈٹ لیتے ہیں کہ انہوں نے صرف ایک سے لڑ کر ملک لیا اور ہم نے دو کے خلاف لڑ کر ملک حاصل کیا۔

سوال: نظریہ پاکستان کی ایک توجیہہ آج کل یہ پیش کی جارہی ہے کہ یہ جو علاقہ ہے یعنی سندھ ساگر یہ جغرافیائی طور پر ایک مربوط علاقہ ہے اور دریاؤں کے بہاؤ سے ثابت کیا جارہا ہے کہ یہاں دریا شمالاً جنوباً بہتے ہیں اور ہندوستان میں مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہیں اس لئے یہ قدرتی طور پر ایک علاقہ ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ایک نئے پاکستان کا تصور ابھرا تو اس وقت یہ باتیں کی گئیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بھٹو کے زمانے میں پروفیسر فاطمی نے یہ بات کہی تھی جو آگے چل کر اعتزاز احسن نے بھی کی۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سیکولر نقطہ نظر ہے اور اس حد تک ہمیں اس کی حمایت کرنی چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری چیز بھی ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ ملک صرف پانچ سو سال تک ہندوستان کا حصہ رہا ہے اور اس کے علاوہ ہمیشہ آزاد رہا ہے۔ اس لئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں ثقافتی طور پر ہندوستان سے منسلک ہونے کے بجائے اپنا رشتہ افغانستان، وسطی ایشیا اور ایران سے جوڑنا چاہئے۔ یہ حقیقت پسندی نہیں ہوگی کیونکہ ہمارے ثقافتی رشتے برصغیر سے ہی ہیں ان ممالک سے نہیں۔ یہ بات ایک نئے پاکستان کے لئے سیاسی اساس کے طور پر کہی گئی تھی جس کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں ملی لیکن بہر حال یہ ایک نقطہ نظر ہے۔

سوال: چونکہ اس ملک کی سیاست کی اساس سالمیت اور Security پر ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس ملک کا وجود خطرے میں ہے اور اس کا وجود اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ فوج کی برتری برقرار رہے گی تو ہماری سیاست بھی ٹھیک سمت میں کام نہیں کرے گی۔

جواب: اگر قومی سلامتی کی فکر ہے تو آپ اپنے ہمسایوں سے تعلقات ٹھیک رکھیں۔ آج ہندوستان سے تعلقات ٹھیک ہو جائیں تو قومی سلامتی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہندوستان سے اچھے تعلقات اس لئے بھی ضروری ہیں کہ اس سے تعلقات رکھ کر نہ صرف تجارت بلکہ تعلیم میں بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان نے تعلیم کے میدان میں بہت ترقی کی ہے، تجارت میں بھی ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ قومی سلامتی کا سارا سلسلہ اس لئے ہے کہ ہم نے اپنے دشمن بنا رکھے ہیں، ہم اگر دشمن نہ رکھیں تو قومی سلامتی پر تشویش اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان ایک کثیر القوامی ریاست ہے اور چھوٹی قوموں کو نظر انداز کر کے پاکستان کو بھی مضبوط نہیں بنایا جا سکتا؟

جواب: پہلی بات تو بالکل صحیح ہے کہ جب تک آپ علاقائی قوموں کو پورے اختیارات نہیں دیں گے اس وقت تک ملک کے سب سے بڑے صوبے کا تسلط رہے گا۔ پنجاب کی آبادی بہت زیادہ ہے، فوج اور بیوروکریسی پر اس کا قبضہ ہے، اس لئے دوسرے چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب تک صوبوں کو خودمختاری نہیں دی جائے گی شکوک وشبہات باقی رہیں گے۔ لیکن صوبائی خودمختاری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے مثلاً سندھ، سرحد اور بلوچستان صوبائی خودمختاری حاصل کر لیں تو وہاں حکمراں کون ہوں گے۔ صوبائی خودمختاری کے بعد بھی وہی پیر اور جاگیردار حکمران ہوں گے۔ اس لئے صرف صوبائی خودمختاری دینے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ جب تک سماجی ومعاشی مسائل حل نہیں کئے جائیں گے تو کام نہیں بنے گا۔ جو لوگ مسئلے کو صرف صوبائی خودمختاری تک محدود رکھتے ہیں ان کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ جب تک بلوچستان سے سرداروں کا، سندھ سے وڈیروں کا اور سرحد سے خانوں کا خاتمہ نہیں ہوگا اس وقت تک صوبائی خودمختاری بھی بے سود ہوگی۔ قرارداد لاہور میں States کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کو بہت سے معنی دیئے جاتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ قرارداد پاس ہوئی تھی تو اس کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ ان چیزوں پر آپ تاریخی طور پر بحث ومباحثہ کر لیں لیکن عملی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ساری علاقائی پارٹیوں کو دیکھیں تو ان کے زیادہ تر رہنما عوام میں سے نہیں ہیں اس لئے محض صوبائی خودمختاری مسئلے کا حل نہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب قوم اور زبان کا رشتہ زمین سے بنتا ہے۔ تقسیم کے بعد جو مہاجرین آئے وہ اپنے ساتھ اپنا کلچر اور اپنی زبان ساتھ لائے، یہاں آنے کے بعد کیا یہ سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان بن سکتے ہیں؟

جواب: یورپین امریکہ میں گئے تو اپنی زبان لے کر گئے اور آج وہاں انگریزی بولی جاتی ہے اور مقامی زبانیں جو بولی جاتی تھیں وہ محدود ہو کر رہ گئیں۔ یورپین آسٹریلیا میں گئے، نیوزی لینڈ میں گئے، ساؤتھ افریقہ میں گئے، افریقہ کے بہت سے ملکوں میں گئے وہاں اب انگریزی بولی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے

کہ جس ملک میں جو زبان بولی جاتی ہو وہی رہے اور باقی زبانیں نہ رہیں، اس طرح نہیں ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ کسی نئے خطے میں جو بھی مہاجرین آتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ اپنی وفاداریاں اس نئے خطے سے وابستہ کرلیں، اس سے اپنی شناخت کو وابستہ کرلیں۔ یہ بہت ضروری ہے، یہ کہنا کہ یہ ہمیشہ اجنبی ہی رہیں گے تو یہ درست نہیں۔

سوال: وہ اپنا کلچر کیسے تبدیل کریں؟ ہر سو چرچا ہے کہ چار قومیں ہیں۔ اب اردو بولنے والے بھی اپنے آپ کو قوم کہہ رہے ہیں تو مسئلے کا حل کس طرح نکلے گا؟

جواب: مسئلے کا حل اس طرح نکلے گا کہ آپ لوگوں کو بنیادی حقوق دے دیں اگر نہیں دیں گے تو یہ مسئلہ کھڑا ہوتا رہے گا اگر اردو بولنے والے کہتے ہیں کہ انہیں اردو بولنی چاہئے تو انہیں اردو بولنے دیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

سوال: جس طرح آپ نے کہا کہ صوبوں میں جو لوگ قیادت کر رہے ہیں وہ سردار، وڈیرے، جاگیردار ہیں۔ لگتا یوں ہے کہ یہ جو حکمراں طبقہ ہے یہ ایک ساتھ جڑا ہوا ہے وہ مسئلے کو حل ہونے نہیں دیتا اور یوں یہ قومیں اندرونی طور پر اپنے مسئلوں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اگر ان کے بنیادی مسائل حل کیئے جاتے تو لوگ سماجی تبدیلی کے لئے ان وڈیروں اور سرداروں کے خلاف منظم ہو چکے ہوتے؟

جواب. اصل میں نیشنل ازم بہت خطرناک چیز ہے جب آپ سندھی نیشنل ازم کی بات کرتے ہیں یا بلوچ نیشنل ازم کی بات کرتے ہیں تو یہ ایک قوم کی بات ہوتی ہے اور یہ غیر طبقاتی بات ہے۔ اس طرح نیشنل ازم ہمیشہ سرداروں اور وڈیروں کو تقویت پہنچاتا ہے اس لئے وہ نیشنل ازم کی بات کرتے ہیں، اس سے وہ بلیک میلنگ بھی کرتے ہیں، مرکزی حکومت سے مراعات بھی لیتے ہیں اور عوام کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس لئے علاقائی نیشنل ازم یا قومی سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا، اس کے پیچھے جو بھی اعلیٰ طبقات ہیں یعنی پیر، سردار اور وڈیرے ان ہی کو اس سے فائدہ ہوگا۔

سوال: آج کل پاکستان میں سول سوسائٹی اور Good Governance کے بات ہوتی ہے آپ پاکستان کے تناظر میں اس بات میں کوئی تاریخی پس منظر پاتے ہیں؟

جواب: Good Governance سیدھی سی بات ہے۔ ایسی حکومت ہو جس سے لوگوں کو سہولت مل سکے، بنیادی حقوق پورے ہوں، جب سول سوسائٹی کی بات کی جاتی ہے تو یہ مطلب ہونا چاہئے کہ جمہوریت ہونی چاہئے، ہر آدمی کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو اور حکومت تبدیل کرنے کا حق ہو۔ جب سے این جی اوز آئی ہیں تو انہوں نے ان اصطلاحات کو بالکل بے معنی سا کر دیا ہے۔ میں ان اصطلاحات کی بات نہیں کرتا، سیدھی سی بات کرتا ہوں کہ یہاں جمہوریت ہو، ایک سیکولر سسٹم ہو، اقلیتوں کو حقوق ملیں اور ایسی جمہوریت ہو جس میں عام لوگوں کی شمولیت ہو اور لوگ اپنی مرضی سے حکومت بنا سکیں اور جو بھی حکومت آئے وہ لوگوں

کے لئے بہتر طریقے سے اور ایمانداری سے حکومت کرے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب یہ کہا جاتا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا اپنے اپنے ملکوں کے بارے میں وژن بہت مختلف تھا اور کہتے ہیں کہ مسلم لیگ نے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار نہیں کیا تھا کہ آئندہ بننے والے ملک میں غربت کیسے ختم کی جائے گی؟ لوگوں کو آگے بڑھنے کے کیا مواقع ہوں گے؟ کیا تاریخی طور پر ایسے شواہد ہیں کہ مسلم لیگ کے کسی اجلاس میں ایسا کوئی لائحہ عمل طے کیا گیا؟

جواب: نہیں میرا خیال ہے کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ میں نے بھی مسلم لیگ کے دو ایک لیڈروں سے پوچھا ہے کہ آپ کا وژن کیا تھا یعنی ملک کا معاشی اور سیاسی نظام کیا ہوگا تو انہوں نے جواب دیا کہ ان چیزوں پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ہندوستان میں آپ دیکھیں کہ تقسیم کے فوراً بعد دستور بن جاتا ہے، ہندوستان کے لیڈروں کا ایک وژن تھا، کہ ایک نیا تعلیمی نظام بنایا جائے گا۔ ہندوستان کو نہرو نے ایک سمت دے دی تھی، ہمیں یہ سمت نہیں ملی، نہ یہاں دستور بنا نہ صنعت کاری کا کوئی منصوبہ بنا۔ کہا گیا کہ یہ ملک ایک زرعی ملک ہے اس میں صنعت کاری کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں کہا گیا کہ صنعت کاری ہونی چاہئے۔ بس یہ ساری چیزیں بغیر منصوبہ بندی کے ہوئی ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ریاست نے جو ایک نظریہ ترتیب دیا ہے اس کو پوری قوم پر مسلط کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن، میڈیا غرض ہر طرح ایک ہی فکر کے لوگ پیدا کئے جا رہے ہیں۔ کیا اس طرح ہم کوئی صحت منداور مضبوط قوم پیدا کرسکیں گے جو کہ آگے بڑھ سکے؟

جواب: بات یہ ہے کہ ریاست بہت طاقتور ہوتی ہے، ریاست کے ادارے بھی بہت طاقتور ہوتے ہیں اور آجکل جس طرح سے میڈیا کی طاقت بڑھ رہی ہے، ریاست کی طاقت بھی بڑھ رہی ہے۔ مثلاً میڈیا اگر ریاست کے ہاتھوں میں ہو تو وہ اس کو استعمال کرتی ہے۔ درسی نصاب کی تیاری بھی ریاست کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ اس طرح لوگوں کو مخصوص قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو ایک ہی قسم کے نظریہ پر تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ سب میڈیا اور نصاب کی وجہ سے ہے۔ اس میں اخبارات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جب اخبارات کو آزادی مل بھی جاتی ہے تو وہ اسی نظریہ کی تشہیر کرتے ہیں جس سے ایک ہی ذہن اور ایک ہی فکر پیدا ہوتی ہے اس کے پس منظر میں ریاست کا دباؤ اور ریاست کے اپنے مفادات شامل ہیں، اب اس کی مخالفت کیسے کی جائے۔ لوگ مخالفت کرتے ہیں اور متبادل نقطہ نظر بھی پیش کرتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کے پاس دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے کے ذرائع نہیں ہوتے۔ ذرائع ابلاغ عامہ ان کا ساتھ نہیں دیتے تعلیمی نظام میں بھی اس بات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے ان کے خیالات پوری طرح قوم کو متاثر نہیں کرتے۔ جو فسطائی ریاستیں ہوتی ہیں ان میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان میں آزادی رائے کو کچل دیا جاتا ہے اور اظہار کے سارے راستے مسدود کر دیئے جاتے ہیں۔

سوال: ایک ایسے دانشور کو جس کا ضمیر زندہ ہو، پاکستان جیسی ریاست میں کس طرح کے خیالات پروان چڑھانے چاہئیں۔ کیا ایسے دانشور موجود ہیں اور اگر نہیں تو وہ کیوں پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟

جواب: ایک ایسی سوسائٹی جہاں تعلیم بہت کم ہو، جہاں بحث کرنے اور بات چیت کرنے کے مواقع بہت کم ہوں وہاں یہ توقع رکھنا کہ یہاں اعلیٰ پائے کے دانشور پیدا ہوں گے تو یہ غلط ہے۔ بہت سے لوگ تو اپنے مفادات کے لئے اپنے آپ کو ریاست سے وابستہ کر لیتے ہیں اور فائدے اٹھاتے ہیں اور پھر اگر کوئی تھوڑے بہت دانشور ہیں جو اپنی ریاست پر تنقید کرتے ہیں تو ایسے لوگوں پر معاشرے کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، ان کو معاشی طور پر کچل دیا جاتا ہے یا قید و بند کے ذریعے سے ان کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اختلاف کرنا یا اظہار رائے کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

سوال: اس پورے خطے میں کشمیر کو نیوکلیئر Flash Point کہا جا رہا ہے۔ ہمارے حکمران کشمیر کی آزادی کے حوالے سے میڈیا کو استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن جو کشمیر ہمارے پاس ہے اس کی کیا سماجی حیثیت ہے، نہ اس کو صوبائی خودمختاری حاصل ہے، نہ سینٹ اور اسمبلیوں میں اس کی کوئی نمائندگی ہے؟

جواب: اس کی وہی وجوہات ہیں جو کہ پورے ملک کے باقی علاقوں کی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ کشمیر کا مسئلہ اس وقت کیوں اتنی شدت سے ابھرا اور ضیاء الحق کے زمانے میں کشمیر کے مسئلے کو اتنی شدت سے کیوں نہیں اٹھایا گیا۔ بات یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ اپنی جگہ اہم سہی لیکن اس کے لئے پاکستان کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں بہتر یہی ہے کہ ہم پہلے اپنی حالت بہتر کریں۔

سوال: دہشت گردی کے حوالے سے جو بین الاقوامی مہم چل رہی ہے اس کے اثرات ہم پر کیا ہوں گے۔ ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟

جواب: ہمیں اس سے الگ رہنا چاہئے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں بھی ہم نے Proxy وار لڑی اور اس کے اثرات آج تک ہم پر پڑ رہے ہیں، آج بھی ہم وہی کر رہے ہیں تو اس کے اثرات پڑنا تو لازمی ہیں۔ ہمیں اپنے مفادات دیکھنے چاہئیں اور دوسروں کے مفادات کے لئے کام نہیں کرنا چاہئے۔

سوال: آئینی ترامیم کے حوالے سے معاشرے پر کیا اثرات ہوں گے؟

جواب: آئینی ترامیم کسی فرد واحد کا حق نہیں ہے۔ اگر یہ قانونی طور پر ہوں گی تو اس کا اثر ہوگا اور اگر یہ غیر قانونی طور پر کی گئیں تو ایک وقت آئے گا یہ ختم کر دی جائیں گی۔ اس لئے آئینی ترامیم جو ذاتی خواہشات اور انفرادی مفادات کی بنیاد پر کی جائیں گی وہ وقت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔

سوال: پاکستان میں وسائل اور اختیارات کی تقسیم غلط ہے، چھوٹے صوبے کہتے ہیں کہ این ایف سی ایوارڈ جس کا فارمولا آبادی کے لحاظ سے وسائل کی تقسیم پر ہے وہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: بات سیدھی ہے۔ جس ملک کے جو بھی وسائل ہوں اس کا زیادہ حصہ وہاں کے مقامی لوگوں کو ملنا

چاہئے۔ مثلاً بلوچستان سے گیس نکلتی ہے تو اس کا فائدہ وہاں کے لوگوں کو ہونا چاہئے یا سرحد سے بجلی پیدا ہوتی ہے تو اس کا زیادہ حصہ وہاں کے لوگوں کو ملنا چاہئے۔

سوال: پاکستان نے امریکہ کو سپر پاور بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس سپر پاور نے ترقی پذیر ممالک کو غلام بنالیا ہے۔ اس کردار کو ادا کرنے پر پاکستان کو کیا کہا جائے گا؟

جواب: پاکستان کے حکمران طبقوں نے اپنے مفادات کے لئے امریکہ کا ساتھ دیا ہے، پاکستان کے عوام نے اس کا ساتھ نہیں دیا اس لئے فائدہ بھی حکمران طبقات ہی حاصل کر رہے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آج 2002ء میں جس موڑ پر ہم کھڑے ہیں اس میں دو قسم کے رویئے جنم لیتے ہیں، ایک رویہ تو یہ ہے کہ موجودہ بحران جو کہ اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، معاشی ہے یعنی ہمارا پورا وجود بحران کا شکار ہے اس کے پیش نظر لوگ سارے مسئلے کی جڑ اس ملک کے قیام میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ کچھ تاریخی حقیقتیں ہوتی ہیں جو کہ اٹل ہو جاتی ہیں یعنی تاریخ کی نفی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ جہاں ہم کھڑے ہیں وہیں سے مسائل کے حل کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ ہمارے بہت سارے قوم پرست رہنما ہیں جو کہ مستقبل کا حل صرف ماضی کی غلطیوں کی تصحیح میں سمجھتے ہیں۔ اس ملک میں 14 کروڑ انسان رہتے ہیں جن کی ایک زندگی ہے، جن کی معاشرت ہے، جن کی امنگیں ہیں جو کہ مستقبل کی طرف جانا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب اس مستقبل کی راہ کیسے نکلے گی؟

جواب: اس بحث کو کہ کیا یہ ملک ٹھیک بنا تھا یا غلط بنا تھا، تاریخ کے حوالے کر دینا چاہئے۔ موجودہ حالات میں جو چیز ہمیں ٹھیک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو یہاں جمہوریت قائم ہونی چاہئے۔ دوسرا سیکولر سسٹم ہونا چاہئے اور اقلیتوں کو قومی دھارے میں شامل کر کے ان کو ہر قسم کے بنیادی حقوق دینے چاہئیں تاکہ وہ اپنے آپ کو اس ملک کا مکمل شہری سمجھ کر اس کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ ہمیں اپنے پڑوسی ملکوں ایران، افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ تجارتی، سیاسی اور ثقافتی ہر لحاظ سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ ہم ایک دوسرے سے اچھے تعلقات کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ جب ہم صحیح معنوں میں جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یہاں جاگیردارانہ نظام کو ختم ہونا چاہئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تو اس وقت تک صحیح جمہوریت قائم نہیں ہو سکے گی۔ جاگیردارانہ نظام کس طرح ختم ہونا چاہئے اس کی تاریخ میں بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً کہیں تو حکومت نے خود جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا ہے یعنی کوریا اور جاپان میں اور کچھ ملکوں میں سماجی انقلاب کے نتیجے میں یہ نظام ختم ہوا۔ کچھ میں یہ ہوا کہ صنعتی دور شروع ہونے کے بعد آہستہ آہستہ جاگیردارانہ قوتیں ختم ہونا شروع ہو گئیں۔ سیاست میں ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے کہ جو اس سمت میں کام کریں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس ملک میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے تو وہ سیاسی جماعتیں ہی لا سکتی ہیں۔ جب سیاسی جماعتوں کی بات کی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ ان کے پاس کوئی فکری اساس بھی ہو۔

ان کے یہاں بھی کوئی Research Cell ہونا چاہئے تا کہ قومی اور بین الاقوامی دونوں معاملات پر نظر رکھ سکیں۔ آج کسی سیاسی پارٹی سے پوچھیں کہ اگر وہ اقتدار میں آ جائے تو اس کی کیا پالیسی ہوگی تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ جب تک سیاسی پارٹیوں کا رہنما ڈھانچہ پورے طریقے سے نہیں بنے گا اس وقت تک وہ ملکی اور غیر ملکی حالات کو نہیں سمجھ سکیں گی اور وہ بہتر حکومت بھی نہیں بنا سکیں گی۔

(بدلتی دنیا: اگست 2000ء)



اسلام میں کسی ایک سیاسی نظام کا کوئی نقشہ نہیں

انٹرویو: اکرم شیخ

تاریخ ایک ایسا مضمون ہے...... جس میں پیاس کبھی ختم نہیں ہوتی ڈھیروں پانی پی کر بھی تشنگی لبوں سے چپکی رہتی ہے کیونکہ ایک پردہ ہٹتا ہے تو اس کے پیچھے ایک اور دنیا آباد ملتی ہے...... پوری دنیا...... جس میں بے شمار ملک، درجنوں تہذیبیں اور سینکڑوں قومیں آباد نظر آتی ہیں اور ان میں معاشروں اور ثقافتوں کے ہزاروں پہلو لاکھوں شکلوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں ہر ایک کا اپنا علیحدہ وجود اور مقام و مرتبہ ہوتا ہے کسی کو نظر انداز کرنا یا پھر اس سے آنکھیں چرا کر گزر جانا مشکل ہوتا ہے۔

اور جب کوئی تاریخ کا طالب علم، ان پر نگاہ کرتا ہے تو اس کو ان لاکھوں شکلوں میں کروڑوں کی تعداد میں زندگیاں حرکت کرتی اور سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں وہ ان میں کھو جاتا ہے انہیں کھوجنا شروع کر دیتا ہے ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور یوں یہ زندگیاں اس کی اپنی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی بھی تاریخ کے ایسے طالب ہیں کہ اب تاریخ ان کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے وہ سوتے جاگتے، تاریخ کو ہی سمجھنے اور اس میں موجود حقائق کو پرکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں انہوں نے درجنوں کتابیں لکھی ہیں، سینکڑوں مضامین قلمبند کئے ہیں لیکن پھر بھی پیاس ہے کہ ان کے ہونٹوں کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا نام پاکستان کے ہاں علم اور دانشوروں کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے کوئی حوالہ درکار ہو، کسی واقعہ کے بارے میں تاریخی معلومات حاصل کرنا ہوں انہی سے رجوع کیا جاتا ہے۔ انہی ڈاکٹر مبارک علی سے ہم نے مشرق کے قارئین کے لئے کچھ تاریخی معلومات حاصل کی ہیں جو ہم امانت سمجھ کر لوٹا رہے ہیں۔ پڑھئے اور غور کیجئے کہ یہ توشہ خاص ہے جو کبھی کبھی نصیب میں آتا ہے۔

مشرق: جنگ کو آپ تاریخی تناظر میں کیسے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ میں جنگوں کا تذکرہ تفصیل سے ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ ایک ڈرامہ ہوتی ہے کہ جس میں دو فریق باہم متصادم ہوتے ہیں شکست و فتح اس ڈرامہ کا المیہ اور طربیہ انجام ہوتا ہے

لیکن دونوں طرف اپنے جنرلوں اور فوجیوں کی بہادری کی توصیف و تعریف ہوتی ہے کہ جنہوں نے وطن، مذہب اور عزت کی خاطر جان قربان کی ہوتی ہے جو لوگ اپنی عزت، خاندانی وقار اور ملک و قوم کے لئے جانیں قربان کرتے ہیں معاشرہ ان کو ہیروز کا درجہ دیتا ہے ان کے قصیدے لکھے جاتے ہیں، مجسمے بنائے جاتے ہیں، القابات و خطابات سے نوازا جاتا ہے انہیں تاریخ کا حصہ بنا کر اعلیٰ وارفع مقام دیا جاتا ہے۔

مشرق: ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ جنگ معاشروں کے ارتقاء کے لئے ضروری ہوتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب: جی ہاں، کچھ ایسے مفکرین بھی ہیں جو جنگ کو معاشرے اور قوموں کی زندگی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ چونکہ جنگ فطرت میں ہر وقت جاری و ساری ہے اس لئے یہ ایک فطری عمل ہے جس سے گریز ممکن نہیں کسی قوم کو اپنی قوت، طاقت اور صلاحیتوں کا احساس اسی وقت ہوتا ہے کہ جب وہ حالت جنگ میں ہوتی ہے یہی وہ ماحول ہوتا ہے جس میں بکھرے اور ٹوٹے ہوئے گروہ اور جماعتیں باہم متحد ہو جاتی ہیں اپنے اختلافات ختم کر کے قومی مفادات کے تحت آپس میں مل جاتی ہیں۔ جنگ معاشرے میں بہادری اور جرات پیدا کرتی ہے بلکہ وہ حق گوئی اختیار کرنے کے بھی قائل ہو جاتے ہیں ایسے ہی مفکرین کا خیال ہے کہ طویل عرصہ حالت امن میں رہنے والی قومیں جسمانی کمزوری کا شکار ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور معاشرہ خوفزدہ اور سہمے ہوئے لوگ پیدا کرتا ہے۔

مشرق: لیکن ایک سچائی تو یہ بھی ہے کہ جنگیں حکمران طبقوں کے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: ایک زمانہ تھا جب زمین اور علاقوں کے لئے جنگیں ہوا کرتی تھیں پھر پیداواری وسائل پر قبضہ کے لئے لڑائیاں ہوئیں جس کے بعد مفادات کے حصول اور اس پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے یلغاریں ہوئیں جیسا کہ آج عراق میں ہوا ہے...... لیکن عجیب بات تو یہ ہے کہ جنگی ہیروز کی عظمت کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ اس نے کتنے انسانوں کو قتل کیا ہے ایک دانشور کا کہنا ہے کہ اگر کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرتا ہے تو وہ قاتل ہوتا ہے مگر جو ہزاروں کو مارتا ہے وہ فاتح ہوتا ہے بڑائی اور برتری کا پیمانہ یہ ہے کہ کتنے لوگوں کی جان لی گئی اس پیمانے سے دیکھا جائے تو سکندر اعظم اور سائرس عظیم کو دیکھا جائے تو وہ سب سے بڑے لٹیرے تھے۔ اسی لئے تو ایک بحری قزاق نے سکندر اعظم سے کہا تھا کہ تیرا پیشہ بھی قزاقی ہے اور میرا بھی قزاقی...... فرق صرف کمی بیشی کا ہے۔

مشرق: حکمران طبقے معاشرے میں جنگی ماحول بھی تو بنا کر رکھتے ہیں جیسا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ہے؟

ڈاکٹر صاحب: میکاولی نے جنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام کو جنگوں اور جنگی جنون میں مبتلا رکھیں تاکہ وہ ان کے خلاف بغاوتوں اور سازشوں میں ملوث نہ ہوں۔ قوم کو ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے ڈر، خوف اور عدم تحفظ

کے احساس سے متحد رکھتی ہے۔اس کا اندازہ ہماری اپنی تاریخ سے ہوتا ہے کہ ہم پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک حالت جنگ میں ہیں دشمن کا خوف ہماری رگوں میں سمایا ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے معاشرے نے اپنی تمام صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کو فوج کے حوالے کر کے خود کو ذہنی طور پر مفلوج بنالیا ہے اور اپنے تمام وسائل فوج کے حوالے کر کے اپنی زندگیوں کو پسماندہ کرلیا ہے۔

مشرق: جنگ میں مذہب کو بھی تو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: قدیم اور جدید سامراجی قوتوں نے جنگ کی تباہ کاریوں کو ہمیشہ ایک اخلاقی جواز دینے کی کوشش کی ہے کیونکہ لوگوں کو اس وقت تک جان دینے کے لئے تیار نہیں کیا جا سکتا جب تک ان کے سامنے کوئی اعلیٰ وارفع مقصد نہ رکھا گیا ہو اس لئے جنگ کو بامعنی اور بامقصد بنانے کا کام دانشور اور مذہبی رہنما کرتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے کہ جس کی بناء پر مذہب کے اختیار کو حاصل کیا گیا جب کسی کے ذہن میں یہ بٹھا دیا جائے کہ ان کا مذہب سچا اور دوسرا جھوٹا ہونے کے علاوہ خدا کا بھی دشمن ہے تو اس صورت میں یہ ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حق کے لئے لڑیں اور اپنی جان دے کر خدا کی خوشنودی حاصل کریں اور اس طرح مذہب کی خاطر جان دینے والے ہر مذہب میں شہید کہلاتے ہیں۔عہد وسطیٰ میں اسی مذہبی جذبہ نے ہی حق کی جنگ کے تصور کو پیدا کیا تھا اس حق کی جنگ کو یہودیوں نے اپنے ابتدائی دور میں استعمال کیا اور آج بھی فلسطین کے ساتھ ان کی جنگ میں یہی مذہبی جذبہ کام کر رہا ہے مسلمانوں کی جنگوں میں بھی اس جذبے کی فراوانی تھی کہ جس کے تحت انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کی صلیبی جنگوں میں اگرچہ معاشی اور سیاسی مقاصد بھی تھے لیکن زیادہ تر مذہبی جوش وجذبہ ہی تھا تاہم جب یورپ میں مذہبی اثر ورسوخ کم ہوا تو پھر اس کی جگہ قوم پرستی اور قومی ریاست نے لے لی جس کے تحت قومیتی بڑائی اور ریاستی عظمت کے لئے لڑنے کا نظریہ سامنے آیا اور یوں اس میں سے انسانیت اور اخلاقی اقدار کو بھی خارج کر دیا گیا۔

مشرق: قومیتی بڑائی اور عظمت کا یہی تصور حالیہ امریکی حملے میں بھی نظر آتا ہے، صدر بش امریکیوں کو عظیم قوم قرار دے کر دنیا کو ان کے تابع بنانے کی بات کرتے رہے ہیں اور پھر انہیں جمہوریت اور تہذیب دینے کا نعرہ بھی بلند ہوا۔

ڈاکٹر صاحب: تسلط کے ذریعے قوموں کو مہذب بنانے کا نظریہ بہت قدیم ہے یونان میں پیری کلس کا کہنا تھا کہ جو ریاستیں یونان کے زیر تحت آئیں گی ان کے لئے یہ ترقی کا باعث ہوگا کیونکہ وہ اس طرح یونان سے تہذیب وتمدن سیکھ کر اپنی پسماندگی کو دور کر سکیں گی اس نقطہ نظر کے تحت اہل یورپ نے امریکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو فتح کیا پھر آگے چل کر ہٹلر نے آریہ نسل کی برتری کا نظریہ پیش کیا اور سلاؤ قوم کو پسماندہ قرار دے کر یہ جواز دیا کہ وہ اپنے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے میں نااہل ہیں اس لئے ان کی زمینوں اور علاقوں

پر قبضہ کر کے جرمن قوم ان کا بہتر استعمال کر سکتی ہے موجودہ اسرائیل فلسطین میں بھی نسلی برتری کا یہی نظریہ کام کر رہا ہے۔امریکہ کی جنگجو ذہنیت میں بھی یہی نظریہ متحرک ہے۔امریکہ کی توسیع پسندی کا آغاز انیسویں صدی میں ہو چکا تھا جس کے لئے منشائے قدرت (Manifest Destiny) کا نظریہ ایجاد کیا گیا اور کہا گیا کہ قدرت کو یہی منظور ہے کہ امریکہ دوسرے ملکوں پر اپنا تسلط قائم کرے امریکہ کے ایک صدر روز ویلٹ نے کہا تھا کہ میں ہر جنگ کو خوش آمدید کہتا ہوں کیونکہ اس کی ہمیں ضرورت ہے لہٰذا جب ان جنگوں کے ذریعے امریکی صنعتکاروں اور سرمایہ داروں کو بھی منافع ملا تو انہوں نے ان سامراجی جنگوں کی پُر زور حمایت شروع کر دی کیونکہ فتوح اور زیر تسلط آنے والے ملکوں کی منڈیوں سے انہیں بہت فائدہ حاصل ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ امریکہ واحد سپر پاور ہونے کی وجہ سے اپنے سیاسی، ثقافتی اور معاشی تسلط کو دنیا پر قائم کرنے کا خواہشمند ہے اس کے سامراجی عزائم میں عہد وسطیٰ کے نظریات سے لے کر آج کے افکار تک سب شامل ہیں وہ اپنی جنگوں کو حق کی لڑائی بھی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا ان کے ساتھ ہے وہ یہ جنگیں اس لئے بھی لڑ رہا ہے کہ مغربی تہذیب کا دفاع کیا جا سکے، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کی طرف مائل اقوام اس وقت مہذب ہوں گی جب وہ امریکہ کے زیر تسلط آ جائیں گی دوسری دلیل وہی ہے کہ یہ اقوام اپنے وسائل کا بہتر استعمال نہیں کر رہیں امریکہ چونکہ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہے اس لئے اسے یہ حق حاصل ہے کہ ان وسائل کو تہذیب وتمدن کی ترقی کے لئے استعمال کرے۔امریکی اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی امریکی صدی ہے لہٰذا ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا کو اپنے زیر تسلط لا کر پائیدار امن قائم کریں اس کی بنیاد ''پاکس رومانا'' پر ہے کہ جس کے تحت رومیوں نے جنگ کر کے اپنی ایمپائر سے تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا تھا امریکی حکمران بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ جنگ کے ذریعے دوسرے ملکوں کے اسلحہ اور فوجی طاقت کو ختم کر دیں اور اس کے بعد دنیا میں ایک ایسا پائیدار امن قائم کریں کہ جس کے نگران وہ خود ہوں اور دوسرے تمام ممالک ان کی شرائط کے تحت رہنا قبول کریں۔

مشرق: تاریخ فہمی کو عام کرنے کے لئے کن چیزوں کو اہمیت دی جانی چاہئے؟

ڈاکٹر صاحب: تاریخی شعور اصل میں متبادل نظریات کی موجودگی کا متقاضی ہوتا ہے صرف ایک نقطہ نظر جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ اس کو کتابوں اور میڈیا میں بیان کیا جاتا ہے تو تاریخ کا صحیح ادراک نہیں ہوتا یہ صورتحال صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہر نظریاتی ملک میں ہوتی ہے خواہ وہ سوویت یونین تھا یا پھر اسرائیل ہے اس میں ایک ہی نقطہ نظر سامنے رہتا ہے جس سے تاریخ فہمی کے لئے وسعت باقی نہیں رہتی لیکن اگر متبادل فکری رجحان موجود ہوں تو پھر ان متبادل نظریات میں سے حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے چونکہ واقعہ تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کی توضیح وتشریح مختلف ہوتی ہے۔اس کی مثال ایسے بھی ہوتی ہے کہ فاتح قوم اپنے ہیروز بنا کر اس پر فخر کرتی ہے لیکن جب ان پر حملہ ہوتا ہے تو وہ اس کو برائی قرار دیتے ہیں اس لئے ضرورت

اس امر کی بھی ہے کہ ہمیں حملہ آور کی کوئی ایک تعریف مقرر کرنی چاہئے یہ نہیں کہ کسی کے ملک پر حملہ کر کے اس کے وسائل پر قبضہ کر دیا جائے کوئی بھی کرے یہ غلط ہے لیکن تاریخ میں اس کی کوئی باقاعدہ تعریف متعین نہیں جیسے انگریز نے سندھ پر حملہ کیا تو ہم اس کو غلط قرار دیتے ہیں لیکن محمد بن قاسم کے حملے کو جائز قرار دیتے ہیں اس لئے تاریخ کو مذہب اور قوم پرستی کے مخصوص نقطہ نظر سے الگ رکھ کر محض تاریخ کے طور پر دیکھنا چاہئے پھر آپ کو تاریخی شعور بھی ملے گا اور آپ کے فہم میں یہ بات بھی آئے گی کہ کیا غلط تھا اور کیا صحیح۔

مشرق: یعنی نظریات کا تقابل ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب: بالکل...... کسی بھی نظریئے، کسی بھی خیال کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہئے ورنہ تنگ نظری غالب آجائے گی جس زمانے میں برطانیہ فتوحات کر رہا تھا تو ''اپنے دیس'' کا ایک نظریہ تھا جس میں وہ صحیح اور غلط کی تمیز سے باہر تھے یعنی اس میں سے تمام اخلاقیات نکال دی گئیں جب تاریخ میں اس طرح کا تعصب آجاتا ہے تو پھر وہ لوگوں کو صحیح شعور نہیں دے سکتی۔

مشرق: معاشرتی رویئے تاریخ میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب: معاشرتی رویئے دراصل مختلف زمانوں اور ماحول میں پیدا ہوتے اور پھر تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں مثلاً ہندوستان میں جب مسلم حکمران تھے تو ان کی حکومت کی بنیاد فوجی طاقت پر تھی اس سے مسلمانوں میں یہ رویہ غالب ہوا کہ جو فوجی ہے وہ ہیرو ہے لیکن جو پڑھنے لکھنے والے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں اور پھر یہی وہ نظریہ تھا کہ جس میں صاحب سیف وقلم کی اصطلاح سامنے آئی یعنی اس میں سیف کو اولیت حاصل تھی اسی چیز کو علامہ اقبال نے بھی بیان کیا اور کہا

شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

یہ فرق اصل میں ایسے معاشروں میں ہوتا ہے جو جنگ کو اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں ایسے معاشروں میں علم ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے دانشوروں اور صاحب علم کی وہ قدر نہیں ہوتی جو شمشیر بکف لوگوں کی ہوتی ہے چنانچہ جنگ بازوں کو تو پسند کیا جاتا ہے لیکن امن پسندوں کو بزدل قرار دیا جاتا ہے۔

اسی طرح جب کسی معاشرے میں اختیارات کسی ایک شخص یا ادارے کے پاس جمع ہو جائیں تو دوسروں کی محرومی انہیں خوشامد پرستی کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ صلاحیتیں بھی کام نہیں آتیں یا پھر سازشیں ہوتی ہیں چونکہ انسان کی بنیادی خواہش زندہ رہنا اور اس کے لئے ضرورتوں کو پورا کرنا، خواہ وہ کسی طریقے سے ہوں یہ طریقے انہیں ماحول سے ملتے ہیں جو اجتماعی رویئے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں لیکن اگر کسی معاشرے میں ادارے موجود ہوں اور انہیں وہاں سے معاشرتی اور معاشی انصاف مل رہا ہو تو پھر اس پر منفی رویئے غالب نہیں آئیں گے آپ سمجھ لیجئے کہ بادشاہتوں اور آمریتوں میں لوگوں کے رویئے خوشامدانہ اور سازشانہ ہو جاتے ہیں لیکن جمہوری معاشروں میں ایسا نہیں ہوتا

آپ اپنے حقوق اور انصاف کے لئے لڑتے ہیں۔

مشرق: اسلامی تاریخ میں کہیں کوئی جمہوریت کا تصور بھی ہے؟

ڈاکٹر صاحب: بالکل نہیں، کیونکہ اسلام میں کسی ایک سیاسی نظام کا کوئی نقشہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد چاروں خلیفہ مختلف طریقوں سے منتخب ہوئے اس کے بعد ملوکیت آئی اور پھر جاگیردارانہ نظام آ گیا ہمارے تمام فقہی تصورات میں ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کو ہی اہمیت حاصل ہے اس کو سپورٹ کیا گیا اور یہ آج تک چل رہا ہے لیکن اس میں وقت اور حالات کی ضرورتوں کے مطابق کوئی تبدیلی نہیں آئی حالانکہ ماحول، معاشرہ اور سوچ کے ساتھ تہذیب و تمدن بھی تبدیل ہو چکا ہے اگر مذہب آج کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا تو سوسائٹی آگے بڑھ جائے گی۔

مشرق: آج بھی صورتحال تو ایسی ہی ہے کہ مذہب پیچھے رہ گیا ہے اور سوسائٹی آگے بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: بالکل......لیکن ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جب سوسائٹی اور مذہب میں فرق آ جاتا ہے تو مذہب پسماندہ ہو جاتا ہے اور اس میں شدت آ جاتی ہے پھر جبر بھی آ جاتا ہے جیسا کہ آج کل ہے لیکن یہ کوشش نہیں کر رہا کہ مذہب کو آج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور اس کی جدید خطوط پر تشریح کی جائے۔

مشرق: یہ کام کہیں کہیں ہو تو رہا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: لیکن ان کی کوئی نہیں سن رہا۔ مثلاً اقبال نے ''تشکیل الٰہیات'' میں جو کچھ کہا اس کو کوئی نہیں مانتا۔ فتویٰ لینا ہو تو مسجد کے پیش امام کے پاس جاتے ہیں لیکن اسلامی اسکالر سے رابطہ نہیں کیا جاتا۔

مشرق: عوام کا تاریخ میں کبھی کوئی کردار نہیں رہا لیکن اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ حکمران اپنی مرضی کی تاریخ لکھواتے رہے حالانکہ تاریخ تو ہوتی ہی حکمرانوں کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اب تک تاریخ میں وہی لوگ سامنے آئے کہ جو طاقتور تھے، بادشاہ، امراء، علماء۔ جن کے پاس طاقت تھی، عام آدمی کے پاس تو طاقت نہیں تھی اس لئے وہ تاریخ میں شامل نہیں ہوئے یہ رویہ آج بھی ان ملکوں میں ہے جہاں بادشاہتیں اور آمریتیں ہیں لیکن جہاں جمہوریت آ گئی ہے وہاں اب نئی سوچ اور نئے رویئے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اب تاریخ کے بارے میں نیا نظریہ سامنے آ گیا ہے ''ہسٹری فرام دی بیلو'' یعنی عوام کی تاریخ، کسانوں، چرواہوں، خانہ بدوشوں، غلاموں کی تاریخ لکھنے کا عمل شروع ہو گیا ہے اب فرانس، روس اور برطانیہ کے لوگوں کی تاریخ لکھی جا رہی ہے جس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کا ٹائٹل تبدیل ہو گیا ہے۔ ہمارے نظام میں چونکہ طاقت عوام کے پاس نہیں ہے اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس طاقت نہیں اس لئے ان کا تاریخ سازی میں بھی کوئی حصہ نہیں۔

مشرق: حالانکہ تہذیب وتمدن، کلچر اور ثقافت جو تاریخ کے اہم اجزاء ہوتے ہیں ان کے تمام مراکز تو عوام میں ہوتے ہیں وہی اس کے پھیلاؤ کے لئے کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: 1940ء کی دہائی میں فرانس میں کچھ مؤرخین نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اب ایسی تاریخ نویسی کا کام بہت ہو چکا اب سماجی اور ثقافتی تاریخ لکھی جانی چاہئے چنانچہ انہوں نے منفرد کام شروع کیا اور نجی زندگی کی تاریخ لکھی، بچپن کی تاریخ قلمبند کی یعنی بچپن مختلف ادوار میں کیسا تھا اور پھر کچھ ایسے لوگ بھی آئے کہ جنہوں نے آنسوؤں کی تاریخ لکھی، غصے کی تاریخ بیان کی۔ اس طرح تاریخی کو بہت زیادہ وسعت حاصل ہوگئی ہے ان کا کہنا ہے کہ لوگوں کے جذبات کی تاریخ بھی لکھی جانی چاہئے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں شخصیت پرستی ہے اور ہیروز کی تاریخ لکھی جاتی ہے اب اس کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

مشرق: ڈاکٹر صاحب، رائے عامہ تاریخ کو کس حد تک متاثر کرتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب: اس کا انحصار معاشرے پر ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک تو معاشرے میں شرح خواندگی کیا ہے دوسرا یہ کہ میڈیا تاریخ کو کیسے پیش کر رہا ہے اس کی ایک مثال امریکہ ہے جہاں مفاد پرست طبقے غالب ہیں وہ لوگوں کو صحیح معلومات نہیں پہنچاتے، اس جنگ میں دیکھیں کتنا جھوٹ بولا گیا ہے اس کے بالمقابل کچھ لوگ ہیں جو سچی بات کر رہے ہیں لیکن ان کے ذرائع بہت محدود ہیں جس کی وجہ سے مکمل حقائق سامنے نہیں آسکے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خواہ جمہوری ملک ہی کیوں نہ ہوں اگر وہاں میڈیا پر مفاد پرست حاوی ہوں گے تو وہ رائے عامہ کو بھی تبدیل کر دیں گے یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں کہا جا رہا ہے کہ میڈیا اڑتالیس گھنٹوں میں لوگوں کا ذہن تبدیل کر سکتا ہے اصل میں یہ جو کارپوریٹ کلچر آیا ہے اور اس نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے تو اس کے بالمقابل متبادل نظریات کا پھیلاؤ بھی کم ہو گیا ہے اب ذہن وہی بنے گا جو وہ بنانا چاہتے ہیں یہ ایک خطرناک صورتحال ہے اس سے کیسے نکالا جائے گا یہ کہنا ابھی مشکل ہے کیونکہ صحیح بات کہنے والوں کے پاس وسائل بہت کم ہیں۔

مشرق: آج کل یہ جو تہذیبوں کے تصادم کی بات چل رہی ہے اس کو آپ تاریخی تناظر میں کیسے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب: یہ پروپیگنڈہ بھی دراصل امریکہ اور اس کے ادارے سی آئی اے کا شروع کیا ہوا ہے کیونکہ اس وقت امریکہ دنیا میں بالادستی چاہتا ہے اسی لئے وہ اس کو تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نام دے رہے ہیں۔

مشرق: گویا ہم جو اس تصادم کا رونا رو رہے ہیں اصل میں ہم غیر ارادی طور پر انہی کے چنگل میں پھنس رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: بالکل، ان کا ایک خاص مقصد ہے ان کے پاس طاقت، دولت، وسائل، ہتھیار اور

ڈاکٹر صاحب: یہ تاریخ کے بارے میں پرانا اور متروک نظریہ ہے ایک زمانہ تھا جب کہا جاتا تھا تاریخ کی چار متحرک شکلیں ہیں، اول یہ کہ انسان کا خیال تھا کہ جس طرح موسم آتے جاتے ہیں اسی طرح ہر چیز پہیے کی طرح گھومتی ہے جیسے ہندوستان میں زندگی کا ایک چکر بنایا جاتا ہے اسی طرح یونان میں بھی تھا اس طرح یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تاریخ بھی اپنے آپ کو دہراتی ہے یعنی ایک چکر پورا ہوتا ہے تو پھر وہی سب کچھ سامنے آنے لگتا ہے لیکن بعد میں ایک اور نظریہ سامنے آیا کہ جس میں کہا گیا کہ تاریخ چکر نہیں لگاتی وہ سیدھے راستے پر چلتی ہے ایک بات عرض کردوں کہ اگر آپ چکر میں رہیں گے تو اسی دائرہ میں گھومتے رہیں گے ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ پھر انصاف کو ترقی اور نجات کی ضرورت محسوس ہوئی اور تاریخ کے صراط مستقیم پر چلنے کا نظریہ سامنے آیا، تیسرا نظریہ پنڈولم کا سامنے آیا اور کہا گیا کہ تاریخ کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف جاتی ہے چوتھا سی سا (Sea Saw) کا نظریہ تھا یعنی تاریخ اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے۔ جس میں یہ کہا گیا کہ قومیں عروج پر جاتی ہیں اور پھر زوال پذیر بھی ہوتی ہیں...... دراصل چار بنیادی اشکال ہیں جن سے ہم تاریخ کے واقعات کو سمجھ سکتے ہیں لیکن دہرانے والا عمل نہیں۔

مشرق: لیکن پھر سوال یہ ہے کہ تاریخ سے سبق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: ہو سکتا ہے جب بھی کسی کو مکمل اختیارات ملتے ہیں وہ اپنے لئے بھی اور قوم کے لئے بھی خطرناک ہوتا ہے...... کیونکہ سب اختیارات

ٹیکنالوجی ہے کیونکہ اس وقت حقیقت تو یہ ہے کہ تمام علم اور ترقی مغربی تہذیب کے پاس ہے جبکہ دوسری تہذیبیں پسماندہ ہیں نہ ان کے پاس علم ہے اور نہ جمہوریت، اگر یہ اسی طرح باقی رہیں تو ان کی ترقی یافتہ تہذیب کے لئے خطرہ ثابت ہوں گی ان رکاوٹوں کو اگر ختم کر دیا جائے تو ہماری تہذیب پوری دنیا میں پھیل جائے گی اور اس کے ذریعے امن بھی قائم ہوگا اس کی مثال یوں بھی ہے کہ ایک گاڑی کے سامنے گدھا گاڑی آ کر راستہ روک لے تو اس سے انہیں پریشانی تو ہوگی اور وہ اس کو ہٹانا چاہتے ہیں یہ ان کا سیاسی نقطہ نظر ہے جس میں وہ اپنی بالادستی چاہتے ہیں لیکن اگر ہم تاریخ میں تہذیب کو دیکھیں تو اس کا مطلب شائستگی ہے اگر دو جگہوں پر شائستگی ہو تو وہ آپس میں کبھی نہیں ٹکراتیں ٹکراؤ تو ہمیشہ انتہاپسندی اور بنیاد پرستی کا ہوتا ہے۔

مشرق: یعنی جو متضاد ہے ان میں ٹکراؤ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب: بالکل..... تہذیبیں تو ایڈوانس ہو جاتی ہیں ان میں علم کی وجہ سے وسعت نظری آ جاتی ہے وہ آپس میں ٹکراتی نہیں اشتراک کرتی ہیں تاریخ میں تہذیبوں نے ایک دوسرے سے سیکھا ہے وہ کبھی آپس میں نہیں ٹکرائیں۔ آج بھی اصل میں جو ٹکراؤ ہے وہ بنیاد پرستی کا ہے مغرب میں بھی بنیاد پرستی ہے اور مشرق میں بھی..... یہی ٹکرا رہی ہیں۔

مشرق: ڈاکٹر صاحب! کیا تاریخ ماضی پرستی نہیں؟

ڈاکٹر صاحب: ماضی پرستی ہے لیکن اگر اس کو ایسا بنایا جائے اور اس کا رجحان پسماندہ معاشروں میں سامنے آتا ہے وہ معاشرے جن کے پاس حال میں کام کرنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا وہ اپنی پسماندگی اور احساسِ محرومی کو تاریخ سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ہمارے ہاں اقبال کا رویہ ہے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

یا پھر

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

یہ اصل میں تو معاشرتی پسماندگی کی دلیل ہے لیکن جو معاشرے پسماندہ نہیں ہوتے تاریخ نہیں ماضی کے حوالے سے شناخت اور تفاخر تو دیتی ہے لیکن ان کا راستہ نہیں روکتی کیونکہ جو تو میں ماضی کی طرف دیکھتی ہیں وہ مستقبل کی طرف نہیں دیکھ سکتیں، ماضی میں اگر کوئی فتوحات ہوئی ہیں یا آپ نے کوئی تاریخی کارنامے انجام دیئے ہیں تو وہ مستقبل کے لئے بنیاد فراہم کرتے ہیں تاکہ ان پر آپ مستقبل کے محلات تعمیر کر سکیں لیکن اس میں الجھ کر رہ جانا کسی بھی طرح ٹھیک نہیں ہوتا اس لئے ماضی پر مکمل انحصار نہیں کرنا چاہئے۔

مشرق: ڈاکٹر صاحب! ایک تصور تاریخ کے اپنے آپ کو دہرانے کا بھی ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

یہ لوگ معاشرے اور اس کے متحرکات سے کٹ جاتے ہیں اس بناء پر میں اکثر کہتا ہوں کہ ہماری پارلیمنٹ کے اکثریتی ممبر اگر اپنی صلاحیت کی بناء پر مارکیٹ میں کام کرنے کی تلاش میں جائیں تو کوئی انہیں چپراسی رکھنا بھی گوارہ نہ کرے ان میں وہ صلاحیت بھی نہیں۔ جعلی ڈگریاں لے کر ممبر بن گئے ہیں جو لوگ مارکیٹ میں جا کر کام نہیں کر سکتے وہ ملک کیسے چلا سکتے ہیں..... دوسری اس ملک کے لئے سب سے بڑی قسمتی فوج کا ملک پر غلبہ ہے فوج کا کام ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہوتا ہے ملک کو چلانا نہیں۔ اب تو ہر محکمے ہر ادارے میں بھی فوجی بیٹھ گئے ہیں یہاں تک کہ اب اخباروں میں کالم بھی ریٹائرڈ فوجی افسر لکھنے لگے ہیں ایسی صورتحال میں جب سول سوسائٹی سے عوام کو نکال کر خود قبضہ کر لیں تو پھر اس کی پسماندگی لازم ہو جاتی ہے۔

مشرق: گلوبل ویلیج میں قومیتوں کے تصور کا کیا ہوگا؟

ڈاکٹر صاحب: وہ بھی ختم ہو جائے گا گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ قومی کلچر، قومی شناخت سب کچھ ختم ہو جائے گا اس کا مطلب ویسٹرنائزیشن یا امریکنائزیشن، میڈیا کے ذریعے اس کا غلبہ کیا جا رہا ہے۔

(مشرق: سنڈے میگزین 11 مئی 2003ء)

☆☆☆

ممتاز تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی کی مختلف موضوعات پر گفتگو

انٹرویو: افضال ریحان

ڈاکٹر مبارک علی کے آباء کا اصل خطہ تو راجستھان ہے لیکن تقسیم کے بعد آپ حیدر آباد سندھ میں آباد ہوئے۔ 1963ء میں سندھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹر کرنے کے بعد 1976ء میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی۔ سندھ یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے اور جرمن کلچر سنٹر گوئٹے انسٹیٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر بھی رہے۔

☆...... ڈاکٹر صاحب! پچھلے دنوں آپ کے حوالے سے یہ خبر چھپی تھی کہ آپ نے عراق پر امریکی حملے کی حمایت کی ہے؟

O...... حیدر آباد میں میرا ایک لیکچر تھا اس میں کہی گئی چند باتوں کو ڈیلی ٹائمز نے غلط چھاپ دیا اور وہیں سے اس طرح کی غلط فہمی دیگر کئی اخبارات کے ذریعے شائع ہو گئی، حالانکہ ایسی بات نہیں تھی بعد ازاں اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

☆...... بات کیا تھی؟

O...... میں نے تو یہ کیا تھا کہ صدام حسین کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے عراق نے خود کو تنہا کر لیا تھا بالخصوص اپنی ہمسائیگی میں واقع تمام ممالک سے اس نے اپنے تعلقات بری طرح بگاڑ لیے تھے۔ آپ جانتے ہیں ایران کے ساتھ ساتھ آٹھ نو سال جنگ کی گئی پھر کویت پر قبضہ کر لیا گیا، سعودی عرب پر بھی میزائل پھینکے گئے تھے۔ دوسری اس سے بھی بری بات اپنے شہریوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیاں تھیں، بالخصوص کردوں اور شیعوں کے ساتھ۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ملک جس کے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہوں اور اندرون ملک عوام بھی حکومت سے مطمئن نہ ہوں تو وہ از خود غیر ملکی طاقتوں کو جارحیت کی دعوت دیتا ہے۔

☆...... آپ کے خیال میں امریکہ نے دنیا بھر میں وسیع تر انسانی احتجاج اور یو این او کی مخالفت کے باوجود عراق میں یہ جارحیت کیوں کی؟

○......میری رائے میں امریکہ کو تیل کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ اسے اپنی ضرورت کا مطلوبہ تیل وافر مقدار میں مل رہا تھا۔ اس کے لئے سعودی عرب اور نائیجیریا ہی کافی تھے، البتہ اسرائیل کو یہ مسئلہ ہوسکتا ہے۔ اسے انرجی پرابلم ضرور ہے، وہ آج کل روس سے تیل حاصل کرتا ہے جو اس کے لئے خاصا مہنگا پڑتا ہے جبکہ عراق پر برٹش کنٹرول کے دوران اس خطے کے لئے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق عراق سے تیل کی لائنیں بچھی ہوئی ہیں اب انہیں بحال کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی اسرائیل کو عراق سے کئی خدشات تھے انہی کے پیش نظر اس نے 1985ء میں عراقی اٹامک انرجی پلانٹ کو تباہ کیا تھا اور اب بش کی ایڈوائزری میں دو تین ایسے افراد آ گئے ہیں جو نہ صرف یہ کہ یہودی ہیں بلکہ اسرائیلی شہریت کے حامل بھی ہیں۔ اسرائیل کے خلاف عراق کئی فلسطینی گروپوں کو سپورٹ بھی کرتا تھا۔

☆......تاریخی تناظر میں آپ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا حل کیا دیکھتے ہیں؟

○......تاریخی طور پر یہ مسئلہ 1971ء میں ''اعلان بالفور'' سے پیدا ہوا ہے۔ اس سے پہلے اہل فلسطین یہاں سکون سے رہ رہے تھے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے دوران یہودی سائنس دانوں نے اتحادیوں سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ ہمیں جنگ کے بعد ہمارا یہ ملک لوٹا دیں تو ہم آپ کو سپورٹ کریں گے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور فرانس میں یہ خفیہ معاہدہ ہوا تھا ''سائیکو پیکوٹ معاہدہ'' جس کے تحت بعد از جنگ سیریا و لبنان فرانس کو اور عراق و فلسطین برطانیہ کو ملنے تھے۔ 1917ء میں رشین انقلاب آ گیا تو انہوں نے اس خفیہ معاہدے کو شائع کر دیا۔ تو برطانیہ کی یہ پہلے سے پلاننگ تھی کہ یہودیوں کو یہاں آباد کیا جائے گا۔

☆......کیا خودکش حملے جائز قرار دیئے جاسکتے ہیں؟

○......جب خودکش حملے نہیں ہو رہے تھے تب بھی فلسطینیوں سے یہی سلوک ہو رہا تھا۔ میں نے تو خود فلسطینیوں کا حال دیکھا ہے کہ عرب ممالک میں بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جا تا رہا ہے۔ خاندانوں کے خاندان اکٹھے بیٹھ نہیں سکے، اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

☆......مگر دہشت گردی کی تاریخ تو خاصی پرانی ہے؟

○......وہ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ جب ان کی کہیں شنوائی ہی نہیں ہو رہی تھی پھر تنگ آمد بجنگ آمد والی بات ہی ہوئی تھی۔

☆......کلنٹن دور میں عرفات کو جو پیشکش ہوئی تھی وہ کیوں قبول نہ کی گئی؟

○......مغربی کنارے کا پورا علاقہ تو فلسطینیوں کو ملنا چاہئے۔ یہودیوں کی نوآبادیاں ختم ہونی چاہئیں۔ اوسلو معاہدے پر عمل نہیں ہوا۔ یروشلم کا مسئلہ ہے۔ کلنٹن نے ان مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا تھا۔

☆......کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عرفات حماس کے ڈر سے امن کی طرف نہیں آئے؟

○......میرے خیال میں عرفات اپنی طاقت کھو چکے ہیں۔خود فلسطینیوں کے اندران کی مقبولیت نہیں رہی ہے۔نیلسن منڈیلا نے ساؤتھ افریقہ کی آزادی کے وقت کہا تھا کہ فلسطینی قیادت سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہے۔جس طرح ہم نے اپنے حقوق کے لئے مغربی عوام سے روابط پیدا کئے انہیں بھی ایسے ہی کرنا چاہئے تھا۔یہ بار بار حکومتوں اور حکمرانوں کے پاس چکر لگاتے رہے عام لوگوں کے پاس نہیں گئے۔مسئلہ فلسطین حل کرنے کے لئے بہتر تھا کہ یہ یورپ اور امریکہ کے عوام کو قائل کرتے۔

☆......کیا جدید جمہوری ریاستوں میں جمہوری اپروچ مستحکم ہونے سے مذہبی الجھنیں پس منظر میں نہیں چلی جاتی ہیں؟

○......ہاں جمہوریت میں وطنی قومیت کی بنا پر ہر ایک کے ووٹ کی اہمیت ہوتی ہے۔

☆......ہماری تاریخ میں لارنس آف عریبیا اور شریف حسین مکہ کے رول کو ہمیشہ منفی بنا کر کیوں پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ترک امپیریلزم کے خلاف اٹھے تھے؟

○...... یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ عربوں کی بغاوت ترک امپیریل ازم کے خلاف تھی لیکن ہمارے ہاں اس کو خلافت کے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے ہندوستان کے مسلمانوں نے تو خلافت کے بچاؤ کی خاطر بڑی تحریک چلائی تھی، اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عربوں کو بھی خلیفہ کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہئے تھی سو یہاں ہسٹری کو اس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔

☆......کیا اب پاکستان کی باری آئے گی؟

○......پاکستان کی باری نہیں آئے گی۔ہمارے امریکہ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں۔

☆......اسرائیل کی مخالفت بھی تو ہے؟

○......اسرائیل کے ساتھ بھی ہماری کوئی ڈائریکٹ مخالفت نہیں ہے نہ کوئی تنازعہ ہے، لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ ایسے ہو۔

☆......اگر ایٹمی طاقت مولوی صاحبان کے ہاتھ آجائے تو......؟

○...... پہلے تو اس کے امکانات بہت کم ہیں دوسرے ہمارے ہاں فوج اتنی طاقتور ہے کہ سارے اختیارات اس کے پاس ہیں۔یہاں سیاست تو ویسے ہی برائے نام ہے۔اب موجودہ حالات میں تو یہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوگئے ہیں۔سول سوسائٹی تو ختم ہو کر رہ گئی ہے۔تمام حکومتی شعبوں میں ریٹائر فوجی بھیج دیئے گئے ہیں۔جن سیاستدانوں کو یہ استعمال کر رہے ہیں۔ان کی اپنی کوئی عوامی بنیاد ہی نہیں ہے۔جن کی بنیاد تھی وہ اپنی رہائیوں یا دیگر ذاتی چکروں میں الجھے ہوئے ہیں۔

☆......فوجی صدر نے تو پوری پارلیمنٹ کو غیر مہذب قرار دے دیا ہے۔

○......یہ بڑی نامناسب بات کہی گئی ہے یہ اپنے مفاد کے لئے اس چیز کو دستور کا حصہ قرار دے رہے

ہیں جسے پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ سپریم کورٹ کی تو ایسی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ کسی آرڈیننس کو آئین بنا دے۔ اس کا کام آئین کی تشریح کرنا ہے آئین بنانا نہیں۔

☆......ایسے میں اگر وہ اسمبلیاں توڑ دیں گے تو......؟

O...... یہ پاکستان کا المیہ ہوگا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہماری سیاسی پارٹیاں بھی جاگیرداری کے چنگل سے باہر نہیں آ سکی ہیں اس لئے عوام بھی اپنے مسائل کی وجہ سے بڑی حد تک غیر سیاسی ہو گئے ہیں جس کا فائدہ ہر ڈکٹیٹر اٹھاتا ہے۔ اس لئے اس وقت اصل مسئلہ جمہوریت کا ہے۔ اس ایک مسئلے سے کئی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

☆......کیا موجودہ جمہوری سیٹ اپ میں کوئی جان آ سکتی ہے؟

O......فوجی حکمرانوں نے جو جمہوریت متعارف کرائی ہے آپ ذرا صلاحیتوں کے لحاظ سے اس کا جائزہ لیں۔ اگر اوپن مارکیٹ میں جاب کے لئے ان لوگوں کو جانا پڑے تو شاید کوئی انہیں کلرک بھی نہ رکھے۔

☆......تو پھر آپ کے خیال میں مضبوط اپوزیشن سے بچنے کے لئے یہ کیا کریں گے؟

O......میرا خیال ہے کہ یہ پیٹریاٹ طرز پر لوگوں کو توڑنے کی کوشش کریں گے۔ بات چیت میں الجھا کر، کوئی چکر چلا کر۔

☆......اگر دوبارہ الیکشن ہوئے تو ایم ایم اے جیسی پارٹیاں مزید مضبوطی سے نہیں آ جائیں گی؟

O......میرا خیال ہے ان کے پاس ایشوز کوئی نہیں ہیں مثلاً انہیں ابھی جو موقع ملا ہے اس میں انہوں نے عوام کے لئے کیا کیا ہے۔ سزائیں دیا یا میوزک پر پابندی لگا دینا تو کوئی بات نہ ہوئی۔

☆...... پاکستان کی نصف صدی پر محیط تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کس بڑی خامی کی نشاندہی کرتے ہیں؟

O......میری نظر میں سب سے بڑی خامی یہ رہی ہے کہ ہم نے بروقت دستور نہیں بنایا، جب بنایا ہے تو اسے نہیں اپنایا۔ ہم نے کس راستے پر چلنا ہے یہ بہت شروع میں متعین کر دینا چاہئے تھا۔ 1956ء میں دستور بنا تو ایوب نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، 1973ء کا دستور بنا تو جنرل ضیاء نے اسے مسخ کر دیا اور اب پھر اسے مسخ کرنے کی کاوشیں ہو رہی ہیں، اس سے ریاستی ادارے کیسے مستحکم ہو سکتے ہیں۔

☆......ہماری سوسائٹی میں انتشار کیوں ہے؟

O......اس کی وجہ اسلام کا سیاسی استعمال ہے۔ فوج اور سیاستدان دونوں نے اپنے اپنے مقاصد کی خاطر اسلام کو استعمال کیا ہے۔ میری نظر میں مذہب اور سیاست کے خانے الگ الگ رہنے چاہئیں۔

☆ ......مگر یہ کہا جاتا ہے کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی؟

○ ......ابتدائی دور میں شاید یونہی ہوا اور یہ بہتر ہو لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ آج کے زمانے میں ہر شعبہ زندگی اتنی ترقی کر گیا ہے کہ انہیں گڈمڈ کرنے سے کئی دوسرے مسائل پیدا ہو جائیں گے کیونکہ دونوں کے تقاضے اپنی اپنی جگہ ہیں۔ مغرب میں بھی ترقی کا دور تبھی شروع ہو سکا ہے جب سیاست کو ایسی مداخلت سے آزاد کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز خود مذہب کے حق میں بھی بہتر ہوتا ہے۔ مذہب متنازعہ نہیں بنتا بلکہ لوگوں کی روحانی زندگی میں امید اور حوصلہ فراہم کرتا ہے۔

☆ ......ڈاکٹر صاحب تاریخ اسلام پر آپ نے براہِ راست وہ اہتمام نہیں کیا جو جنوبی ایشیاء پر کیا ہے؟

○ ......آپ کو تلخ سچائی بتاؤں، مسلم ہسٹری پر کوئی مسلمان سچائی نہیں لکھ سکتا۔ اس سلسلے میں سوسائٹی کی طرف سے اس قدر پابندیاں اور بندشیں ہیں کہ میں نے اس پر کچھ بھی لکھنے سے احتراز کیا ہے۔

☆ ......باہر کے لوگوں میں سے جدید دور میں سب سے بہتر کام کس نے کیا ہے؟

○ ......مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ آپ کبھی ان کی کتاب ''الفتنۃ الکبریٰ'' ضرور پڑھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے جاہلیہ کے عرب شعراء پر بھی لکھا تھا مگر اس کتاب پر اتنی تنقید ہوئی کہ بہت سی چیزوں کو اس میں سے نکالنا پڑا۔ ان کے علاوہ مصر ہی کے محمد شعبان کی دو کتابیں جو لندن سے چھپی ہیں بہت عمدہ ہیں ان میں ایک Early Islamic History اور دوسری ''عباسی انقلاب'' ہے۔

☆ ......تاریخ کو سمجھنے کا بہترین اصول یا بنیادی نقطہ آپ کس چیز کو قرار دیتے ہیں؟

○ ...... یہ کہ تاریخ کو آپ مذہب سے الگ کر کے پڑھیں جبکہ ہماری تاریخ مذہب کی یرغمال بنی ہوئی ہے۔ ہم مذہب کو بنیاد بنا کر جارح کا دفاع شروع کر دیتے ہیں جبکہ آپ اس کے کریکٹر کو آزاد زاویے سے دیکھیں۔ آپ اپنے جارح کو باعث رحمت قرار دیتے ہیں تو دوسری قوم اپنے جارح کو یہی مقام دے گی لہٰذا ان تعصبات سے بلند ہو کر مطالعہ تاریخ کریں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ہیرو ورشپ سے باہر نکل ہی نہیں سکے۔ جمہوری سوسائٹی کی خوش بختی ہے کہ ان کے پاس کوئی ہیرو نہیں رہا۔ جس کی پوجا کی جاتی ہے۔

☆ ......آپ تاریخ میں مسلم امہ کے تصور کو کن معنوں میں لیتے ہیں؟

○ ...... سچی بات تو یہ ہے کہ مسلم امہ ایک مفروضہ ہے، جس کا حقیقی تصور نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ مسلمانوں کی جو بڑی بڑی سلطنتیں بنی ہیں وہ بھی ذو معنی ہی رہی ہیں مثلاً عثمانی ایمپائر کے دوران آرمینین ایک الگ ملت تھی اور اسے ملت ہی بولا جاتا تھا اور ملت کا لفظ بالعموم چھوٹی اقوام کے لئے استعمال ہوا

ہے۔ مسلمانوں میں قومی ریاستوں کا وجود بہت شروع سے رہا ہے۔ تمام مسلم اقوام کی شناخت الگ الگ علاقائی لسانی بنیادوں پر یا نسلی بنیادوں پر قائم رہی ہے کیونکہ اسلام مذہب ہے قوم نہیں۔ میثاق مدینہ میں بھی یہ چیز صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے جب یہودی بھی مسلم امہ میں شامل تھے۔ یہ تصور وقت اور حالات کی مطابقت میں ڈھلتا رہا ہے۔ لہٰذا میری نظر میں ہمارے بین الاقوامی معاملات اور تعلقات انسانی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ مسئلہ فلسطین کا ہو، ایسٹ تیمور کا ہو یا ساؤتھ افریقہ کا ہمارا رویہ خالص انسانی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔

☆...... مسلمانوں میں جمہوریت کیوں نہیں آ سکی؟

○...... یہ سوال بڑی تفصیلات کا متقاضی ہے۔ لفظ ''ڈیموکریسی'' مغرب سے نکلا ہے۔ مسلمانوں کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ان کی توجہ اندرونی امور کی بجائے بڑی بڑی فتوحات اور ایمپائرز قائم کرنے پر صرف ہو گئی، تمام وسائل بڑی بڑی افواج اور جنگوں پر صرف ہوتے رہے، تخلیقی صلاحیتیں بھی ادھر ہی صرف ہوئیں اور جو سوچنے والے اذہان تھے وہ بادشاہتوں کو اسلام کے ذریعے جائز ثابت کرنے میں مشغول رہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملوکیت نے اسلام کا پورا رخ ہی بدل دیا۔ ایمپائر بلڈنگ نے جاگیردارانہ اقتدار کو مستحکم کیا اور عوام کو وہ اہمیت نہ دی گئی جو دی جانی چاہئے تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہب کی سپورٹ عوام کو ملنے کی بجائے حکمرانوں کو ملتی رہی۔ علمائے اسلام کے فتاویٰ ظل اللہ فی الارض اور ظل سبحانی پر صرف ہو گئے۔ یہاں تک کہ مغربی اقوام جدید علوم کی طاقت سے اٹھے اور ہم ان کے نو آبادیاتی نظام کی غلامی میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادیاں نصیب تو ہوئیں لیکن جمہوریت کی بجائے فوجی آمریتیں یا شخصی حکمرانیاں قائم ہو گئیں۔ عوام کو سیاست سے دور رکھتے ہوئے مخصوص مراعات یافتہ طبقات اقتدار پر قابض ہو گئے۔ آپ دیکھیں اب حالت یہ ہے کہ خود مسلم ممالک میں جارحیت ہو تو اس کے خلاف مغربی اقوام میں ہم سے زیادہ احتجاج ہوتا ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو کسی مخصوص سیاسی نظام کا پابند نہیں کیا تھا جس سے یہ گنجائش نکلتی کہ مسلمان اپنے حالات کے تحت سیکولر جمہوری نظام کو اختیار کر لیتے مگر مذہبی اجارہ داری اور فیوڈل ازم نے یہاں اظہار رائے کی آزادی کو ابھرنے ہی نہیں دیا بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر کسی کو یہ کہہ دیا جائے کہ تم داڑھی رکھ کر بھی بے ایمانی کرتے ہو تو اس پر بھی توہین رسالت کا فتویٰ لگ سکتا ہے۔ مذہبی علماء کی چاپلوسی کے لئے ضیاء الحق نے جو قوانین اور سزائیں لاگو کروائیں تھیں ہمارے جمہوریت والے نواز شریف نے نظر ثانی کرنے کی بجائے انہیں مزید شدید کر دیا۔ نظریہ پاکستان کیا ہے؟ اس کی کسی کو سمجھ ہے یا نہیں لیکن اس کی سزا دس سال قید بامشقت رکھ دی گئی ہے۔ یعنی سوسائٹی کو شعوری ترقی سے نہیں قوانین کو بندش سے کنٹرول کیا جائے۔ اس سے نظریاتی فرسودگی آئی ہے۔ ایسے میں فکری تازگی کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آپ دیکھیں سعودی معاشرے میں تیل نکلنے

کے بعد معاشی بدحالی دور ہوئی لیکن اس کو سوسائٹی میں مصرف کیا ہوا، تہذیبی ترقی کیا ہوئی فکری لحاظ سے سوسائٹی پسماندگی میں گھری ہے۔

☆......تاریخ میں آپ کا آئیڈیل دور کون سا ہے؟

O......خدا کرے کہ لوگوں کو آئیڈیل دور نصیب ہو۔

(پاکستان: سنڈے میگزین 24 مئی 2003ء)

☆☆☆

پہلے پاکستان کو فوج کی ضرورت تھی
اب فوج کو پاکستان کی ضرورت ہے

انٹرویو: شیخ عبدالرشید

گجرات ٹائمز: اپنے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں کس سن میں پیدا ہوا؟ یہ مشکل سوال ہے میں نے جب بھی والدہ سے پوچھا توان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ رمضان کا مہینہ تھا اور اس روز بہت زوردار بارش ہو رہی تھی۔ پھر سکول جانے کے لئے فارم بھرتے وقت میں نے خود اپنی تاریخ پیدائش کا تعین کر لیا، 21 اپریل 1941ء اب یہی میری پیدائش ہے۔ تاہم میں اپنی پیدائش کی جگہ کبھی نہیں بھولا ریاست ٹونک راجستھان کی ایک ریاست تھی جسے میں پنجاب میں اختر شیرانی کا وطن کہتا ہوں۔ میری ابتدائی تعلیم قرآن شریف کے ناظرہ پڑھنے سے ہوئی۔ والد کو ہماری تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اس لئے انہوں نے نہ ہمیں کسی سکول میں داخل کرایا اور نہ ہم سے پوچھا کہ کیا پڑھنا چاہتے ہو، میرے پھوپازاد نے مجھے وہاں دارالعلوم خلیلیہ میں داخل کرادیا۔ تقسیم کے بعد 1952ء میں ہم ہجرت کر کے کھوکھراپار کے راستے حیدرآباد آ گئے تو یہاں سب سے بڑا مسئلہ میرے داخلے کا تھا۔ میرے پاس کسی سکول کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا بڑی سفارش کے بعد خالد میموریل سکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ ملا۔ داخلہ سے قبل یہاں دو تین سال ایسے ہی ضائع ہو چکے تھے، میں نے 1956ء میں ادیب کا امتحان پاس کیا اور 1957ء میں انگریزی کا پرچہ دے کر میٹرک کیا۔ اس کے بعد شام کے کالج سٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کے چار سالوں میں ٹیوشن پڑھا کر گزارہ کیا۔ بعدازاں سندھ یونیورسٹی میں ایم اے جنرل ہسٹری میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ایم اے اول پوزیشن میں کرنے کی وجہ سے یونیورسٹی کے شعبہ میں ہی جونیئر لیکچرر شپ مل گئی 1963ء سے 1970ء تک سات سال یونیورسٹی میں پڑھایا۔ اس دوران اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ایک بار مجھے سپین کا سکالرشپ مل گیا مگر وائس چانسلر حسن علی عبدالرحمان نے مجھے چھٹی نہ دی۔ پھر میں نے ذاتی کوشش سے کوئین میری کالج لندن میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ایک سال پڑھا تو قانون بدل گیا اور غیرملکی طلبہ کی فیسیں بڑھ گئیں تو میں یہ جان کر کہ جرمن

یونیورسٹیوں میں ٹیوشن فیس نہیں ہوتی جرمنی چلا گیا اور روھر یونیورسٹی بوخم جرمنی میں پروفیسر Busse کے ساتھ مغل دربار اور اس کی رسومات پر پی ایچ ڈی کی۔ اس دوران جرمنی سے گھر آیا تو والد کے اصرار پر اس شرط پر شادی کر لی کہ گھر والوں کے علاوہ کوئی شریک نہیں ہوگا اور کوئی رسم و رواج نہیں ہوگی۔ شادی کے بعد اپنی بیوی ذکیہ کے ہمراہ جرمنی چلا گیا۔ بعدازاں پی ایچ ڈی کی ڈگری اور دو بیٹیاں لے کر بیوی کے ہمراہ واپس حیدرآباد آ گیا۔ 1976ء میں دوبارہ جائن کیا تو کافی مشکلات پیش آئیں وہاں کے مصائب کی وجہ سے 1989ء میں لاہور آ گیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر انصاری جاننے والے تھے، انہوں نے کہا کہ ساؤتھ ایشیا ایریا سٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر رکھوا دیتا ہوں مگر وہاں کوئی وی سی اور ڈائریکٹر رفیق احمد سمیت لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ لاہور میں گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر کی پوسٹ خالی تھی اس پر چلا گیا وہاں ساڑھے چار سال رہا بہت کام کیا 1995ء میں جرمن حکومت نے لاہور سمیت دنیا بھر میں 90 انسٹیٹیوٹ بند کر دیئے تو وہاں سے فارغ ہو گیا، تب سے فری لانس ہوں۔ نیشنل کالج آف آرٹس میں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر پڑھاتا ہوں۔

گجرات ٹائمز: بطور مورخ آپ کا فلسفہ تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ کے مضمون کے اندر وقت کے ساتھ بہت تبدیلیاں آ گئی ہیں چنانچہ میرا خیال ہے کہ ہماری تاریخ کے اندر جو نئے رجحانات آئے ہیں، ان سے روشناس کروانا چاہئے اور تاریخ نویسی میں ان کا ذکر بھی کرنا چاہئے جن کا تاریخ میں ذکر تک نہیں ملتا یعنی یہ جو کسان ہیں، مزدور ہیں، کاریگر ہیں، عورتیں ہیں، بچے ہیں اور عام آدمی جس کو کہ تاریخ سے نکال دیا گیا۔ عموماً تاریخ کا تعلق طاقت سے سمجھا گیا، طاقت چونکہ حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے، جو کبھی نظر نہیں بھی آتی ہمیں اس طاقت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے مثلاً کمزور لوگوں کے پاس بھی طاقت کے ہتھیار ہوتے ہیں جیسے مزدور ہیں وہ ہڑتال کر سکتے ہیں اور اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ ہم گھریلو ملازمین کی شکایات اکثر کرتے ہیں کہ وہ سست و کاہل ہیں، یہ ایک ذریعہ جس سے وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا اظہار کرتے ہیں سستی و کاہلی کمزوروں کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ جب اس کو دریافت کر لیا جائے تبھی تاریخ میں ان لوگوں کا کردار آ سکتا ہے۔ عام آدمی بھی تاریخ بناتا ہے جب تک ہم مکمل تاریخ نہیں لکھیں گے صرف اوپر والے طبقے کی نہیں بلکہ نیچے والے طبقے کی تاریخ، اس وقت تک صحیح تاریخی شعور ہم میں نہیں آئے گا۔

گجرات ٹائمز: ہمارے ہاں لکھی جانے والی تاریخ کی بڑی خامیاں کیا ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس کی سب سے بڑی خامی تو یہی ہے کہ یہ صرف حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ دوسرا یہ کہ ان میں خوشامدانہ عنصر بہت زیادہ ہے یعنی حاکموں کے کارنامے، ان کی نیکیاں و خوبیاں بیان کی جاتی ہیں جبکہ دوسرا رخ یعنی ان کا استحصالی پہلو، ان کے مظالم اور خرابیاں بیان نہیں کی جاتیں۔ ایک اور خامی یہ ہے کہ تاریخ میں صرف واقعات بیان کر دیتے ہیں جبکہ تاریخ محض واقعات نگاری نہیں بلکہ واقعات کا تجزیہ بھی کرنا

ہوتا ہے اس لئے کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز سے دیکھا اور لکھا جاتا ہے جیسے محمود غزنوی کے بارے میں ہے کچھ لوگ اسے مجاہد کہتے ہیں، کچھ لٹیرا سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ اسے بڑا Imperialist قرار دیتے ہیں، تاریخی واقعات کو دیکھنے کے بہت زاویے ہیں اب تو کئی نئے نظریات اور فلسفے آ گئے ہیں، انہی کی روشنی میں تاریخ لکھی جاتی ہے موجودہ دور میں دو اہم پہلو سامنے آئے ہیں ایک ہے ماحولیات کی تاریخ، کہ ماحول نے لوگوں پر، سماج پر، رسوم و رواجات پر کیا اثر ڈالا۔ اور دوسرا ہے عورتوں کی تاریخ، ماضی میں عورتیں تاریخ سے غائب تھیں اب عورتیں خود اپنی تاریخ لکھ رہی ہیں دوسرے بھی لکھ رہے ہیں یہ سبھی چیزیں ہوں تبھی تاریخ مکمل ہوتی ہے ورنہ ادھوری رہے گی۔

گجرات ٹائمز: شروع میں یہاں عرب مسلمان آئے، انہوں نے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب کئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: عرب یہاں پہلے جنوبی ہندوستان میں بحیثیت تاجر کے آئے۔ اس لئے یہاں ان کا کردار بڑا مختلف رہا کیونکہ نہ وہ جنگجو تھے، نہ لڑاکا اور نہ تبلیغی ان کا مقصد تجارت اور نفع کمانا ہوتا تھا چنانچہ وہ وہاں کے کلچر میں مل گئے اور ہندوستانی ہو گئے۔ دوسرے عرب سندھ میں آئے یہاں وہ بحیثیت فاتح و جنگجو کے آئے تھے چنانچہ یہاں ان کا کردار مختلف تھا، وہ اپنے آپ کو الگ رکھتے تھے آج بھی سندھ کے اندر قریشی، انصاری اور اس طرح کے نام ملتے ہیں بلکہ عرب ہونے کا فخر اتنا زیادہ تھا کہ جو عرب نہیں تھے وہ بھی خود کو عرب کہنے لگے جیسے کلہوڑا تھے، وہ مقامی تھے مگر انہوں نے بھی کہا کہ ہم عباسی ہیں۔ فاتح عربوں کے سامنے لوگوں نے اپنا origin بدل کر عرب بنانا شروع کر دیا لیکن اس کے باہر عربوں کا کوئی اثر نہیں رہا بعد میں مسلمان شمالی ہندوستان میں آئے، وہ ترک تھے اسی طرح یہاں عرب اسلام نہیں بلکہ ایرانی اسلام آیا، یہاں فارسی سرکاری زبان بنی، عربی نہیں۔ عربی زبان مدرسوں تک محدود تھی جبکہ ادبی، علمی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔

گجرات ٹائمز: کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہب کوئی unified مذہب نہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اصل میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ہندو مذہب میں conversion نہیں ہوتی، دوسری بات یہ ہے کہ ہندو مذہب نہیں بلکہ یہ تو بہت بعد میں نام دیا گیا ان کے ہاں کروڑوں خدا اور بت ہیں بلکہ وہ سہولت کے لئے انہیں ساتھ بھی رکھ سکتے ہیں۔ ہاں! اوپر کی سطح پر ایک خدا یا ایشور کا تصور بھی ہے، برہما کا تصور ہے لیکن نچلی سطح پر بہت سی دیوی دیوتا ہیں چنانچہ ہندو مذہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت کی طرح semitic نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں پیغمبر بھی نہیں ہیں بلکہ ہندو مذہب وقت کے ساتھ ساتھ بنتا چلا گیا بدلتا چلا گیا مثلاً ویدک دور میں ہندو مذہب کی شکل کچھ اور تھی بعد میں بدھ مذہب آتا ہے، جین آتا ہے۔ یہ دراصل برہمن ازم کے خلاف بغاوت تھی جنہوں نے بہت مہنگی رسومات کو شامل کر لیا جن کا خرچ برداشت کرنا مشکل ہو گیا پھر بدھ اور جین آئے اور رسومات کو ختم کیا اور سادگی کی طرف آئے۔ گپت دور میں پھر

دوبارہ سے ایک نیا مذہب تشکیل دیا جو ویدک مذہب سے مختلف تھا۔ آج ہندوازم کی شکل اسی زمانے کے ہندو مذہب والی ہے اس لئے اس کا اسلام سے کوئی مقابلہ نہیں۔

گجرات ٹائمنز: آپ کے خیال میں ہندو مذہب نے اسلامی معاشرت پر زیادہ اثرات ڈالے یا اسلام نے ہندو معاشرت پر؟

ڈاکٹر مبارک علی: چونکہ مسلمان یہاں رہتے ہیں اس لئے اثرات بھی ان پر زیادہ ہوئے جو لوگ یہاں پر مسلمان ہوئے وہ برادریاں اور وہ قبیلے اپنا لوکل کلچر ساتھ لائے۔ ابھی بھی ان نومسلموں کا کلچر ہندوانہ ہے جہاں نکاح پڑھواتے ہیں وہاں پھیرے بھی لگواتے ہیں۔ اور وہ مسلمان جو باہر سے آئے ان پر بھی بہت اثر ہوا۔ آپ غور کریں مولویوں کی طرف سے اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں ہندوانہ رسومات بہت آ گئی ہیں ان کو نکالا جائے مثلاً انیسویں صدی میں شاہ اسماعیل شہید نے جو تقویت الایمان اور صراط مستقیم نامی کتابیں لکھیں ان میں بڑی تفصیل ہے کہ کون کون سی ہندوانہ رسومات ہیں جو مسلمانوں میں آ گئی ہیں۔ ہاں مسلمانوں کا اثر بھی ہندو تہذیب پر تھوڑا بہت ہوا مگر یہ اثر صرف طبقہ اعلیٰ تک محدود تھا۔

گجرات ٹائمنز: ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسلام یہاں تلوار کے زور پر پھیلا؟ آپ کیا کہیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، بالکل نہیں، اسلام نہ ہندوستان میں تلوار کے زور پر پھیلا اور نہ کہیں دوسری جگہ۔ یہ ایک پرانی myth ہے۔ حالانکہ جتنی بھی فتوحات ہوئیں ان میں فاتحین کو مسلمان کرنے سے کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی، بلکہ محمد بن قاسم آیا تو مقامی آبادی نے اپنی ضرورتوں کے تحت کسی قبیلے کے سردار نے اسلام قبول کیا پھر سارا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا، اسی طرح بنگال میں ہوا یہی پنجاب میں ہوا۔ اس حوالے سے رچرڈ ایٹن کی اچھی کتاب ہے ''بنگال میں اسلام کیسے پھیلا'' اس کا کہنا ہے کہ مغربی اور مشرقی بنگال کو الگ الگ رکھنا ہوگا۔ مغربی بنگال میں برہمن ازم بہت زیادہ مضبوط تھا، ذات پات کی تقسیم بہت زیادہ تھی، اس لئے مغربی بنگال کے اندر اسلام نہیں پھیلا جبکہ مشرقی بنگال میں قبائلی نظام تھا، وہ قبیلوں میں رہتے تھے جنگلوں میں پھر وہاں کوئی صوفی آیا اس کے مرید بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے جنگل صاف کیا اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ قبیلے والوں نے دیکھا تو متاثر ہوئے اس طرح وہ صوفیوں کے زیر اثر آ گئے پھر انہوں نے دیکھا دیکھی مسلمان ہونا شروع کر دیا، قبیلے کا قبیلہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ رچرڈ ایٹن کے خیال میں جہاں قبائلی نظام تھا وہاں اسلام تیزی سے پھیلا مگر جہاں قبائلی نظام نہ تھا وہاں نہ پھیل سکا۔ شمالی ہندوستان میں دہلی و آگرہ میں مسلمان اکثریت نہ ہو سکے کیونکہ یہاں برہمن ازم مضبوط تھا۔ لہٰذا اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا یہ لوگوں کی اپنی سماجی، سیاسی اور معاشی ضرورت تھی یہاں کسی نے سمجھ کر، تدبر کے بعد اسلام قبول نہیں کیا۔ یہاں پھیلنے والے اسلام کی بنیادیں rational نہیں تھیں۔ صوفیاء کی تبلیغ سے بھی نہیں مثلاً نظام الدین اولیاء کے بارے میں ہے کہ ان کے ہاتھ پر صرف ایک آدمی مسلمان ہوا تھا وہ بھی انہیں پسند نہیں تھا یہ تبلیغ نہیں کرتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں کسی کو مسلمان بنانا بطور سزا کے ہوتا تھا یعنی جنگی قیدی آ جایا کرتے تھے تو انہیں کہتے کہ مسلمان

ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے جہانگیر کے زمانے میں بھی یہ تھا کہ تبلیغ کا کام صرف ریاست کا کام ہے عالمگیر کے زمانے میں بھی یہی تھا۔

گجرات ٹائمز: بھگتی تحریک کن خیالات کی مظہر تھی، اسلامی اجتہاد یا ہندو جدت پسندی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جیسا کہ عرفان حبیب نے کہا ہے کہ جب ترک یہاں آئے تو بہت سی ٹیکنالوجی بھی لے کر آئے مثلاً وہ اپنے ساتھ Wheel لے کر آئے جس سے کاشتکاری اور پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ترک روئی دھننے والی مشین لے کر آئے اس سے ٹیکسٹائل کے شعبے میں کام ہوا۔ ترک کاغذ لے کر آئے کاغذ کی صنعت نے انقلاب برپا کر دیا، اس سے مزدور اور کاریگر جن کا درجہ گرا ہوا تھا اب بلند ہونے لگا۔ مگر ہندو سماج میں مرتبہ، دولت یا کام سے نہیں پیدائش سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طبقے کو اپنے سماجی رتبے کی بلندی کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے تحریک چلائی کہ ان کو بھی سماج کے اندر عزت ملنی چاہئے۔ بھگتی تحریک میں شامل تمام لوگوں نے طبقہ اعلیٰ کے خلاف بغاوت کر دی پنڈت سے، مُلّا سے، مسجد سے مندر سے، برہمنوں کی کتاب پر اجارہ داری تھی تو کبیر نے کہا کہ ہمیں تو کتابی علم کی ضرورت ہی نہیں ہمیں تو مشاہداتی علم کی ضرورت ہے۔ انہوں نے طبقہ اعلیٰ کو ہر لحاظ سے رَد کر دیا، انہوں نے کہا کہ شہر بدعنوانیوں کا مرکز ہیں یہاں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں ہمیں دیہاتوں میں جانا چاہئے کیونکہ دیہات کی زندگی سادہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھگتی تحریک ایک سماجی احتجاج تھا سماجی بغاوت تھی، سماجی تحریک تھی۔ یہ گاؤں گاؤں جایا کرتے تھے پنجاب میں بابا گورونانک بھی اسی تحریک کا حصہ تھے۔

گجرات ٹائمز: تھوڑا آگے بڑھتے ہیں پاکستان کا قیام اسلامی تحریک کے نتیجے میں ہوا یا معاشی محرومیاں اس کا موجب بنیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اسلام کا تو پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا قیام پاکستان سیاسی اور معاشی وجوہات کی بناء پر ممکن ہوا۔ پوری تحریک میں بار بار یہی بات ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے سیاسی حقوق ملنے چاہئیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جتنے معاہدے ہیں حکومت سے جتنی بات چیت ہے وہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں، نوکریاں ملنی چاہئیں، مذہب کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا۔

گجرات ٹائمز: مسلم تشخص اور consciousness کے پیچھے تو مذہب تھا یا یہاں بھی نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہندوستان میں مسلمان ہی ایک کمیونٹی نہیں تھی، نچلی ذاتوں کا حال ان سے بھی برا ہے سکھ تھے پارسی تھے۔ حقوق کا مطالبہ تب شروع ہوا جب تعلیم یافتہ مڈل کلاس آتی ہے وہ بھی یوپی کی۔ پاکستان جہاں بنا وہ تو مسلم اکثریتی علاقہ تھا یہاں مسلمانوں کے کوئی مسائل نہ تھے یہ تو یوپی کے مسلمانوں کا مسئلہ تھا کہ نوکریاں ملنی چاہئیں، حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ سب تحریکیں وہیں سے چلیں اس کے پس منظر میں انہوں نے مذہب کا نام استعمال ضرور کیا، مسلمانوں کا نام ضرور لیا جب وہ یہ کہتے کہ مسلمانوں کو حقوق ملنے چاہئیں تو اس سے مراد مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے سے ہوتی ورنہ مسلمانوں میں کسان بھی تھے، دستکار بھی تھے، کاریگر

بھی تھے ان کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اسی لئے تقسیم کے بعد جو ہجرت ہوئی اس میں وہاں سے نوکر پیشہ طبقہ ہی آیا، کسان نہیں آیا، کاریگر نہیں آیا وہ ہندوستان میں ہی رہا چونکہ یہ ان کا مسئلہ ہی نہیں تھا، ہاں جب فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے عام لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ یہ افسوسناک پہلو ہے۔ Elite Class کے پاس تو اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جائیداد اور جان بچا کر آ جائیں لیکن عام آدمی متاثر ہوا۔

گجرات ٹائمز: کیا تقسیم ہند یا علیحدگی کا ثمر ملا مسلمانوں کو؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں ملا، نہ یہاں ملا نہ وہاں، جو یہاں ہیں ان کی حالت بھی قابل رحم ہے جو ہندوستان میں ہیں وہ بھی پسماندگی کے عالم میں ہیں۔ ہاں! پاکستان جنہوں نے بنایا تھا ان کو اس کا پورا پھل مل گیا وہ زمیندار و جاگیردار ہیں ان کو پورا ثمر مل رہا ہے۔ فوج بعد میں اس ٹولے میں آ گئی اس وقت تو آرمی بھی نہیں تھی مگر وہ ہی پاکستان بننے کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھا رہی ہے۔

گجرات ٹائمز: قائداعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے لبرل ماڈریٹ سیاستدان تھے جبکہ مسلم لیگ کا رویہ فرقہ وارانہ رہا۔ قائد کی تعلیمات کا مسلم لیگ پر اثر کیوں نہ پڑا؟

ڈاکٹر مبارک علی: قائداعظم کانگرس میں تھے پھر ایک زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں میں تھے۔ دیکھا جائے تو مسلم لیگ کو عوامی پارٹی بنانے کا فیصلہ 1936ء میں کیا چونکہ کانگرس میں تو پہلے یہی ہندو، مسلمان، سکھ سب تھے۔ وہ ایک سیکولر پارٹی تھی اگر ویسی ہی کوئی پارٹی بناتے تو پھر مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے مسلم لیگ کو صرف مسلمانوں کی پارٹی بنایا گیا تاکہ ایک طرح کا کریکٹر بنایا جا سکے۔ ٹھیک ہے جناح لبرل و سیکولر بھی تھے لیکن وقت کی ضرورت کے مطابق مسلم لیگ کا جو ڈھانچہ بنا وہ بالکل کمیونل ہو کر رہ گیا۔ پھر جناح صاحب نے بھی اسی لائن کو اختیار کیا۔ مثلاً جب عبوری حکومت بن رہی تھی تو انہوں نے کہا کہ صرف مسلم لیگ ہی کو اختیار ہے کہ وہ مسلمان نمائندے نامزد کرے۔

گجرات ٹائمز: تقسیم سے پہلے مسلم لیگ وفاقی نظام اور صوبائی خودمختاری کی علمبردار تھی بعد میں یہاں حکمران جماعت بنی تو اس کی پالیسیاں مضبوط مرکز کی مظہر تھیں، اس کی کیا وجوہ ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: مسلم لیگ نے پہلے کابینہ مشن کو بھی اسی لئے قبول کر لیا، کانگرس نے اسے رد کر دیا کہ وہ مضبوط مرکز چاہتے تھے مگر پاکستان بننے کے بعد مفادات بدل گئے۔ نئے مفادات کے تحت انہوں نے پاکستان کا جو تصور دیا وہ قومی ریاست کا تھا اس کا مطلب ہوتا ہے ایک ریاست، ایک قوم، ایک زبان، ایک مذہب، ایک کلچر، جو یہاں نہیں تھا۔ یہاں پانچ اکائیاں، پانچ کلچر اور پانچ زبانیں تھیں۔ یہاں ریاست نے کہا کہ صوبائی تعصب ختم کر کے ایک قوم بن جائیں۔ یہ تجربہ ناکام ہو گیا سب سے پہلی بغاوت مشرقی پاکستان میں ہوئی پھر دیگر صوبوں میں جو لیڈر تھے ان کی ضرورت یا قوت تھی جو مضبوط مرکز سے ہی ممکن تھی۔

گجرات ٹائمز: یعنی کمزور قیادت مرکزیت کا سبب بنی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی، کمزور قیادت ہی اس کا بڑا سبب بنی؟

گجرات ٹائمز: کہا جاتا ہے کہ اقبال کی فکر افغانستان جیسا ملک جنم دیتی ہے اور جناح کی فکر پاکستان جیسا ملک پیدا کرتی ہے اگر ایسا ہی ہے پھر دونوں پاکستان کے بانی کیسے ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: دونوں کو ریاست نے بنا دیا ورنہ اقبال نے جو خطبہ الٰہ آباد دیا تھا اس میں پاکستان کا کوئی ذکر نہیں، کوئی تصور نہیں۔ دراصل ہوا یہ کہ جب پاکستان بنا تو پنجاب کا تحریک میں کوئی حصہ نہ تھا۔ 1946ء تک یہاں یونینسٹوں کی حکومت رہی بلکہ 1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس کے دوسرے دن سکندر حیات نے پنجاب کی مجلس قانون ساز میں کہا کہ پنجاب سے آپ دور رہیں پنجاب کے معاملات میں کوئی دخل نہ دیں۔ وہ پنجاب کو الگ رکھنا چاہتے تھے، مسلم لیگ سے بھی اور مسلم لیگ کی لیڈر شپ سے بھی۔ پھر آخری دنوں میں جناح صاحب نے بھی الیکشن جیتنے کے لئے پنجاب کے زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں سے معاہدے کر لئے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ پنجاب کا جدوجہد پاکستان میں حصہ نہ تھا مگر اب اسے بھی تو اپنا حصہ بتانا تھا، اس لئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کا خواب اقبال نے دیکھا یا پاکستان کا نقشہ اقبال نے بنایا، عملی جامہ جناح نے پہنایا ورنہ اقبال کا قیامِ پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔

گجرات ٹائمز: پاکستان جمہوری جدوجہد سے وجود میں آیا مگر یہاں سول سوسائٹی ایک ادارے کی شکل کیوں اختیار نہ کرسکی؟

ڈاکٹر مبارک علی: پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان جمہوری طریقوں سے وجود میں نہیں آیا کیونکہ سرسید ہی سے ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم اقلیت اور ہندو اکثریت ہیں۔ جمہوری طرزِ حکومت سے تو ہم کبھی اقتدار میں نہیں آئیں گے لہٰذا جمہوریت بڑی خراب چیز ہے۔ مولانا جوہر نے بھی کہا جمہوریت بڑی بری چیز ہے۔ جمہوریت کے خراب ہونے کے جذبات پہلے سے ہی ہمارے اذہان میں تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اسی لئے اقلیت واکثریت کا ہی سوال رہا مثلاً جی ایم سیّد نے کہا ہماری جمہوریت کس کام کی پنجاب کی اکثریت ہے، وہی کام کرتی رہے گی۔ پاکستان جمہوری طریقوں سے نہیں بلکہ ڈائیلاگ سے بات چیت کے ذریعے بنا۔ اسی لئے انگریز مورخین اسے فریڈم مومنٹ نہیں کہتے۔ بلکہ وہ اس کو ٹرانسفر آف پاور کہتے ہیں۔

دوسرے ہمارے ہاں کوئی آئین نہ بنا نہ سیاسی راہیں متعین ہوسکیں تو سب سے پہلے بیوروکریسی حکومت کرتی رہی۔ 1958ء میں آرمی آجاتی ہے پھر آرمی نے بیوروکریسی سے مل کر حکومت کی کیونکہ آرمی تجربہ کار نہ تھی۔ ایوبی دور میں فوج اور بیوروکریسی شیئر کرتی ہے نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں نکلا پھر بھٹو اور پھر ضیاء آگیا اور پھر 1999ء میں مشرف آگیا۔ اب بیوروکریسی پیچھے چلی گئی، فوج آگے آگئی۔ حقیقت میں ضیاء کے بعد ہر چیز پر فوج کا غلبہ ہے اگر کچھ وقت کے لئے سول لیڈر آئے بھی تو پیچھے اقتدار فوج ہی کے پاس رہا اور اب تو سیاست بھی ظاہر ہے فوج ہی کرتی ہے اور آئندہ جو الیکشن ہونے والے ہیں ان کے اندر بھی فوج کا پورا عمل دخل ہوگا۔

گجرات ٹائمز: کیا کسی مسلم معاشرے میں جمہوریت پنپ سکتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں پنپ سکتی کیونکہ مغربی معاشرے کے اندر مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ریاست غیر جانبدار ہوتی ہے معاشرے میں لوگوں کے مختلف مذاہب ہوتے ہیں۔ جو چاہے جس پر عمل کرے لیکن اگر آپ کہیں ریاست کو، مذہب کو، اور سیاست کو ملا دیں گے تو ایسی ریاست میں جمہوریت نہیں آ سکتی۔ اسلامی معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ریاست کا مذہب بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ریاست کا مذہب رہے گا تو جمہوریت نہیں آ سکے گی۔

گجرات ٹائمز: اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمان معاشروں کا مقدر کیا ہے کیونکہ وہ اسلامی نظام حیات قائم کرنے میں پہلے ہی ناکام ہو چکے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: کوئی بھی نظریہ ہو یا عقیدہ ایک خاص زمان و مکان میں آتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے یا تو آپ بدلتے رہیں اسے تبدیل کرتے رہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں کریں گے تو وہ جامد ہو جائے گا اور وقت کا ساتھ نہیں دے سکے گا یہی اسلامی ملکوں کا حال ہے کہ وہ ابھی تک ماضی کے اندر رہ رہے ہیں، ماضی سے نکل نہیں سکے۔ جب تک ماضی سے نکل کے موجودہ زمانے میں نہیں آئیں گے اور زمانے کی جو قدریں ہیں، حالات ہیں جو تقاضے ہیں ان کو اگر وہ اختیار نہیں کریں گے تو اس پسماندگی کا شکار رہیں گے۔

گجرات ٹائمز: انسانی تاریخ میں مذہب کا کردار کیا رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مذہب کا کردار ایک زمانے تک تھا۔ ابتداء میں انسان کے لئے دنیا ایک unknown world تھی انسان ہر اَن دیکھی چیز سے ڈرتا تھا لیکن جیسے جیسے نامعلوم دنیا معلوم دنیا میں بدل رہی ہے اسی طریقے سے انسان اس دنیا پر غالب آتا چلا جا رہا ہے اسی لئے مذہب کا اثر بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جب دنیا معلوم دنیا میں بدل جائے گی آپ کا تسلط ہو گا تو پھر کسی انجانی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، حقیقت کھل جائے گی۔

گجرات ٹائمز: مذہب نے انسانی تاریخ کو کس حد تک متاثر کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں! مذہب کا کردار، اس کا تعلق ہوتا ہے سماجی مسائل سے وہ حل ہو جائیں تو پھر انسان کو بھی مذہب کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب تک سماجی مسائل حل نہیں ہوتے تو ایک خلاء ہوتا ہے غالب کہتا ہے کہ

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے تمام

اسی طرح مارکس کا بہت اچھا جملہ ہے جو اس نے مذہب کے بارے میں کہا جس کی کوئی دنیا نہیں ہوتی ان کو ایک دنیا دیتی ہے یہ دکھی لوگوں کے لئے سہارا ہوتی ہے۔ مارکس مذہب کو افیون کی طرح قرار دیتا ہے

جس طرح افیون سے آپ کو سکون ملتا ہے اسی طرح اس سے بھی سکون مل جاتا ہے۔ مذہب کے بارے لوگوں کا کہنا بہت حد تک صحیح ہے بے شک مذہب کا بہت حد تک تعلق ہمارے سماجی مسائل سے ہے۔

گجرات ٹائمز: تاریخ میں قوموں کے عروج وزوال کے بڑے بڑے اصول کیا ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: قوموں کے عروج وزوال کے بہت سارے شعبے ہیں۔ یہ بھی سوال ہے کہ ہم کس کو عروج کہتے ہیں اور کس کو زوال۔ آج بھی قبائلی نظام ہے وہاں عروج وزوال نہیں ہوتا یہ بھی ایمپائرز سے تعلق رکھتا ہے، تہذیبوں سے تعلق رکھتا ہے تو تہذیبوں یا ایمپائرز کے عروج وزوال کے اندر سیاسی، سماجی، معاشی وجوہات بہت زیادہ اہم ہوتی ہیں بہت سے لوگوں نے اس پر کام کیا ابن خلدون نے لکھا، شپنگلر نے پھر ٹائن بی نے لکھا ہے اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں کہ ایمپائرز کیوں ٹوٹتی ہیں مثلاً ایمپائر جب بہت زیادہ پھیل جاتی ہے پھیلاؤ بھی ایک وجہ ہوتی ہے یہ تو بہت بڑا موضوع ہے۔

گجرات ٹائمز: چیدہ چیدہ وجوہات کیا ہوتی ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: مغل ایمپائر کے زوال کو ہی دیکھیں تو یہ ایک ایمپائر کا زوال تھا ہندوستان کا زوال نہیں تھا۔ یہ ایک خاندان کا زوال تھا معاشرے کا زوال نہیں تھا یعنی ہندوستان کے کسانوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ان کی تو وہی حالت تھی۔ بعد میں جو پہلے عروج کے زمانے میں تھی عروج وزوال تو حکمران طبقوں کا ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس کا عروج وزوال، یہ عام آدمی کا نہیں ہوتا۔ برٹش ایمپائر جب عروج پر تھی جب اس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس زمانے میں لندن کا جو حال لکھا ہے غربت انتہا پر تھی، یتیم خانے ہوا کرتے تھے، شہر میں صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، اتنی گندگی اور اتنی بدبو ہوتی تھی کہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا تھا تو وہ پارلیمنٹ کی کھڑکیاں بند کر دیتے تھے یعنی یہ ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ ہے تو یہ برطانوی عوام کے لئے تو عروج نہیں تھا ناں۔ ہم قوم کو نام لیتے ہیں یہ قوم کا عروج وزوال نہیں ہوتا ایک خاص گروہ کا عروج وزوال نہیں ہوتا۔ بادشاہتوں کے زمانے میں قوم تو ہمیشہ زوال کے عالم میں ہی رہی ہے اس کو کبھی عروج ملا ہی نہیں ہے اس لئے عروج زوال کو حکمرانوں کے پس منظر کے اندر دیکھنا چاہئے۔

گجرات ٹائمز: سیکولرازم ایک تحریک تھی یا ایک فلاسفی؟

ڈاکٹر مبارک علی: سیکولرازم کوئی تحریک نہیں تھی۔ نشاۃ ثانیہ نے یورپ کو ذہنی طور پر چرچ کے تسلط سے نکال کر یہ کہا کہ اس دنیا کو بنانے والی کوئی الوہی قوت نہیں ہے خود انسان ہے اور اسی کو وہ humanism کا نام دیتے ہیں یعنی انسان اس دنیا کو بناتا ہے ان کے ہاں ریفارمیشن آئی اس نے ایک لحاظ سے نیشنلزم کو پیدا کیا یہ جو ہم کہتے ہیں مذہب اور سیاست کو الگ الگ کرنا یہ انقلاب فرانس کے بعد ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سٹیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یورپ نے تاریخ سے یہ سیکھا کہ جو مذہبی ہوں وہ آزاد سوسائٹی میں رہیں ریاست کو غیر جانبدار ہونا چاہئے وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی۔ یورپ میں secularization کی جو تحریک چلی اس میں تعلیم کا بھی حصہ ہے اس میں پروفیشنل ازم بھی ہے مثلاً چارٹرڈ

اکاؤنٹنٹ ہیں، ڈاکٹرز ہیں یا انجینئرز ہیں یہ لوگ اپنے پروفیشن کو دیکھتے ہیں مذہب کو نہیں دیکھتے کہ مذہب کیا کہہ رہا ہے مثلاً وہ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان کی زندگی بچانے کے لئے organ کو ٹرانسپلانٹ کرنا چاہئے تو وہ کر دیتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ مذہبی طور پر یہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ مذہب سے ہر معاملے میں مشورہ نہیں ملتا کیونکہ زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ اب گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے، تیزی سے دنیا آگے بڑھ رہی ہے، مذہب اتنی تیزی کے ساتھ جواب نہیں دے سکتا۔ مذہب تو بہت پیچھے رہ گیا ہے دنیا تو بہت آگے بڑھ گئی ہے۔

گجرات ٹائمز: پوپ کا حالیہ بیان کیا پورے عیسائی معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے یا انفرادی رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: خیر۔ پوپ نے conversion کی بات کی وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ زبردستی تبدیلی مذہب نہیں ہوئی۔ جہاں تک جہاد کی یا Holy War کی بات ہے تو اس کو کچھ لوگوں نے مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر آدمی جہادی ہے، محمد بن قاسم، محمود غزنوی سب تو پوپ سمیت دوسرے جو بات کرتے ہیں تو ہمارے حوالے سے ہی کرتے ہیں ناں۔ ہمارے ہاں سارے فاتحین جو ہیں وہ مجاہد ہیں تو پوپ نے جو بات کہی ہے کہ وہ ہم سے ہی لے کر کہی ہے ہمیں خود بھی غور کرنا چاہئے کہ ہر ایک کو جہادی بنانا یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

گجرات ٹائمز: تہذیبوں کے تصادم کی تھیوری مصنوعی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں ایک حد تک کہا جا سکتا ہے کیونکہ تہذیبوں کا تصادم نہیں ہوتا ہے بلکہ تہذیبیں ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں جیسے کہا جاتا ہے تصادم fundamentalist کا ہوتا، تصادم ignorance کا ہوتا ہے تہذیبیں تو ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میسوپوٹیمیا سے مصر نے سیکھا ہے۔ مصریوں سے ایران نے سیکھا ہے ایران سے عربوں نے سیکھا ہے، عربوں سے یورپ والوں نے سیکھا ہے، یہ سیکھنے کا پرانا سلسلہ ہے تہذیبوں میں اشتراک زیادہ ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا خیال تو ابھی تک چل رہا ہے دیکھا جائے تو یہ سیاسی جنگیں ہیں، مفادات کی جنگیں ہیں یہ کوئی تہذیبوں کی جنگیں نہیں ہیں ان کو پیش ایسے کیا جا رہا ہے جیسے یہ تہذیبوں کی جنگیں ہیں۔

گجرات ٹائمز: آپ نہیں سمجھتے کہ Unipolar ورلڈ نے end of history کو زندہ رکھا ہوا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: وہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ تصادم تو رہتا ہی ہے ناں۔ آپ دیکھئے ناں unipolar ورلڈ ہے لیکن امریکہ کے تسلط کو بھی تو نہیں مانتے صرف مسلمان ہی بلکہ اب تو لاطینی امریکہ کے ممالک سے بھی ان کے خلاف آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں۔ تصادم تو جاری رہتا ہے کیونکہ اگر تصادم نہ ہو تو ہسٹری ختم ہو جائے۔ ہسٹری تو ختم نہیں ہوتی ہے، تاریخ جاری رہتی ہے اور تصادم بھی جاری رہتا ہے ٹھیک ہے۔ امریکہ واحد سپر پاور ہے مگر اس کو نہ ماننے والی، چیلنج کرنے والی طاقتیں ابھر رہی ہیں۔

گجرات ٹائمز: انسانی تاریخ میں انسان آئیڈیلزم کے ذریعے پرسکون منزل کی تلاش میں نظر آتا ہے

جبکہ تاریخ تصادم کا نام ہے تو کیا انسان تاریخ کے راستے پر سکون منزل پر پہنچ جائے گا؟

ڈاکٹر مبارک علی: آپ یہ دیکھیں کہ مذاہب میں تو آرام دہ جگہ جنت ہے جہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ کارل مارکس نے اسے classless سوسائٹی کا نام دے دیا ہے کہ جہاں سب تصادم ختم ہو جائیں گے۔ انسان بالکل آزاد ہوگا فلسفہ پڑھے گا، میوزک سنے گا، تفریح کرے گا۔ یہ اس کا تصور ہے۔ میرے خیال میں تو تصادم جاری رہے گا یہ جو تصور ہے غیر طبقاتی دنیا کا، یا مسائل فری دنیا کا تو یہ تو محض ایک خواب ہی ہے۔

گجرات ٹائمز: رسالت مآبؐ کا طرزِ سیاست و بندوبست حاکمیت، خلافت راشدہ سے مختلف تھا خلافت راشدہ اس معیار کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی تو کیا آج کے عہد میں معیاری اسلامی حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی: دیکھیں! جیسے میں نے پہلے کہا ناں کہ وقت بدلتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات بدلتی ہیں، رسمیں بدل جاتی ہیں، ذہن بدل جاتے ہیں تو ہمیں آج کے زمانے کے تحت اب سوچنا چاہئے۔ ماضی سے سیکھنا ضرور چاہئے لیکن ماضی کا بوجھ اٹھائے ہوئے نہیں چلنا چاہئے، مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچنا چاہئے۔ ساٹھ سالوں میں تو پاکستان کی نئی نسل کا ذہن بدل گیا ہے پرانی نسل جس نے تقسیم کا عمل دیکھا تھا جنہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کا تصادم دیکھا تھا جنہوں نے فرقہ وارانہ فسادات دیکھے تھے۔ اب کی نسل کو یہ پتہ نہیں اس لئے اب نئی نسل ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ہمیں بھی ماضی کے بوجھ کو اٹھانے کی بجائے آگے کی طرف دیکھنا چاہئے۔

گجرات ٹائمز: آپ متفق ہیں کہ خلافت راشدہ کا نظام رسول اللہؐ کے معیار کو برقرار نہ رکھ سکا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں! وہ اپنے زمانے کا نظام تھا۔ خواہ اسے اپنے زمانے کا ایک آئیڈیل نظام بھی کہہ لیں لیکن آج کے زمانے کے اندر تو آپ اس کو واپس نہیں لاسکتے اس کا دوبارہ احیاء نہیں ہے۔

گجرات ٹائمز: کیا وہ آئیڈیل نظام تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ وہ آئیڈیل تھا بھی یا نہیں۔ تاہم اس نے اپنے وقت کی ضروریات کو پورا کیا لیکن آج کی ضروریات کچھ اور ہیں۔

گجرات ٹائمز: اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ میں آج کے مسلمان کے لئے سبق کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایک سبق تو یہ ہے کہ ہمیں فوجی طاقت، قوت، فتوحات وغیرہ صرف انہی کو اپنے ذہن میں نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ اس پورے عرصے کے اندر ذہنی طور پر ہم نے کیا ترقی کی ہے۔ کیا ترقی کی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ فوجی طاقت تو وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن جو ذہنی فکر ہے، افکار ہیں، خیالات ہیں وہ ایسی چیز ہے جو ہمیں آگے کی طرف راستہ دکھاتی ہے۔ ہمیں اس لحاظ سے تدبر کرنا چاہئے کہ ایمپائرز تو ختم ہوگئی ہیں فتوحات ختم ہوگئیں لیکن ہم نے جو ذہنی ورثہ چھوڑا ہے کیا اسے ہم اور آگے لے کر بڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے ذہنی ورثہ چھوڑا ہی نہیں اور اگر نہیں چھوڑا تو کیوں نہیں

چھوڑا۔اس پر غور کرنا چاہئے کیونکہ علم ہی طاقت ہے۔

گجرات ٹائمنز: سماج کی ترقی یا حرکت کے پیچھے قوت محرکہ انسانی صلاحیت ہے یا معروضی حالات؟

ڈاکٹر مبارک علی: انسانی صلاحیت ہے، انسان ہی حالات کو بناتا ہے اور تبدیل بھی کرتا ہے انسان کی اپنی خواہشات وعزائم ہیں جو حالات کو بدلتے ہیں۔

گجرات ٹائمنز: لیکن مذہبی تاریخ میں تو انسان کی مذہبی تعلیمات وخواہشات غالب نظر آتی ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: مذہب بھی تو انسان ہی بناتا ہے ناں، اگر وہ اس سے inspiration حاصل کرتا ہے تو وہ بھی تو اس کا اپنا بنایا ہوا ہے ناں۔ انسان ہی کی عقل، اسی کی فکر، اسی کی حرکت وہی سماج کو اور دنیا کو آگے لے جاتی ہے۔ حالات کو انسان ہی بناتا ہے حالات خود سے کچھ نہیں ہوتے۔

گجرات ٹائمنز: تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ سائنس تو کچھ عرصے بعد اپنے ہی نظریات کو رَد کر دیتی ہے جبکہ مذہبی تصور شروع سے ایک ہی ہے تو کونسا سچا؟

ڈاکٹر مبارک علی: سچ کا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ سچ بھی ایک نہیں ہے، سائنس کے اندر تو بلاشبہ سچ بدلتے رہتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی absolute truth بھی ہے یا نہیں۔ مذہب کے اندر یہ ہے کہ ان کے اندر ایک سچائی ہوتی ہے اور عقیدے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کہہ دیا جائے آپ اس کو مان لیں یہ تو اب انسان پر ہے کہ ایک کو سچا مانے یا دوسرے کو۔

گجرات ٹائمنز: واپس مقامی حالات پر آتے ہیں کیا مغربی لبرل ازم ہمارے پس منظر میں ممکن العمل پروگرام ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: لبرل ازم ہو یا کوئی اور یہ اچانک کسی بھی سماج میں نہیں آتے ہیں۔ معاشرے کو اس کے لئے پہلے سے ایک عمل سے گزرنا پڑتا ہے تیاری کرنا پڑتی ہے ہم اپنے معاشرے میں جب کسی کو لبرل کہتے کہ وہ تو بہت لبرل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے وہ اپنے معاشرے کی روایات وقدروں کو ختم کر کے وہ بہت الگ ہو گیا ہے یعنی اسے برے معنوں کے اندر استعمال کیا جاتا ہے، ماڈرن ہونا بھی ہمارے ہاں برے معنوں میں آتا ہے۔ ویسے بھی لبرل ہونے یا جدید ہونے کا عمل وقت کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، جب تک معاشرے کی ضروریات ایسی نہ ہوں تب تک معاشرہ لبرل یا ماڈرن بھی نہیں ہو سکتا، سماج نہیں بدلے گا۔ معاشی خوشحالی آنی چاہئے یہاں پر مستحکم سیاسی نظام ہونا چاہئے۔ ذہنی وفکری تبدیلیاں آنی چاہئیں جب تک یہ پورا عمل نہیں ہو گا تب تک ہم معاشرے کو لبرل یا ماڈرن نہیں بنا سکیں گے۔ اس کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے ویسے بھی روایات کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں روایات کو توڑنا کافی مشکل کام ہے۔

گجرات ٹائمنز: ہمارے ہاں لبرل ازم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہمارے ہاں کنزرویٹو یا روایت پسند بہت طاقتور ہیں چنانچہ انہوں نے لبرل ازم کو

بہت ہی منفی انداز میں پیش کر رکھا ہے۔ اس لئے یہاں تو ایک لحاظ سے لبرل جو ہیں وہ اپنا دفاع کرتے ہیں ابھی تک وہ حملہ نہیں کرتے ہیں یا سوسائٹی کو بدلنے کا خواب نہیں دیکھتے ہیں ابھی بھی یہاں کنزرویٹو طاقت میں ہیں اس کا مطلب ہی یہ ہوتا conserve کرنا یا محفوظ کرنا۔ یہ بہت طاقتور ہیں لہٰذا لبرل ابھی تک اپنا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

گجرات ٹائمز: یہاں کا مذہبی آدمی تو بڑا بنیاد پرست ہے لیکن کیا یہاں کا لبرل آدمی حقیقی معنوں میں لبرل ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: انفرادی طور پر کچھ لبرل ہوں گے مگر اجتماعی سطح پر یہاں ہو نہیں سکتے کیونکہ سوسائٹی ملی جلی ہے۔ یہاں تو ایک فیملی کے اندر بھی اتنے تضادات ہوتے ہیں کہ بڑا مشکل ہوتا ہے پورا پورا لبرل ہونا اسی لئے ابھی تک ہمارا لبرل ازم اس پوزیشن پر نہیں ہے۔

گجرات ٹائمز: برصغیر پاک و ہند میں کوئی عوامی انقلاب نظر نہیں آتا سماجی و معاشی ڈھانچہ ہی ایسا ہے یا کچھ اور؟

ڈاکٹر مبارک علی: چونکہ ہندوستان میں ذات پات کا نظام بہت سخت تھا اس کی وجہ تو یہی تھی کہ آپ جس ذات میں پیدا ہوئے اسی پر قناعت کرتے زندگی گزاریں تب اگلا جنم اچھا ہوگا، اچھی ذات میں پیدا ہوں گے اس لئے جو جس ذات میں پیدا ہوتا کوشش کرتا ہے اس کے اصولوں پر عمل کرے، وہ بغاوت نہیں کرتا تھا۔ اسی سے پیشہ وارانہ ذاتیں ہو گئی تھیں۔ اس مذہب و معاشرت نے سوسائٹی کو اتنی اکائیوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ سماج کو بدلنے کا شعور اجتماعی سطح پر جنم ہی نہ لے پاتا۔ اسی لئے یہاں کی تاریخ میں کوئی بغاوت نظر نہیں آتی کسی نے ذات پات کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ اٹھائی بھی تو بہت بعد میں امبید کر وغیرہ نے مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے کیونکہ ہندو دھرم کے اندر ذات پات کو آپ ختم کر نہیں سکتے کہ یہ دھرم کا حصہ ہے اس کو ختم کریں گے تو دھرمی ہندو نہیں رہیں گے اسی لئے امبید کر نے معہ اپنے ساتھیوں کے آخر میں مذہب کو اختیار کر لیا تھا۔ یہی حال یہاں پر کسانوں کا تھا کہ جاگیردار و زمیندار مقدم تھے اس طرح کی hierarchy بنی ہوئی تھی کہ اجتماعی طور پر کوئی بغاوت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں کا فیوڈل سسٹم ویسا نہیں تھا جیسا یورپ کا تھا وہاں تو فیوڈل کی اپنی زمین ہوتی تھی، اپنی فوج ہوتی تھی تو چار فیوڈل بھی مل کر بادشاہ کے خلاف بغاوت کرتے تھے تو بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ یہاں پر جاگیریں بدلتی رہتی تھیں ہر دو تین سال کے بعد بدل دیا کرتے تھے چنانچہ یہاں پر فیوڈل بھی بہت طاقتور نہ تھے اس لئے یہاں پر نہ فیوڈلز کی بغاوت ہوئی نہ کسانوں اور نہ نچلی ذات کی، معمولی قسم کی مزاحمتیں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن ایک جو بڑی تبدیلی کے لئے بغاوت ہو وہ نظر نہیں آتی۔

گجرات ٹائمز: کیا اب سماج میں ذہنی ترقی سے کسی عوامی انقلاب کی توقع ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اب تو انقلاب کا تصور بھی بدل گیا ہے، پہلے مسلح عوامی انقلاب کا تصور تھا جو اب نہیں

رہا لیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ جمہوری طریقے سے انقلاب میں آنا چاہئے مثلاً لاطینی امریکہ کے اندر جتنے بھی لوگ آئے ہیں یہ جمہوری طریقے سے آئے ہیں اب تو یہ ہے کہ پہلے نیچے سے لوگوں کو ساتھ ملایئے اور پھر سوسائٹی کو بدلیئے، پہلے یہ تھا کہ انقلاب لاکر ریاست پر قبضہ کیجئے، سوسائٹی کو تبدیل کیجئے۔ روس میں ہوا، چین میں ہوا، کیوبا میں ہوا۔ اب یہ ہے کہ پہلے سوسائٹی کو اپنے ساتھ لے کر آیئے پھر ریاست پر قبضہ کیجئے۔ آجکل زمانے میں بڑا فرق آ گیا ہے۔

گجرات ٹائمز: ہمارے ملک میں بلوچستان کے پس منظر میں دیکھیں تو ایک بار پھر نیشنلسٹ تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں، کیا خطرات ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: نیشنلزم ہمیشہ خطرناک چیز ہوتی ہے کیونکہ اسے ہمیشہ طاقتور لوگ استعمال کرتے ہیں ہمارے ہاں سندھ میں یا بلوچستان میں جو نیشنلزم ہے اس سے وڈیروں کو فائدہ ہوا ہے نیشنلزم کے اندر طبقاتی فرق ختم ہو جاتا ہے۔ بلوچستان میں اگر بگٹی کا قتل ہوا ایک غلط چیز ہے، اس کی ہم مذمت کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بگٹی کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کرنا بھی درست نہیں، اس سے آپ بلوچی نیشنلزم کو مضبوط کر رہے ہیں جس کا فائدہ وہاں کے سردار اٹھائیں گے عام بلوچی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا نیشنلزم چاہے صوبائی ہو، علاقائی ہو، لسانی ہو، ریاست کا ہو ہر صورت میں اس کا فائدہ اوپر کے طبقے کو ہوتا ہے نیچے کے طبقے جذباتی طور پر شامل تو ہو جاتے ہیں لیکن انہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

گجرات ٹائمز: بلوچستان کے موجودہ حالات میں گوادر کا کیا کردار ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس حوالے سے بلوچوں کے کچھ خدشات ہیں کہ گوادر میں غیر بلوچی زیادہ آ جائیں گے، ان کا عددی تسلط ختم ہو جائے گا اور پھر development کے اپنے کچھ فوائد ہیں تو نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ گوادر کا منصوبہ مکمل ہونے پر لوگوں پر اثرات مرتب ہوں گے، روزگار ملے گا، معاشی حالات بہتر ہوں اس میں ریاست کو چاہئے کہ وہ بلوچیوں کو معاملات کو چلانے دیں یہ نہ ہو کہ مرکز چلائے، بات پھر پنجاب کی بالادستی کی ہوگی۔ ترقی کے عمل میں بلوچوں کی رائے کو شامل کرنا بہت ضروری ہے گوادر میں بلوچیوں کا پورا پورا حصہ ہونا چاہئے تاکہ ان کے خدشات دور ہو سکیں لیکن اگر ترقی کے منصوبوں سے بلوچوں کو نکال دیا اور مرکز نے اپنی مرضی سے جو چاہا وہ کیا تو اس سے محرومی کا احساس بڑھ جائے گا۔

گجرات ٹائمز: ہم تو وہاں گوادر کو کامیاب بنانے کے لئے فوجی چھاؤنیوں کا جال بچھا رہے ہیں؟ اس کے کیا اثرات ہوں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس کے اثرات غلط ہوں گے اپنے ہی ملک کو اگر آپ چھاؤنیوں کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہیں گے اس کے نتائج بہت خراب نکلیں گے۔

گجرات ٹائمز: بلوچستان ہو یا وزیرستان قوم پرستی کی تحریکیں اور پھر ہماری حکومت کا طاقت کا استعمال؟ کیا آپ اس میں 71ء والی صورتحال دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، صورتحال 1971ء والی نہیں ہے اس سے مختلف ہے لیکن نتائج دیکھیں تو وہی نکلتے ہوئے نظر آرہے ہیں ایک اور فرق یہ ہے کہ 71ء میں مشرقی پاکستان میں مسئلہ ہوا فوجی ایکشن ہوا تو مغربی پاکستان سے آواز نہیں اٹھی مگر اب بلوچستان کے مسئلے پر باقی صوبوں سے اور پنجاب سے بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ فوج جو کچھ کر رہی ہے غلط کر رہی ہے، تاہم اگر فوج نے من مانی کی تو بدنامی ہوگی اور ملک ٹوٹنے کے خطرات بھی بڑھ جائیں گے۔

گجرات ٹائمز: آپ سندھ میں بہت عرصہ رہے سارے ملک میں خاص کر سندھ میں ''پنجاب کے غلبے'' پر پنجابیوں کو گالی دی جاتی ہے، کیوں، آپ اس بارے میں کیا کہیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی: میں نے تو سندھ میں بھی لوگوں سے یہی کہا بلکہ میں سرائیکی بیلٹ میں گیا تو وہاں بھی یہی بات کی کہ دیکھیں پورے پنجاب کو مت گالی دیں بُرا بھلا کہنا ہے تو اس کی فوج کو کہیں اس کی بیوروکریسی کو کہیں اس کے صنعتکاروں کو کہیں کیونکہ پنجاب کا عام آدمی تو اسی طرح کا ہے جس طرح دوسرے صوبوں کا۔ دوسرا یہ کہ جب تک آپ پنجاب کے عام آدمی کو ساتھ لے کر نہیں چلیں گے اس وقت تک کوئی بھی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ جب ہر جگہ نیشنلزم ہوگیا پنجاب میں بھی ہوگیا تو پھر پنجاب کا عام آدمی جس کو کچھ نہیں ملے گا، وہ بھی اپنی فوج کا ساتھ دے گا تو کامیابی کے لئے آپ کو پنجاب کو توڑنا ہوگا یعنی اس طرح توڑنا کہ عام آدمی کے اپنے ساتھ ملانا یہاں کا کسان ہے مزدور ہے، کاریگر ہے انہیں تو فوج کی وجہ سے کچھ نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے میں ہر جگہ کہتا ہوں کہ پنجاب کو برا بھلا کہنے کی بجائے یہ کہیں کہ یہ پنجاب کے استحصالی ادارے ہیں۔ جو ہم سب سمیت پنجابیوں کا بھی استحصال کر رہے ہیں۔ تربت میں میں گیا میں نے یہی کہا تو وہاں کے لوگوں نے کہا کہ اچھا یہ کام بھی ہمارا ہی ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں یہ احساس پیدا کریں کہ ان کو ساتھ ملائیں تو میں نے کہا کہ کچھ چیزیں خود ہی کرنا پڑتی ہیں اور پھر پنجاب میں جو لیفٹ کی جو پارٹیاں ہیں ان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ تحریک چلائیں۔ ابھی ڈاکٹر حئی بلوچ یہاں آئے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ چلیں ہم ساری پارٹیاں یا لوگ ایک ایجنڈے پر کہ فوج سے چھٹکارا مل جائے یا دلایا جائے پر اکٹھی ہو جائیں وہ کہتے ہیں کہ پنجاب کا کوئی شخص ہمارے ساتھ آیا ہی نہیں دوسرے صوبوں سے لوگ ضرور آئے مگر پنجاب سے کوئی نہیں آیا۔

گجرات ٹائمز: یہاں دانشوروں کا خیال ہے کہ ملکی ترقی کے لئے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ضروری ہے، اگر ہاں تو ہمارے ہاں ایک تو روایتی جاگیردار ہیں، دوسرا جاگیردار طبقہ ہم نے 1947ء کے بعد جرنیلوں کو پنجاب کے باہر مربعے الاٹ کر کے پیدا کیا۔ کیا جاگیرداری نظام ختم کرنے کے ساتھ اس جرنیلی فیوڈل ازم کا خاتمہ بھی ضروری ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں اگر آپ جاگیرداری نظام ختم کریں گے تو بالکل یہ بھی ضبط کریں گے کیونکہ فوج بھی ایک فیوڈل انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے جب آپ جاگیرداری ختم کرتے ہیں تو پھر زمین کسی کی موروثی

جائیداد نہیں رہے گی۔ دوسرا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اب ایک میکنازم آ گیا ہے اور جاگیرداری اب سرمایہ داری نظام کا ایک حصہ ہوگیا ہے۔اس کے باوجود ابھی بھی زمیندار ہیں جاگیردار ہیں ان کا اثر ورسوخ اسی وجہ سے ہے اسی لئے وہ الیکشن جیتتے ہیں زمینداری و جاگیرداری کی جڑیں ہمارے ملک میں بہت گہری ہیں اور اب تو فوج بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے اس لئے اب یہ اور مضبوط ہوگیا ہے۔

گجرات ٹائمز: آپ جنرل مشرف کی In the line of fire کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں نے ابھی یہ کتاب پڑھی نہیں اس لئے اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا اور اس سے میری کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ ایوب خاں نے بھی کتاب لکھی تھی زبردستی لوگوں کو پڑھوائی گئی تھی، زبردستی ریویو کروائے گئے تھے، وہ سلسلہ پھر سے شروع ہے۔ایسی چیزیں وقتی ہوتی ہیں یہ کسی دانشور کی کتاب تو ہے نہیں کہ پڑھنے کی جلدی ہو۔ ایوب خاں کی کتاب بھی جلد ہی فٹ پاتھوں پر بکی تھی یہ بھی بکے گی تو شاید پھر میں اسے پڑھ لوں گا۔

گجرات ٹائمز: تاریخ کے استاد کی حیثیت سے آپ پاکستان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: کافی مشکل سوال ہے، موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے نتائج کا تعین کریں تو وہ تو ہمیں کوئی اچھا نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑے طویل عرصے تک یہ لاقانونیت، انتشار، بے چینی ہی رہے گی کیونکہ ہمارے وہ لوگ بھی تو اب نہیں رہے ناں جو انتظامات کو چلا سکیں، تعلیمی نظام بھی ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔شہروں کی حالت دیکھیں ذرا سی بارش سے کیا حالت ہو جاتی ہے جرائم ہم سے کنٹرول نہیں ہوتے ہیں۔ بات اب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہر چیز ہماری پہنچ سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ ہر کوئی انفرادی طور پر خاموشی کی زندگی گزارنے کو ہی غنیمت جان رہا ہے اور زوال شدہ معاشروں میں یہی سوچ ہوتی ہے۔

گجرات ٹائمز: لاقانونیت کے اس عالم میں ریاست کی عمر مزید کتنی ہوسکتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخی شعور کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ختم ہی ہو جاتی ہے۔اب تو یہاں ریاست کے اندر ریاستیں ہیں جب عدلیہ کچھ نہیں کر رہی، پولیس کچھ نہیں کرتی اب کسی کو اپنا کرائے کا مکان خالی کروانا ہو تو لوگ اپنے علاقے کے غنڈوں سے کہتے ہیں کہ پیسے لے کر میرا مکان خالی کروا دو یا قرضہ لینا ہے کسی سے تو وہ بدمعاش سے کہے گا میں نے قرض لینا ہے تم اتنے پیسے لے کر میرا قرضہ دلا دو۔ یہ تو ریاست کے اندر ریاستیں بن گئی ہیں۔ ریاست تو یہ اب رہی نہیں، کہاں ہے سٹیٹ، اب تو لوگ یا تو خود سے کام کرتے ہیں یا غیر قانونی مافیا جو بنے ہوئے ہیں ان کی مدد لیتے ہیں۔

گجرات ٹائمز: صرف 60 سالوں کی مختصر تاریخ میں ہی یہ ریاست تشخص کھو بیٹھی، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام ہی مصنوعی تھا اور یہ ریاست بنی ہی ٹوٹنے کے لئے تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: ظاہر ہے اس وقت ہماری کوئی تیاری نہ تھی کوئی اہل لوگ نہیں تھے تربیت یافتہ اہلکار

نہیں تھے جبکہ کانگرس نے تو پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ ہم نے ریاست کے لئے کوئی منصوبہ بندی کی نہیں تھی کبھی سوچا ہی نہیں کہ ریاست کو کیسے چلائیں گے، نظام کیسا ہوگا، دستور کیسے بنے گا، کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کا معاشی نظام کیا ہوگا جب بھی کسی غلط منصوبہ بندی سے کوئی سماج یا ریاست چلائی جاتی ہے یا چلتی ہے تو پھر اس کا یہی انجام ہوتا ہے جو اس وقت پاکستان کا ہو رہا ہے۔

گجرات ٹائمز: ایک خیال یہ بھی کہ پاکستان کا برقرار رہنا امریکی مفادات کے لئے بہت ضروری ہے لہٰذا شاید بہت عرصہ تک اس ریاست کو مصنوعی امریکی آکسیجن ملتی رہے، ٹوٹنا ابھی اس کا مقدر نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں بہت حد تک درست ہے، اسے اسی طرح قائم رکھا جا سکتا ہے کیونکہ علاقہ میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہے، لیکن یہ بھی ہے کہ اگر دوسرے ملکوں کی ضرورت پر آپ زندہ رہیں تو کوئی زندگی تو نہیں ہوتی۔ اگر آپ اپنے طور سے زندہ نہ رہ سکیں اور دوسرے آپ کی زندگی کو قابو میں رکھیں یہ زندگی تو۔۔۔۔۔

گجرات ٹائمز: کیا تاریخ سے کوئی ایسا نسخہ کیمیا ملتا ہے جو اسے برقرار رکھ سکے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے خیال میں ابھی تو کوئی سننے کے موڈ میں نہیں ہے تاہم ہے یہ کہ ایک سماج کو جمہوری تعلیم یافتہ اور سیکولر ہونا چاہئے مراعات یافتہ طبقات کی مراعات ختم کی جائیں راستے تو ہیں دوسرے ملکوں کے ماڈل بھی ہمارے سامنے ہیں جیسے سنگاپور کے پہلے وزیر پرملی نے کہا کہ میرے پاس دو راستے تھے ایک یہ کہ میں دولتمند ہو جاؤں یا پھر ملک کو بہتر بنا لوں میں نے دوسرا راستہ چنا۔ ہمارے سامنے جنوبی کوریا کا راستہ بھی ہے وہاں بھی مارشل لاء آیا وہاں کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر خود بہت ہی غریب خاندان سے آیا تھا۔ جہاں غریب ہونے کی وجہ سے اس کو پوری تعلیم بھی نہ ملتی تھی چنانچہ اس نے سب سے پہلے جاگیرداری ختم کی اور سو فیصد خواندگی کا فیصلہ کیا وہ آمر تھا مگر اس نے نیک نیتی سے کام کئے نتیجہ یہ کہ وہاں جمہوریت بھی آئی صنعت بھی آئی ہے آج جنوبی کوریا خوشحال ملک ہے۔ مگر ہر قوم میں ایسے لوگ نہیں ہوتے جو قربانیاں دیں۔

گجرات ٹائمز: جمہوری ملک تو وہ ہوتا ہے جو جمہوریت کی مرضی سے چلے، ہمارے ہاں جمہور کا کردار ہی کوئی نہیں کوئی آئے یا جائے وہ بس نعرہ لگاتے ہیں یہاں جمہور نے آمریت کے خلاف آواز کب اٹھائی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہاں، کیونکہ لوگ یہاں نہ ہماری مرضی سے آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ بس یہی ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ پہلے پاکستان کو فوج کی ضرورت تھی اب فوج کو پاکستان کی ضرورت ہے، اس لحاظ سے مراعات یافتہ طبقے کو پاکستان کی ضرورت ہے اس لئے وہ اسے رکھنا تو چاہیں گے۔

گجرات ٹائمز: کوئی پیغام؟

ڈاکٹر مبارک علی: پیغام دینا مشکل ہے کہ اتنے پیغام دیتے ہیں اس قوم کو مگر کوئی سنتا تو ہے نہیں، بس یہ کہ لوگ خود سوچیں، کتابیں پڑھیں، تفکر سے اپنا راستہ تلاش کریں کہ لوگوں کو خود ہی اب اپنا کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔ کسی کے کہنے سے قومیں نہیں بدلتی ہیں جب تک اقوام میں خود تبدیلی کی خواہش نہ ہو اس وقت تک قوم نہیں بدلتی یا سماج نہیں بدلتا۔

گجرات ٹائمز: بہت شکریہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب آپ کا!

(گجرات ٹائمز: اکتوبر 2006ء)



گزری زندگی پر ایک نظر

انٹرویو: محمد عامر خاکوانی

ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں، ''جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں اور اپنی شخصیت کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ میں ایک کمزوری کا زبردست احساس ہوتا ہے اور وہ ہے جذباتیت۔ میں نے جذبات میں آ کر ہمیشہ ایسے فیصلے کئے کہ جن کا مجھے نقصان ہو۔ اگر میں جذبات پر قابو پا لیتا اور ٹھنڈے دل سے حالات کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرتا تو شاید مجھے بہت سی مصیبتوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ مگر مجھ میں یہ جذباتیت کیوں ہے؟ پتہ نہیں اس کا تعلق میری شخصیت کے کون سے پہلو سے ہے۔ کہتے ہیں کہ پٹھانوں میں غصہ، جوش اور جذبات کی کوئی علیحدہ سے رَگ ہوتی ہے اور جب اسے غصہ آتا ہے، یا جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو وہ نتائج کو نہیں دیکھتا۔ میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ میری زندگی کامیاب رہی؟ اس بات کو میں پوری طرح سے سمجھتا ہوں کہ کامیابی کے معیار اور پیمانے ہر ایک کے لیے مختلف ہوتے ہیں لیکن کامیابی کے لیے ہمیشہ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ سوال میرے لئے اہم رہا ہے کہ کیا زندگی میں حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہئے یا ان سے لڑنا چاہئے؟

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ معاشرہ کی روایات، اقدار اور اداروں سے بغاوت کرتے ہیں، ان میں سچائی کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا نشہ اس قدر زور آور ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے، اس کو یہ فکر نہیں ہوتی ہے کہ اس کا کیا بنے گا۔ وہ صرف اپنے جذبہ کا اظہار چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک فنکار اپنے تخلیقی جذبہ کے نشہ میں غربت و افلاس، ذلت و خواری اور الزام تراشی، ہر چیز سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اسے نہ تو شہرت کی پروا ہوتی ہے اور تاریخ میں اپنے نام کو دیکھنے کی، نہ معاشرے کی پروا ہوتی ہے اور نہ لوگوں کے احساسات کی۔ یہ جذبہ اس کی شخصیت کو ابھارتا ہے اور اس میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس کے سہارے وہ تکلیف و اذیت کو برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ موت بھی اسے خوف زدہ نہیں کر سکتی ہے۔

اس لئے مجھے باغی لوگ پسند ہیں وہ لوگ کہ جو قدیم اور مستحکم روایات و اعتقادات اور رسوم و رواج سے بغاوت کرتے ہیں، وہ لوگ کہ جو ظالم بادشاہوں، مطلق العنان آمروں اور رعونت زدہ افراد سے بغاوت کرتے ہیں۔ ان شخصیتوں کی زندگی میں جو دلکشی، خوبصورتی اور دل آویزی ملتی ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں

آتی۔ یہ صحیح کہ ان میں سے اکثر ناکام ہوئے مگر انہوں نے جمود کو توڑا اور مستحکم عمارت پر ایک ضرب کاری لگائی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو تاریخ کے عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تاریخ میں دو قسم کے افراد رہے ہیں: ایک وہ جو کہ معاشرے کی شرائط پر زندگی گزارتے ہیں، دوسرے وہ جو کہ اپنی شرائط پر۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون سا صحیح ہے مگر میں نے خود اپنی شرائط پر زندگی گزاری اور کوشش یہی ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی کروں۔

پوری زندگی میں عدم تحفظ کا احساس مجھے ہمیشہ رہا ہے؟ جب ہم پاکستان آئے تو پتہ نہیں تھا کہ کیا ہوگا؟ جب میں برابر ملازمتوں سے نکالا جاتا رہا اور تلاش معاش میں سرگرداں رہا تو اس وقت بھی پتہ نہیں تھا کہ کل کیا ہو گا؟ جب میں لندن کی لڑکوں اور گلیوں میں پھرتا تھا تو اچانک میرے اندر خوف پیدا ہوتا تھا کہ میں بے یارومددگار ہوں۔ اگر پیسے ختم ہو گئے تو کیا ہوگا؟ یہی صورت جرمنی میں رہی۔ بے یقینی کی کیفیت اندر سے پیدا ہونے والا ڈر جس کی وجہ سے میں اچانک خود کو انتہائی کمزور سمجھنے لگتا تھا۔ پھر یہی کچھ واپس آ کر ہوا کہ جب سندھ یونیورسٹی سے معطل ہوا تو اچانک خود کو مجبور پایا۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ میں اس دور سے کیسے گزروں گا؟ گزر سکوں گا بھی کہ نہیں۔ لیکن جہاں میں خود کو تنہا پاتا اور مجھ پر اداسی و مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو ایسے میں چند دوست ہیں کہ جو ہمیشہ سہارا بن کر آتے ہیں۔ میں نے اس غیر یقینی کی کیفیت کو انہی دوستوں کے سہارے جھیلا ہے۔ یہی میرے رشتہ دار ہیں اور یہی میرے ساتھی اور یہی چند لوگ ہیں کہ جو جینے کا سہارا دیتے ہیں۔

لیکن کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ یہ دردر کی ٹھوکریں کھانا میرا ہی مقدر کیوں ہے؟ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا انسان حالات کے ریلے میں اپنی مرضی کے خلاف بہتا چلا جاتا ہے یا اسے اس پر قدرت ہے کہ وہ حالات کے اس سیلاب کو روک سکے؟ دردر کی ٹھوکریں کھانے والا ہمیشہ اس کا متلاشی ہوتا ہے کہ کسی جگہ تو وہ ٹھہر جائے۔ کچھ ستا لے، آرام کرلے اور شاید ہمیشہ کیلئے قیام کرلے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ میری آخری آرام گاہ کہاں ہوگی؟ یہ ضرور ہے کہ ابھی بھی مجھ میں تھکن کا احساس نہیں ہے۔ ان تمام زخموں کے باوجود جو میں نے لوگوں سے کھائے ہیں۔ میرے اندر بغاوت کرنے، زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہے۔

اکثر لوگ مجھ سے یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ میں باہر کیوں نہیں رہ گیا۔ واپس کیوں آیا؟ اس کا تعلق اس سوال سے ہے کہ انسان کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں اگر باہر رہتا تو یقیناً ایک اچھی زندگی تو گزار لیتا، مگر میں نے یہاں رہ کر جو کام کیا ہے وہ نہیں ہوتا۔ اس لئے آج اگر کوئی مجھ سے آ کر یہ کہتا ہے کہ اس نے میری تحریروں سے کچھ سیکھا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔

پاکستان میں زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا تعلق کسی نہ کسی گروہ یا لابی سے ہونا چاہئے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس لابی کے نظریات اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنا چاہئے ورنہ جو ان سے تعلق نہیں رکھتا اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ میں اس کا شکار اس لئے ہوں کہ میرا کسی لابی یا کسی جماعت سے کوئی تعلق

نہیں ہے۔ اس لئے اس ملک کے دانشوروں نے مجھے نظر انداز کر رکھا ہے۔ اس حد تک کہ اکثر تو میری کتابیں بھی نہیں پڑھتے کہ کہیں ان سے متاثر نہ ہو جائیں لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ نوجوان میری تحریریں شوق سے پڑھتے ہیں، خصوصیت سے سندھ، بلوچستان اور سرائیکی علاقے میں۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ میں نے اس نوجوان نسل کے ذہنوں کو تبدیل کرنے میں حصہ لیا ہے۔

سرکار و دربار میں میری تحریروں کی پذیرائی نہیں، اس پر مجھے خوشی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے ایک بار اس طرح سے ہوا کہ جب گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت ختم ہو رہی تو میں نے سوچا کہ چلو ہائیڈل برگ، جرمنی میں جو اقبال چیئر ہے اس کے لیے درخواست دے دی جائے۔ اگر وہاں کام ہو جائے تو تین چار سال آرام سے گزر جائیں گے اور وہاں رہ کر کچھ تحقیقی کام بھی ہو جائے گا۔ میں نے درخواست دی، انٹرویو کے لیے بلاوا آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کام کیا ہے شاید اس کی قدر ہو اور چونکہ مجھے جرمن زبان آتی ہے اس لئے اس کا مجھے فائدہ ہوگا۔ جب میں اسلام آباد میں انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مضمون ایکسپرٹ کی حیثیت سے وہاں احمد فراز اور افتخار عارف بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا واقعہ یاد آیا کہ جب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کے لیے درخواست دی تو انہیں کہا گیا کہ وہ انٹرویو دیں۔ اس پر انہوں نے کہا، "میرا انٹرویو کون لے گا؟" اگر ہماری بیوروکریسی میں پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو انٹرویو کے بجائے صاحب علم لوگوں کو ایسے عہدوں کے لئے پیش کش کرتے۔

ہائڈل برگ کی یہ چیئر خالص علمی مضامین کے لیے ہے۔ اس میں پاکستان کی تاریخ و سیاست و تحقیق و تدریس شامل ہے۔ اس کا علم انٹرویو لینے والوں کو بالکل نہ تھا۔ ان دو کے علاوہ ایک صاحب فارن سروس کے تھے اور ایک شعبہ تعلیم کے۔ انٹرویو میں مجھ سے جو سوالات پوچھے گئے وہ یہ تھے: "آپ جرمنی جا کر پاکستان کے کلچر کے فروغ کے لیے کیا کریں گے؟"

میں نے کہا، "مگر یہ عہدہ کلچر کے فروغ کے لیے نہیں تحقیق و تدریس کے لیے ہے۔"

"مگر پھر بھی آپ کو کلچر کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔"

میں نے جواب میں کہا کہ اس کے لیے آپ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی طرز پر وہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ کھولئے۔

انٹرویو کا نتیجہ پہلے سے تیار کیا جا چکا تھا تین امیدوار جو اس میں منتخب ہوئے ہیں ان تینوں میں میرا نام نہیں تھا۔

پاکستان معاشرے میں روشن خیالی لوگوں کی جو منافقت ہے، اس کا تجربہ بار بار ہوا۔ خاص طور پر ان کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب روس میں تبدیلی آئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ کہ جو سکہ بند سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے، انہوں نے راتوں رات اپنے نظریات بدل لئے اور کھلے عام یہ کہنے لگے کہ انہوں نے غلطی کی تھی اور اب مارکس و لینن کے خیالات کی انہیں کوئی ضرورت نہیں۔

ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں کہ جو روس کے عروج کے زمانہ میں اس کے سب سے بڑے حامی تھے اور جو سوشلسٹ ملکوں کے تفریحی دوروں کے بعد ان کے قصیدے پڑھتے تھے۔اب جب وہاں سے روزی کے دروازے بند ہوئے ہیں تو یہ لوگ کسی دوسرے سرپرست کی تلاش میں ہیں۔ان میں سے اکثر گناہوں سے توبہ کر کے پکے و سچے مسلمان ہو گئے ہیں اور کچھ اب سرمایہ داری اور آزاد منڈی کی تعریف و توصیف میں مصروف ہیں۔ پتہ نہیں، مگر ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ روایت رہی ہے کہ جب زندگی کے آخری دن قریب آتے ہیں تو ترقی پسند حضرات مذہب میں پناہ لے لیتے ہیں۔اس قسم کی مثالیں ہمارے ہاں بے شمار ہیں۔ان کی اس منافقت اور دوغلی پالیسی کی وجہ سے یہ لوگ معاشرے میں اپنی جڑیں نہیں جما سکے۔

یہ غالباً 1996ء کی ایک شام تھی جب ڈاکٹر مبارک علی سے میرا پہلا علمی تعارف ہوا۔میں ان دنوں نیا نیا لاہور آیا تھا اور اردو ڈائجسٹ سے بطور سب ایڈیٹر منسلک تھا جبکہ رہائش ایک سٹوڈنٹ ہاسٹل میں تھی۔یہیں پر ڈاکٹر مبارک علی کے مضامین پر مشتمل ایک کتابچہ ''تاریخ اور شعور'' پڑھنے کو ملا۔ڈاکٹر مبارک علی کا اندازِ تحریر اور طرزِ استدلال نہ صرف بڑا مختلف اور جاندار تھا بلکہ اس سے سوچ کے نئے زاویے جنم لیتے تھے، تاہم سٹوڈنٹ ہاسٹلز میں انہیں خاصی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ایک دینی طلبہ تنظیم تو اسی وجہ سے ان کے خلاف تھی کہ وہ مذہب سے ہٹ کر تاریخ کے تجزیہ پر زور دیتے تھے جبکہ دوسرے بہت سے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے بارے میں ان کے ریمارکس سے آزردہ تھے۔لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی انہیں کچھ زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات کا تو موقعہ نہ مل سکا، مگر ان کی تحریریں اور کتابیں نظر سے گزرتی رہیں، جن سے جہاں ڈاکٹر صاحب کی علمی عظمت راسخ ہوتی رہی، وہاں ان کے بعض کاٹ دار کالموں سے یہ تاثر بھی ملا کہ وہ ایک سخت اور جارحانہ نقطہ نظر کے حامل انسان ہیں، جو اپنے زاویہ فکر سے اختلاف کرنے والوں پر قلم کی شمشیر براں لیے حملہ آور ہو جاتا ہے۔دو سال پہلے ایک معروف سابق بیوروکریٹ جنہیں تاریخ پاکستان پر کتابوں کی تالیف سے خاصی شہرت ملی، ان سے ڈاکٹر مبارک علی کا علمی مجادلہ بھی خاصا مشہور ہوا۔ان دونوں میں قائداعظم کی شخصیت اور پاکستان کی نظریاتی شناخت کے حوالے سے جواب در جواب مضامین کا طویل سلسلہ چلا جس میں بعدازاں قدرے تلخی بھی در آئی۔زندگی میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کے بارے میں مختلف وجوہات کی بناء پر اس سے ملے بغیر ہی ایک خاص تاثر قائم ہو جاتا ہے۔پھر جب ملاقات کا موقعہ ملے تو یہ تاثر یکسر ختم ہو جاتا ہے یا پھر پہلے سے بھی سوا۔جب 2006ء کے آخری ہفتے کی ایک یخ بستہ بھیگی شام میں ڈاکٹر مبارک علی کا انٹرویو کرنے عسکری اپارٹمنٹس میں واقع ان کے فلیٹ پہنچا تو یہ سب واقعات ذہن میں گھوم رہے تھے۔ کال بیل دبائی تو ڈاکٹر صاحب کے نوعمر صاحبزادے نے دروازہ کھولا اور سلیقے سے آراستہ ڈرائنگ روم میں

بٹھا دیا۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ سادہ سی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات ایک دل کش تجربہ ثابت ہوئی۔ ان سے مل کر شدت سے احساس ہوا کہ بسا اوقات کیسا خام تاثر بھی قائم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک نہایت متحمل اور خالص علمی مزاج کے حامل انسان ہیں۔ تحریر کی طرح ان کے خیالات میں بھی بڑی روانی اور تازگی ہے۔ وہ بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو بیان کرتے اور اس کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ ہمیں کم از کم خالص علمی موضوعات میں کسی تعصب کے بغیر دلائل دینے اور سننے کی عادت ڈالنی چاہیے کہ دلیل اور مکالمے ہی سے علم حاصل ہوتا اور جہالت پر تعمیر کردہ خیالی عمارتیں مسمار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی سے گفتگو کی تفصیل نذر قارئین ہے۔ چلئے ڈاکٹر مبارک علی سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

ایکسپریس: آپ تاریخ نویسی کی جانب کیسے آئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں نے سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے 1963ء میں ایم اے ہسٹری کیا۔ ہمارے ایک پروفیسر ڈاکٹر احمد بشیر تھے۔ وہ لبرل اور سیکولر نقطہ نظر کے مالک تھے۔ انہوں نے لندن یونیورسٹی سے اکبر کی مذہبی پالیسی پر پی ایچ ڈی کیا ہوا تھا۔ زندگی میں ان کا ایک ہی شوق تھا۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا۔ ان کی شخصیت نے مجھ پر خاصا اثر ڈالا۔ ان دنوں یہ پالیسی تھی کہ فرسٹ پوزیشن والے کو یونیورسٹی میں لیکچرار کی جاب دی جاتی تھی۔ میں بھی 63ء میں تاریخ کا لیکچرار بن گیا۔ 1963 سے لے کر 1970ء تک کا زمانہ میرے لئے اس لحاظ سے اہم رہا کہ اسی دوران میں نے نہ صرف تاریخ پڑھی بلکہ ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے ہی مجھ میں تاریخ کا شعور پیدا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' سردیوں میں پڑھی تھی۔ رات کی خاموشی اور چاندنی کی ٹھنڈی روشنی کے ماحول میں اسی ناول کو پڑھتے ہوئے میرے تخیلات مجھے کہیں کا کہیں لے جاتے تھے۔ دوستوفسکی کے ناول ''کرائم اینڈ پنش منٹ'' اور ''برادرز کرمازوف'' نے بھی ذہن پر گہرے اثرات ڈالے۔ ان ناولوں کے ذریعے مجھے انسان کے دکھ کا احساس ہوا۔ ان سب کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ مجھے تاریخ سے اصل دلچسپی اور اس کا شعور یورپ میں دورانِ تعلیم ہی ہوا۔ دراصل ایسی سوسائٹی جہاں نئے خیالات نہ ہوں وہاں سیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ جب ہر طرف بحث و مباحثے ہو رہے ہوں، نئے فکری اور علمی چیلنج سامنے آئیں تو ذہن کام کرتا ہے۔ ایسا ماحول یورپ کا تھا۔ خاص کر 1970ء کی دہائی میں یورپ لیفٹ کی تحریکوں اور سیاسی نظریات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں نے 1963ء سے 1970ء تک سکالرشپ پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے باہر جانے کی بڑی کوشش کی مگر سیاست کے باعث کامیابی نہ ہوئی۔ آخر 1970ء میں اپنے خرچ پر لندن چلا گیا۔ وہاں ڈیڑھ سال رہا پھر 1972ء میں پی ایچ ڈی کرنے جرمنی گیا جہاں چار سال رہا۔ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں بحث و مباحثے بہت تھے، فکری اعتبار سے نہایت متحرک زندگی تھی۔ میری ذہنی تبدیلی کی ابتداء وہاں سے ہوئی۔ دراصل جب ذہن میں شکوک پیدا ہوئے تو تحقیق

کرنے کا دل چاہتا ہے۔ 1976ء میں واپس پاکستان آنے کے بعد میں نے نئے سرے سے تاریخ کا جائزہ لیا اور پھر اس پر لکھنا شروع کیا۔

ایکسپریس: آپ کے خیال میں تاریخ کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور آج کا مورخ کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ بڑا اہم سوال ہے۔ مورخین کو دو تین مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جن کا کام کلاسیک قسم کا ہے۔ انہوں نے عالمی تاریخ کے پس منظر میں فلسفیانہ نہج کے ساتھ لکھا۔ ان میں ابن خلدون، شپنگلر اور ٹائن بی نمایاں ہیں۔ دوسرے وہ مورخ ہیں جنہوں نے روایتی انداز میں تاریخ لکھی جبکہ تیسری اور سب سے اہم کلاس ان مورخین کی ہے جنہوں نے تاریخ میں نئے زاویے روشناس کرائے اور جدید تاریخ کو عروج پر پہنچا دیا۔ اب سیاسی، سماجی، معاشی اور روزمرہ......ان سب موضوعات پر علیحدہ علیحدہ تاریخ آ چکی ہے۔ یورپ میں یہ کام بہت ہوا ہے۔ جرمن کے مورخ ران کے (Ronke) نے تاریخ نویسی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اسی طرح کلچرل ہسٹری (ثقافتی تاریخ) کے حوالے سے اہم کام ہوا ہے۔ فرانس میں مورخین کا نیا سکول آف تھاٹ سامنے آیا ہے جو ثقافتی تاریخ اور واقعات پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ مارک بلوخ اس کا بانی تھا۔

پہلے تاریخ صرف حکمرانوں کی سوانح کا نام ہی سمجھی جاتی تھی، اب تاریخ کے موضوع میں بہت وسعت آئی ہے۔ جدید مورخین نے نئے نئے زاویے تلاش کئے ہیں۔ مثلاً جذبات کی تاریخ، غصے کی تاریخ، نجی زندگی کی تاریخ، چرواہوں کی تاریخ، خانہ بدوشوں کی تاریخ' بازاروں کی تاریخ' شہروں کی تاریخ' حملوں کی تاریخ' ان سب پر علیحدہ علیحدہ لکھا جا رہا ہے۔ اس طرح پرانی تاریخ محض مردوں کی تاریخ تھی' اس میں سے عورتیں غائب تھیں۔ اب خواتین کہہ رہی ہیں کہ ان کا کردار سامنے آنا چاہیے۔ غلاموں کی تاریخ پہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ ایک بہت اہم موضوع تاجروں کی تاریخ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اب اس پر لکھا جا رہا ہے کہ کس طرح سے دنیا کا کلچر بنانے میں تاجروں نے کردار ادا کیا۔ یہ تاجر مقامی لوگوں سے ملتے تھے' مصنوعات لے کر جاتے تھے' ثقافتی تبادلے میں ان کا اہم حصہ تھا۔ ماضی کے تجارتی بری راستے مکمل طور پر دریافت ہو رہے ہیں۔ ان تاجروں کے سمندری راستوں پر بھی خاصا کام ہو رہا ہے۔ اب اگر تاریخ کو نہ پڑھا جائے تو یہ ظلم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں اس پر کام ہو رہا ہے نہ پڑھایا جا رہا ہے۔

ایکسپریس: ابھی ایک نے پاکستانی تاریخ کا ذکر کیا' ہمارے ہاں اس حوالے سے کیا کرنے کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: دراصل ہم نے آثار قدیمہ کی بنیاد پر تاریخ کی دریافت کا کام کیا ہی نہیں۔ ہمیں اپنے حال کو سمجھنے کے لئے پہلے ماضی کو سمجھنا چاہیے۔ تاریخی شعور آئے گا تو بحیثیت قوم شعور آ جائے گا۔ پاکستان

ایک نیا ملک ہے جس کی عمر 60 برس ہے جبکہ اس کے چاروں صوبے بہت قدیم اور ہزاروں سالہ تاریخ کے امین ہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ 1947ء سے شروع نہیں کرنی چاہیے۔ ان صوبوں کی علاقائی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے ورنہ پاکستان کی موجودہ مشکل سمجھ نہیں آئے گی۔ ہم نے علاقائی تاریخ پڑھائی نہ ریسرچ کی۔ آثار قدیمہ پر کام کرنے کے بعد سمجھ آئے گی کہ ان چاروں صوبوں میں کیا کیا مشترک ہے؟ بلوچستان میں مہر گڑھ کی دریافت سے یہ سامنے آ گیا کہ ہماری تاریخ 7000 سے 8000 سال قدیم ہے۔ موہن جودڑو پہلے ہی پانچ ہزار سال پرانی تہذیب مانی جا چکی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ یہاں صرف یورپی ماہرین آثار قدیمہ آتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی تھیوریز کو ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ایک بار میں تربت گیا تو دیکھا کہ فرانسیسی ماہرین تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ خلیج کی ریاستوں اور بلوچستان کے درمیان ثقافتی رشتے ڈھونڈ رہے تھے۔ اس تحقیق کا نتیجہ آج تک یہاں شایع نہیں ہو سکا۔ ہماری نصابی کتب میں ان قدیم علاقوں کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ سوات کے علاقہ میں بدھوں کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ اس طرح سندھی بدھسٹ تھے، مگر اس بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ تاریخ کا تجزیہ وہاں سے ہونا چاہیے جہاں سے آثار قدیمہ ملیں، خواہ وہ پتھر کا زمانہ ہو، کانسی کا یا لوہے کا۔ ہمیں تمام ارتقائی مرحلوں کو دیکھنا چاہیے۔

ایکسپریس: بھارت میں کیا صورتحال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بھارت میں بہت شاندار کام ہو رہا ہے۔ وہاں حکومتی سرپرستی بھی ہے اور انفرادی طور پر بھی بہت سے نوجوان مورخ سامنے آ رہے ہیں۔ وہاں پروفیسر عرفان حبیب، ہربنس مکھیا، شیریں اور مظفر عالم نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان پر بڑا وقیع کام کیا ہے۔ یہ لوگ ایک نیا سکول آف تھاٹ سامنے لائے ہیں یعنی "محکوم لوگوں کا نقطہ نظر"۔ یہ کالونیل دور کی تاریخ کو دوبارہ سے دریافت کر کے لکھ رہے ہیں۔ گیان پانڈے، شاہد امین، رومیلا تھاپر یہ سب میرے اچھے دوست بھی ہیں۔ ان کا کام نیا اور دلچسپ ہے۔ رومیلا تھاپر نے سومنات کے بارے میں ہندو مورخین کی قائم کردہ قدیم متھ توڑی ہے اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اس متھ کو انگریزوں نے ہندو مسلم تقسیم بڑھانے کے لیے تاریخ میں شامل کیا تھا۔

1992ء میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے اکبر کی 450 ویں سالگرہ منائی۔ اس میں مجھے بھی مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ میرے مقالہ کا عنوان تھا "اکبر پاکستان کی نصابی کتابوں میں" اس سیمینار میں ہندوستان سے تیس چالیس سکالرز شریک ہوئے جو صرف مغل تاریخ پر کام کر رہے تھے۔ اس طرح شانتی نکیتن میں 66 ویں ہسٹری کانفرنس ہوئی تھی جس میں 1400 بھارتی مورخین شامل تھے، وہاں کی ہر ریاست میں ہسٹری کے ادارے ہیں، یونیورسٹیوں میں بھی تحقیق ہو رہی ہے اور کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔

ایکسپریس: ڈاکٹر صاحب! ہندوستان پر حملہ آور ہونیوالے مسلمان فاتحین کے حوالے سے آپ کے

نقطہ نظر پر خاصی تنقید کی جاتی ہے، آپ اس سلسلہ میں کوئی وضاحت کریں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے خیال میں ہمیں بیرونی حملہ آوروں کی تاریخ طے کرنی چاہئے۔ اگر کوئی سالار یا بادشاہ مال ودولت لوٹنے کے لئے ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ ظاہر ہے اخلاقی طور پر غلط ہے، خواہ وہ سکندر ہو یا کوئی اور۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم لوگ سکندر کو سکندر اعظم کہتے ہیں۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی کا کہنا ہے کہ سکندر بڑا آدمی تھا۔ حالانکہ اس نے دولت کمانے اور محض نام کیلئے خواہ مخواہ ہندوستان پر حملہ کیا، شہر جلائے اور قتل عام کئے۔ وہ ایک سفاک شخص تھا، قتل وغارت کرنیوالے کسی شخص کو عظیم نہیں کہا جا سکتا۔ اسے تو میں بدقسمتی ہی کہوں گا کہ جہلم میں یونانی حکومت کے تعاون سے سکندر کی ایک یادگار بنائی گئی ہے۔ یہ نہایت شرمناک ہے کہ جس سکندر نے مقامی لوگوں پر بلا جواز حملہ کر کے قتل عام کیا، یہاں کی عورتوں کے ساتھ زیادتیاں کیں، ہم اس کی یادگار بنا رہے ہیں۔ سکندر ہی کی طرح محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور غوری...... یہ سب دولت کے لئے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ انگریزوں کا بھی یہی کردار رہا، یہ سب حملہ آور ہی تھے جنہیں ہم مسلمان فاتحین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ایکسپریس: آپ محمد بن قاسم کو بھی حملہ آوروں کی صف میں شامل کر رہے ہیں جبکہ حملے کی ایک معروف وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بعض مسلمان خواتین کو اغواء کر لیا گیا تھا اور اموی سالار حجاج بن یوسف نے غیرت میں آکر لشکر بھیجا، کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: دیکھیں اگرچہ یہ خاصا نازک مسئلہ ہے مگر علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ اس حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کر دیا جائے۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ حملہ کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس سے واقف نہیں کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے پہلے بھی عرب چار پانچ مرتبہ سندھ پر حملہ کر چکے تھے۔ دراصل وہ سندھ کو اس لیے فتح کرنا چاہتے تھے کہ عرب تاجروں کا تجارتی روٹ محفوظ بنایا جائے۔ اس راستے سے عرب تاجروں کا سامان سری لنکا تک جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کا حملہ دراصل اسی ٹریڈ روٹ کو محفوظ بنانے کے لئے تھا۔ ممکن ہے وہ خواتین والا واقعہ درست بھی ہو لیکن اصل وجہ وہ نہیں بلکہ عرب تاجروں کا دباؤ تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ان تینوں مسلمان ''ہیروز'' محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری کو ہندوستان کی تاریخ بھلا چکی تھی۔ مغلوں کے دور میں ان کو کوئی جانتا تک نہیں تھا نہ کبھی انکا کسی کتاب میں تذکرہ آیا۔ یہ تو جب 1920ء کی دہائی میں فرقہ واریت شروع ہوئی تو ہندوؤں کے جواب میں ہم یہ مسلم ہیرو دوبارہ سے جھاڑ پونچھ کر سامنے لے آئے۔ انہیں سیاسی طور پر ہیرو بنایا گیا تھا۔ سیاست میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بھولے ہوئے ہیروز کو دوبارہ سے زندہ کر دیا جائے۔ مسلمان علماء میں سے بھی شاہ ولی اللہ کی بھی اپنے وقت میں اتنی اہمیت نہیں تھی مگر جدید سیاست نے انہیں دوبارہ سے ہیرو بنایا۔ احمد شاہ ابدالی بھی بہت ظالم

تھا۔ خود شاہ ولی اللہ کا ایک خط موجود ہے جس میں وہ افغان علماء کو لکھ رہے ہیں کہ میرے گھر کو بچاؤ ورنہ افغان لوٹ لیں گے۔ پٹھان ابدالی کو ہیرو مانتے ہیں جبکہ پنجابی زبان میں ابدالی کے ظلم کے حوالے سے ایک کہاوت بھی موجود ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ احمد شاہ ابدالی کے مظالم کے باعث اس کی مذمت کی جائے مگر پٹھان اپنی قوم پرستی کے باعث اسے ہیرو کہتے ہیں اور ہم بھی ان کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں تاریخ کو مذہب سے الگ رکھ کر دیکھنا چاہیے کیونکہ عقیدے کی روشنی میں تاریخ کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

ایکسپریس: ڈاکٹر صاحب! ان مسلمان سالاروں کی مذمت کرنے میں بھی کچھ زیادہ عجلت سے کام نہیں لیا جارہا، آخر ان کے حملوں اور مقامیوں سے انٹریکشن سے ہندوستان میں اسلام کو فروغ بھی ملا؟

ڈاکٹر مبارک علی: دیکھیں ایک بات پہلے ہمیں اصولی طور پر طے کرنی چاہیے کہ ہر ظالم حکمران قابل مذمت ہے۔ ہمیں لوٹنے والوں کو ہیرو نہیں بنانا چاہیے۔ البتہ مغل جو بعد میں یہاں آباد ہو گئے اور ہندوستانی کلچر اختیار کر لیا، انہیں حملہ آور نہیں کہہ سکتے۔ جہاں تک اسلام پھیلنے کا تعلق ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان دنوں قبائل کا رواج تھا، پنجاب اور سندھ کے قبائل میں سے اگر کسی قبیلے کا سردار مسلمان ہوتا تو پورا قبیلہ مسلمان ہو جاتا تھا۔ مسلمان ہونے کی ایک وجہ سیاسی تھی اور دوسری معاشی۔ تیسرا اور اہم ترین فیکٹر صوفیاء کرام کا اخلاق اور ان کی کشش تھی جس سے اسلام کا دائرہ بہت پھیلا۔ یہ بھی ہوا کہ بعض قبیلے مسلمان تو ہو گئے مگر انہوں نے اپنی قبائلی روایات قائم رکھیں۔

ایکسپریس: چلیں یہ تو آپ کا نقطہ نظر ہے، آپ نے فرقہ وارانہ تاریخ کی بات کی تو ایسا تو ہندوؤں نے بھی بہت کیا ہے، مسلمان حکمرانوں پر مندر گرانے کا الزام اور بابر مسجد کا قضیہ؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ کو دونوں جانب سے مسخ کر کے لکھا گیا۔ دراصل کبھی کبھی انسان ذاتی طور پر فرقہ وارانہ صورتحال سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ رچرڈ ایٹن نے مندروں کے گرانے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ یہ گرائے تو گئے ہیں مگر تعداد اتنی نہیں تھی۔ دراصل مذہبی عمارتوں کو بعض اوقات سیاسی بنیاد پر بھی گرا دیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق یہ بتاتی ہے کہ اورنگ زیب نے بہت سے مندروں کی امداد بھی کی اور یہ تحقیق سامنے لانے والے خود بھارتی مؤرخین ہیں۔ مندروں کے گرانے کا ایشو زیادہ نہیں ہے، تحقیق اس کو غلط ثابت کرتی ہے۔ بابری مسجد بابر کے ایک امیر نے بنائی تھی مگر یہ کسی مندر پر نہیں بنی۔ آرکیالوجی نے اس تھیوری کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ یہ محض ایک سیاسی ایشو ہے۔ ہندوستان کے تمام مشہور ہندو مؤرخین نے بابری مسجد کے حق میں بیانات دیئے تھے۔

ایکسپریس: آپ نے مغل دربار پر پی ایچ ڈی کی ہے، مغلیہ دور حکومت کے بارے میں آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مغل عہد بڑا مذہبی رواداری کا عہد تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کا ایک مشترک کلچر

پیدا ہوا۔ اکبر نے اس کلچر کو عروج پر پہنچا دیا۔ وہ مکمل ہندوستانی بن گیا تھا۔ یہ کلچر آخری مغل بادشاہ تک چلتا رہا۔ دسہرہ اور دیوالی منانا، وہی لباس پہننا...... وغیرہ۔ ہندوستان جیسے متنوع ملک میں سب کو ایک کڑی میں جوڑنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ ہندو مسلمان سب مغل بادشاہ کو اپنا بادشاہ مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1857ء میں ہندو مسلمان تمام دہلی کے بادشاہ کی طرف آئے اور ان کی قیادت میں جدوجہد کی۔ اورنگ زیب نے البتہ مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو بھی مروایا، مگر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کو طاقت اور سیاست کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اورنگ زیب نے اتنی بڑی سلطنت کئی عشروں تک سنبھالے رکھی، وہ ہر چیز کو خود دیکھا کرتا تھا، سخن فہم اور سیاست دان تھا۔ المیہ یہ تھا کہ وہ اس وقت آیا جب سلطنت پھیل چکی تھی۔ اس نے یہ کام سنبھالا مگر اس کے بعد ریاست منتشر ہوگئی۔ اورنگ زیب پر معیاری کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے، یہاں کامیابی کے لیے قتل بھی کرنے پڑتے ہیں اور رشوت بھی دی جاتی ہے۔

ایکسپریس: پورے مغل عہد میں آپ کا فیورٹ حکمران کون سا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ''جلال الدین اکبر''۔ اکبر عظیم بادشاہ تھا۔ اس کی پالیسی صلح کل تھی یعنی سب کے ساتھ امن سے رہو۔ اتنی بڑی سلطنت چلانا ناممکن تھا مگر اس نے چلا کر دکھائی۔ وہ ایک بڑا انسان بھی تھا۔ کاری گروں کے ساتھ بھی کام کرتا رہتا تھا۔ ایک ایرانی سیاح لکھتا ہے کہ اکبر فتح پور سیکری میں محل کی چھت پر تہمد باندھے پتنگ اُڑا رہا ہے۔ اس میں سادگی اور تحمل بہت تھا۔ ایک بار شکار کھیلنے ایک گاؤں گیا۔ شام کو وہ ایک مقامی سرائے میں گیا، بھٹیارن سے کھانا کھایا اور چارپائی پر پڑ کر سو گیا۔ صبح کسی کی چوری ہوگئی تو مسافروں نے اسے پکڑ لیا اور دو تین ڈنڈے بھی مار دیئے۔ سرائے کے مالک نے اسے پہچان لیا اور کہا کہ یہ تو اکبر بادشاہ ہے۔ اسی طرح ایک گاؤں میں لوگوں نے اسے چور سمجھ کر باڑے میں باندھ دیا، بعد میں پیچھے آنے والے فوجیوں نے چھڑایا۔ اس سب کچھ کے باوجود اکبر نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اکبر کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔ دین الٰہی کا تصور بھی غلط لکھا گیا ہے۔ ابوالفضل نے اسے آئین راہ نموئی کہا تھا۔ دین الٰہی کی اصطلاح تو بہت بعد میں آئی۔ اکبر اپنے آپ کو خدا نہیں بلکہ ہندو جوگیوں کے انداز میں گرو کہتا تھا۔ اس نے کسی کو مجبور بھی نہیں کیا۔ مان سنگھ نے دین الٰہی اپنانے سے انکار کیا تو اکبر نے اسے قطعی مجبور نہیں کیا اور بدستور وزیر بنائے رکھا۔ اکبر کو بدنام کرنے کے لیے یہ نیا دین بنانے والی متھ بنائی گئی۔ اکبر البتہ تقلید کے خلاف تھا۔ وہ ہر چیز کو چیلنج کرنے کا حامی تھا۔ جوانی میں وہ مسجدوں میں جھاڑو دیتا تھا، بعد میں علماء کے کردار سے وہ تنگ آ گیا۔ اس نے شیخ مبارک سے کہا مجھے ان مولویوں سے بچاؤ۔ اکبر کا غیر جانبداری سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ویژن بہت بڑا تھا۔

ایکسپریس: ہمارے بعض دانشور اس پر تنقید کرتے ہیں کہ مغل بادشاہ تعمیرات پر مال لٹاتے رہے مگر کسی دوسرے ملک خود گئے نہ وفود بھیجے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پہلے تو یہ سمجھا جائے کہ علم سوسائٹی کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تعمیرات، موسیقی اور فلسفہ میں بیش بہا کام ہوا ہے۔ یورپ کی تاریخ اور ان کی ضرورتیں ہم سے مختلف تھیں۔ ہندوستانیوں کو کہیں جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ نئے افکار اس وقت آتے ہیں جب ان کی ضرورت ہو۔ ویسے اکبر نے ایک سفارت سپین بھیجی تھی مگر سفیر راستے میں ہی بھاگ گئے۔ لوگ اس زمانے میں حج پر بھی مشکل سے جاتے تھے۔ یورپی ممالک کی ضرورت تھی کہ وہ باہر نکلیں تاکہ کما سکیں۔ ہندوستانیوں نے دوسرے ممالک پر حملے اسی لیے نہیں کیے کہ ان کا اپنا ملک ہی اتنا بڑا تھا۔ چین اور ہندوستان دونوں باہر نہیں نکلے۔ اسی لیے ان کی اپنی تہذیب کا اثر بھی باہر نہیں گیا۔ علاؤالدین خلجی نے ایک بار خواہش ظاہر کی کہ میں سکندر ثانی بننا چاہتا ہوں، پھر اس نے بھی اپنی توجہ ہندوستان کو مکمل طور پر فتح کرنے پر لگادی۔ 15 ویں صدی تک ہندوستان، چین اور یورپ علمی اور فکری اعتبار سے ایک جیسے تھے۔ اس کے بعد فرق آنا شروع ہوا۔ وہاں چھاپے خانے بنے، عسکری ٹیکنالوجی بہتر ہوئی، ہندوستان میں آخر کے حکمران بھی نااہل اور کمزور تھے، یوں طاقت کا تناسب یورپ کے حق میں چلا گیا۔ ہندوستانیوں کا زوال 18 ویں صدی میں مکمل ہوا جب پورا ڈھانچہ ہی بالکل بیٹھ گیا۔

ایکسپریس: پاکستان کی نظریاتی شناخت کے حوالے سے آپ سیکولر نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں، جبکہ تحریک پاکستان میں مذہب بنیادی عنصر تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: اگر ہم تحریک پاکستان کا پس منظر دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت بن گئے تھے، خصوصاً مردم شماری کے بعد۔ ظاہر ہے جمہوریت میں اقلیت کو قدرے نقصان ہوتا ہے کہ حکومت اکثریت کو ملتی ہے۔ اقلیت بن جانے کے خوف ہی سے علیحدگی کی سوچ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ سرسید احمد خان کے زمانے میں سامنے آگئی تھی، علی برادران اور قائداعظم نے (شروع میں) اس کی مخالفت کی۔ پھر یوپی کے ابھرتے ہوئے مڈل کلاس طبقہ کو اندازہ ہوا کہ ہندوستان میں رہے تو ہمارا مستقبل روشن نہیں ہوگا، یوں پاکستان کا مطالبہ سامنے آیا۔ یہ سیاسی ایشو تھا۔ پوری تحریک پاکستان میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کی بات ہوئی، کہیں پر بھی مذہبی تحفظات کی بات نہیں کی گئی۔ 1940ء کی قرارداد میں بھی یہی ہوا۔ پاکستان کی تقسیم سیاسی حقوق کے حصول کے لیے تھی، مگر بعد میں مذہب کا نام لے دیا گیا۔

ایکسپریس: تحریک پاکستان کے بارے میں تو آپ کا نقطہ نظر آگیا، اب تاریخ پاکستان پر بھی ایک نظر ڈالیے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مجموعی طور پر ہماری ریاست اپنے تمام اداروں سمیت ناکام ہوئی ہے۔ ہم شروع ہی میں دستور تک نہیں بنا سکے۔ سیاسی عمل بھی پروان نہیں چڑھ سکا، یوں فوج اور بیوروکریسی دونوں طاقتور ہوگئے، پھر یہی حکومت کرتے رہے۔ مشرقی پاکستان بھی علیحدہ ہوگیا۔ بھٹو کا دور بھی پاکستان کے لیے تباہ کن تھا، انہوں نے جمہوری ادارے مستحکم نہیں کیے جس کے نتیجے میں پھر فوج

آ گئی۔ جنرل ضیا نے غیر سویلین قوتیں اس قدر مضبوط کر دیں کہ اب بیورو کریسی بھی ان کے ماتحت ہو گئی۔ سیاسی قوتوں کو لوگوں میں شعور لانا چاہیے تھا، مگر وہ ناکام رہیں۔ ہماری سیاسی جماعتیں موروثی سیاست اور جاگیردارانہ انداز کی حامل ہیں، تاحیات لیڈر بنے بیٹھے ہیں۔ ادھر نظریاتی بنانے کے چکر میں ہم نے اپنے تعلیمی نصاب اور ڈھانچے کا بیڑا غرق کر دیا۔ ہم نوجوانوں میں نئی سوچ پیدا نہ کر سکے۔ طلبہ سیاست ختم ہو گئی، ٹریڈ یونین کرپٹ ہو گئی، گلڈ اور اکادمی کے ذریعے ادیبوں کو بھی کرپٹ کر دیا گیا۔ ہمارے دانش ور خوشامدی ہو چکے ہیں۔ ضیاء دور میں عورتوں کی تحریک تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ این جی اوز نے بجائے بیداری لانے کے لوگوں کو غیر سیاسی بنا دیا، دراصل انہیں فارن فنڈنگ ملتی ہے اور یہ عوام کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ تبدیلی لانے والی یہی قوتیں اور فیکٹر ہوتے ہیں جو کہ سب کے سب ہی پٹ چکے ہیں۔ عوام بے چارے سڑکوں پر تبدیلی لانے کی امید میں آتے رہے، مگر ان کو ایک بار بھی فائدہ نہیں پہنچا تو انہوں نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ ان میں مایوسی اور بے چینی ہے، مگر بے حسی غالب ہے جو کسی بھی سماج کے لیے سب سے خطرناک ہے۔ دراصل لوگ مہنگائی، بے روزگاری، صحت کے مسائل وغیرہ میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ ان کی سوچ ہی ختم ہو چکی ہے۔ ہر موڑ پر مسائل ہیں۔ اس لیے تعلیم یافتہ اور پیشہ ور لوگوں کے سامنے یہ سوالات ہیں کہ کیا یہ معاشرہ درست ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے یا اس میں اصلاح کی کوئی گنجایش نہیں، اس لیے ہجرت کر کے ترقی یافتہ ممالک میں چلا جایا جائے۔ اسی وجہ سے ہی اعلیٰ پروفیشنلز باہر جا رہے ہیں۔ رہے عام لوگ، تو ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ اس معاشرے میں رہیں اور بے بسی، مجبوری اور ذلت کی زندگی گزاریں۔ یہ بہت خوفناک منظر نامہ جسے ہر صورت میں بدلنا چاہیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سماج میں تبدیلی اگر دیر سے آئی تو ہم دنیا سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ایکسپریس: تبدیلی کس طرح آ سکتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: شاید آگے جا کر حالات بدل جائیں، مگر اس کے لیے سیاسی جماعتوں کا عمل ضروری ہے، جب وہ کرپٹ ہو جائیں تو سیاسی تبدیلی آنا مشکل ہو جاتی ہے۔ ویسے لیڈر شپ تین طرح کی ہوتی ہے، خاندانی یا موروثی، سازش کے ذریعے برسر اقتدار آنے والی اور عوام کے ذریعے آنے والی۔ ہمارے ہاں عوام کا دل جیتنے والی قیادت ہے ہی نہیں۔

ایکسپریس: آپ کو مستقبل میں کسی قسم کے انقلاب کی کوئی امید دکھائی دیتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: انقلاب کی بھی کوئی بنیاد، کوئی فکر ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں تو ایسی کوئی بنیاد بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ہے کہ گلوبلائزیشن بڑی تیزی سے آ رہی ہے۔ ایک اس کا معاشی پہلو ہے، جیسے چینی مصنوعات آنے سے ہماری انڈسٹری بند ہو رہی ہے۔ دوسرا اس کا پہلو کلچرل بھی ہے۔ ہمارے کھانے پینے کی عادات بدل رہی ہیں، دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ اطلاعات کا بہاؤ تیز ہو گیا ہے، اب علم رسائی میں ہے، خواہ کتنی

بھی سنسرشپ ہو۔گلوبلائزیشن سوسائٹی کو بدل رہی ہے اوراس سے شعور کا لیول بھی بڑھ رہا ہے۔میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ ہماری سوسائٹی میں رجعت پسندی اور مذہبی انتہا پسندی نہیں ٹک سکے گی،اس کی کوئی جگہ نہیں۔ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ بھارتی گلوبلائزیشن کو ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں،وہ اس کے طاقتور حصوں کو لے رہے ہیں اوراس کے ذریعے اپنی چیزیں باہر بھیج رہے ہیں۔جبکہ ہماری انڈسٹری تباہ ہو رہی ہے۔اب دیکھیں ہر طرف خودکش دھماکے ہو رہے ہیں۔دراصل یہ مسلم انتہا پسندی کی بے بسی کی کیفیت ہے۔ان کے پاس علم ہے نہیں کہ جواب دے سکیں،ایسی صورت میں یہ صرف بے سود خودکش دھماکے ہی کر سکتے ہیں۔

ایکسپریس:لاطینی امریکہ میں بڑی تیزی سے لیفٹسٹ حکومتیں سامنے آ رہی ہیں،آپ کو پاکستان میں اس کا کوئی امکان نظر آ رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی:ہمارے لیفٹسٹ عوام کی بات کرتے رہے،مگر عملاً وہ ہمیشہ روس اور چین کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔انہوں نے عوام میں اپنی جڑیں نہیں بنائیں اوران ملکوں نے انہیں ایکسپلائیٹ کیے رکھا۔لیفٹ نے انتہا پسندی کا مظاہرہ بھی کیا،بغیر سوچے سمجھے ہر شے کو مسترد کر دیا۔انقلاب لانے کے لیے اپنی سوسائٹی کو،ان کے جذبات کو سمجھنا بڑا ضروری ہے۔یہاں پر مذہب کا مذاق اڑانا بالکل غلط تھا اوراس کا برا اثر پڑا۔ہمارے لیفٹسٹ مارکس کو بھی درست نہ سمجھ سکے۔مارکس ازم عقیدہ نہیں بلکہ سوسائٹی کو سمجھنے کا ٹول،اوزار ہے،مگر یہاں ایسا نہیں ہوا۔ہمارے لوگوں نے مارکس ازم کو رومانی انداز میں قبول کیا۔لیفٹ کی پارٹیاں پاکستانی سماج کو سمجھنے میں مکمل ناکام رہیں اوراب یہاں لیفٹ کا کوئی مستقبل نہیں۔میں کئی نوجوانوں کو جانتا ہوں جو بڑے جذبہ اور شوق سے روشن خیال تحریکوں میں شامل ہوئے ہیں۔آج یہ سارے نوجوان اپنے لیڈروں کی دھوکہ دہی کے باعث ذلیل وخوار ہیں۔ان میں وہ بھی ہیں کہ جن کی تعلیم ادھوری رہی۔وہ بھی ہیں کہ جنہیں گھروں سے نکال دیا گیا اور وہ بھی ہیں کہ جو مالی طور پر دوسروں کے محتاج ہیں۔ترقی پسند لیڈروں نے ان نوجوانوں کو بے سہارا چھوڑ کر خوب کامیاب کیریئر اپنا لیے ہیں۔کچھ غیر سرکاری ملازمتوں میں ہیں،کچھ صحافی اور دانشور بن گئے ہیں،کچھ تجارت میں پیسہ کما رہے ہیں۔ان دانشوروں نے جس طرح سے معاشرے کو دھوکہ دیا ہے اس کی وجہ سے معاشرے میں ترقی پسندوں اور روشن خیال کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔

اب نئے بدلتے ہوئے حالات میں سیاسی نظریات کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے، تب جا کر کامیابی ہو سکتی ہے۔

(سنڈے میگزین روزنامہ ایکسپریس:فروری 2007ء)

☆☆☆

ریاست تاریخ کو سیاسی مفادات کے لئے استعمال کر رہی ہے

انٹرویو: ڈاکٹر اشفاق رحمانی

الجریدہ: آپ نے اپنی کتاب ''تاریخ اور آج کی دنیا'' میں مذہب کو سیاسی و تجارتی طور پر استعمال کرنے کی بات کی ہے واقعہ لال مسجد کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆ اچھا اس میں ایسا ہے کہ مذہب کا تعلق چونکہ انسانی زندگی اور اس کی روحانی، سماجی، ثقافتی سرگرمیوں سے بہت گہرا ہے اس لئے مذہبی رہنما اور سیاستدان اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کو تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن در پردہ اس کے ذریعے مذہبی اور سیاسی رہنما اپنے مفادات پورے کرتے ہیں یہی کچھ واقعہ لال مسجد، جامع حفصہ کے ساتھ ہوا لال مسجد انتظامیہ اور ریاستی مشینری نے ''مذہب'' اور دین کے نام کو استعمال کرتے ہوئے اپنی اپنی سیاست چمکائی اور ہمیشہ کی طرح اس واقعہ میں مذہب کے نام پر اس دفعہ بے گناہ بچوں اور خواتین کو قربانی کا بکرا بنایا گیا 1980ء کی دہائی میں آنے والے وافر پیسے نے چند مذہبی افراد کو دین سے دور اور کرسی کے نزدیک کر دیا لہٰذا اب کرسی کی لڑائی ہے جس کے لئے مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے لال مسجد میں علماء کا رویہ سوسائٹی کے لئے بہتر نہیں تھا۔

الجریدہ: ڈاکٹر صاحب کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟

☆ اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں تاریخ کے مضمون کو موجودہ تبدیلیوں کے ساتھ پڑھانے کی بجائے پاکستان کی ریاست اس مضمون کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کر رہی ہے جب ہم تاریخ کے مضمون کو کہ جس طرح وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے اس کا تجزیہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسے توڑ مروڑ کر، مسخ شدہ حالت میں سیاسی مفادات کی روشنی میں پڑھایا جاتا ہے۔ تاریخ کا مضمون موجودہ دور میں انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہو کر خود کو مکمل طور پر تبدیل کر چکا ہے اب یہ سیاست تک ہی نہیں، ثقافت، سماجیات، ماحولیات اور گمشدہ معاشرے کے طبقات کو جن میں عورتیں، غلام، کسان اور مزدور شامل ہیں کو تحقیق کا موضوع بنا چکا ہے۔ اب آتے ہیں آپ کے سوال کی جانب تاریخ کا علم بہت وسیع ہے تاریخ کے قوانین بنانا کافی مشکل ہے۔ تاریخ میں قوانین

دریافت کرنے والوں نے اسے چار طرح سے دیکھا ہے تاہم یہ زیادہ مناسب ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔

الجریدہ: کیا سماج میں تبدیلی ممکن ہے روشن خیالی سے تبدیلی آئے گی؟

☆ پاکستانی معاشرے میں روشن خیال لوگوں کی جو منافقت ہے اس کا تجربہ بار بار ہوا خاص طور پر ان کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب روس میں تبدیلی آئی اس کے ساتھ ہی وہ لوگ کے جو کہ سکہ بند سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے انہوں نے راتوں رات اپنے نظریات بدل لئے اور کھلے عام یہ کہنے لگے کہ انہوں نے غلطی کی تھی اور اب مارکس ولینن کے خیالات کی انہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ان میں سے اکثر گناہوں سے توبہ کر کے پکے اور سچے مسلمان ہو گئے اور اب سرمایہ داری اور آزاد منڈی کی تعریف و توصیف میں مصروف ہیں ہماری یہ روایت رہی ہے کہ ترقی پسند حضرات آخری عمر میں مذہب میں پناہ لے لیتے ہیں ان کی اس منافقت اور دوغلی پالیسی کی وجہ سے یہ لوگ معاشرے میں اپنی جڑیں نہیں جما سکتے۔ تبدیلی بالکل ممکن ہے تاہم چند دانشور، سماجی وسیاسی کارکنان اب بھی موجود ہیں اور بدقسمتی سے سماج کو بدلنے کی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے اندھیری راتوں میں آسمان پر ستارے چمکتے ہیں اور ہلکی ہلکی روشنی دیتے ہیں مگر یہ اندھیرے کو دور نہیں کر سکتے۔

الجریدہ: شاعری سے کوئی لگاؤ، کس قسم کی موسیقی پسند ہے؟

☆ سٹی کالج میں جو چار سال گزارے وہ زندگی کے یادگار تھے پڑھائی کے ساتھ ساتھ کالج کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی زوروں پر تھیں میں نے بھی مضامین لکھنے اور پڑھنے کی ابتداء یہیں سے کی یہاں ایک بار یادگار مشاعرہ کرایا گیا اس میں میر، انشاء، مصحفی، حسرت اور غالب کا روپ دھار کر طالب علموں نے بڑی اچھی ایکٹنگ کی میں اس میں مصحفی بنا تھا۔ موسیقی بھلا کیسے پسند نہیں تاہم کلاسیکل ادب اور کلاسیکل موسیقی پسند ہے۔ سٹیج توڑ موسیقی اور بے ڈھنگی شاعری نے ادب اور موسیقی کو بدنام کیا۔ آج کل جس طرح کی شاعری ہو رہی ہے وہ مجھے پسند نہیں۔ آج بھی میر، انشاء اور غالب کی شاعری سب ہی پسند کرتے ہیں۔

الجریدہ: دوران سٹڈی اور بعد ازاں بھی ملک سے باہر رہے، کوئی خاص تبدیلی معاشروں کی؟

☆ ہاں لندن میں میں نے ڈیڑھ سال گزارا، اس عرصہ میں وہاں کی ثقافتی زندگی سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا چلا گیا۔ سینما، تھیٹر، کلب اور وہاں کی لائبریریاں و باغات، لندن شہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر محلہ میں لائبریری اور پارک ضرور ہوتے ہیں جو یہاں نہیں ہے۔ ابتداء میں انگریزی کھانا عجیب لگتا تھا، ہاسٹل لائف میں افریقی، ترک، ایرانی، عرب اور ہندوستانی طالب علموں کے علاوہ یہودی جارج، شمون، بڑا ہنس مکھ اور مذاقی لڑکا تھا۔ لندن کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے پہلی بار بغیر ٹکٹ سفر کیا ملک سے باہر جانے کا پہلا تجربہ جہاز کا پہلا سفر، گھر والوں سے پہلی بار اتنی دوری سب

سے مل کر پہلی دفعہ نروس کیا1982ء کی بات ہے کہ میں امریکا گیا میرے ساتھ میری بیٹی عطیہ تھی جو اس وقت 7 سال کی تھی جب ہم سان فرانسسکو کے ائیرپورٹ پر اترے تو امیگریشن سے گزر کر جب کسٹم کے پاس آئے تو ہمیں اور ہمارے سامان کو علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا اور خوب سامان کی جانچ پڑتال ہوئی، شاید اسی لئے امریکہ مجھے پسند نہیں آیا۔

واقعات تو بہت سارے ہوئے ہیں اور میری کتاب در در ٹھوکر کھائے (میری آپ بیتی) میں کافی شامل ہیں تاہم ذہنی پسماندگی ہمارے ہاں زیادہ ہے ہم اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی بھی نہیں بن سکے وجہ تعلیمی پسماندگی جو ذہنوں کو پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے اور ہم روایات کے بندھے ہوئے لوگ، دیگر مذاہب میں شادیاں اب کوئی بری بات نہیں رہی۔

(سنڈے میگزین ''الجریدہ'': 29 جولائی تا4 اگست 2007ء)

☆☆☆

ترقی پسند اور عوامی مورخ

انٹرویو: عارف میاں

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے نمایاں ترین مورّخ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ یہ شاید بڑی بات نہ ہوتی، اگر ان کی کتابوں نے پاکستان میں ایک خاص قسم کی بحث نہ چھیڑ دی ہوتی۔ یہ بحث تاریخ پاکستان اور مطالعہ پاکستان کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی بحث ہے۔ یہ بہت بڑا کام سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی 1941ء میں ٹونک، راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ 1963ء میں سندھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا، اور اسی سال سندھ یونیورسٹی میں لیکچرر تعینات ہو گئے۔ 1976ء میں جرمنی کی روھر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ 1983ء میں سندھ یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ بعدازاں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ (لاہور) کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔

ڈاکٹر مبارک علی 1988ء میں فیض ایوارڈ، 2004ء میں کمیونل ہارمنی ایوارڈ (بھارت) اور 2005ء میں سندھی ادبی سنگت کی طرف سے حسام الدین راشدی ایوارڈ سے نوازے گئے۔ انہیں سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے ''گولڈ میڈل'' بھی دیا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی صحیح معنوں میں ترقی پسند اور ''عوامی مورّخ'' سمجھے جاتے ہیں۔

☆ سوال: آپ برصغیر کے مسلمانوں کا ماضی کیسا پاتے ہیں؟

■ جواب: مسلمانوں کی اگر ہم اصطلاح استعمال کریں تو برصغیر پر دو قسم کے مسلمانوں یا مسلمان خاندانوں نے حکومت کی ہے۔ ایک کے دور کو سلاطین کا دور اور دوسرے کو مغلوں کا دور کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان دونوں حکمران خاندانوں میں کسی نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ ان کی حکومت اسلامی ہے یا وہ اسلامی حکومت قائم کریں گے۔ دوسری بات یہ کہ برصغیر پر جن مسلمان خاندانوں نے حکومت کی، ان کا تعلق وسط ایشیا، افغانستان، ایران یا عرب ملکوں سے تھا۔ مقامی مسلمانوں کے پاس حکومت نہیں آئی۔ مقامی مسلمانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہاں مسلمان ہوئے۔ ان باہر سے آنے والے یعنی غیر ملکی مسلمانوں اور مقامی

مسلمانوں میں سماجی اور ثقافتی فرق بہت زیادہ تھا۔ اس لحاظ سے اس دور کو مسلمانوں کا دور حکومت سمجھنا یا کہنا مناسب نہیں۔ یہ اصطلاح پہلی دفعہ انگریزوں نے استعمال کی۔ ان سے پہلے ایسے نہیں کہا جاتا تھا۔ اس دور میں جو عام مسلمان تھے جیسے کسان، دستکار، ہنرمند، وہ لوگ اپنی اسی حالت میں تھے۔ مذہبی ہونے کی بنا پر ان کو کوئی مراعات یا سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ وہ بالکل اسی طرح تھے جیسے دوسرے عام لوگ۔ حکومت بادشاہ کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اشرافیہ کی۔ اس سماجی فرق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ سماجی لحاظ سے عام مسلمانوں کی حالت ہمیشہ مجبور و بے کس لوگوں کی رہی ہے۔

☆ 1764ء میں انگریزوں نے بنگال میں میر قاسم، نواب اودھ اور مغل شاہ عالم کی مشترکہ فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد معاہدہ ہوا، انگریز بنگال میں رہیں گے اور انھیں مالیہ وصول کرنے کا اختیار ہے۔ وہ مالیہ کا ایک حصہ بادشاہ کو بھی دیا کریں گے۔ کیا اس معاہدہ کو مسلمان حکمران طبقہ اور انگریزوں کے درمیان بہتر تعلقات کی ابتدا کہا جاسکتا ہے؟

■ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ فاتح کا مفتوح کے ساتھ معاہدہ تھا۔ مغل بادشاہ یا مسلمانوں کی اس معاہدہ میں مرضی شامل نہیں تھی۔ ان کو اس معاہدہ میں مجبوراً شامل ہونا پڑا تھا۔

☆ سید احمد بریلوی سے پوچھا گیا، آپ سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں انگریزوں کے خلاف کیوں نہیں تو ان کا جواب تھا:

> ''کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ نہ انگریزوں کا اور نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے' بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے' مگر مسلمانوں پر ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو مذہبی فرائض و عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں''۔

آپ کی رائے میں سید احمد بریلوی کی جہاد تحریک کے کیا محرکات تھے؟

■ اس موضوع پر میرا ایک مضمون ہے ''علما، معاشرہ اور جہاد تحریک'' اس میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ اصل میں یہ جو انیسویں صدی کا دور ہے، جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی شمالی ہندوستان پر قابض ہو چکی تھی اور مغل بادشاہ محض برائے نام رہ رہے تھے، مسلم اشرافیہ اور علما کا طبقہ جو اس سے پہلے حکومت کا ایک حصہ ہوتے تھے' وہ سب کے سب اس وقت اس سے الگ ہو گئے تھے تو اس معاشرہ میں یہ سوال تھا کہ ہمارا زوال کیوں ہے؟ اس کی دو صورتیں نکالی گئیں۔ ایک یہ کہ اسلام ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو رسومات سے آلودہ ہو گیا ہے، اسے پاک کیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کا ایک حصہ یہی ہے کہ ہندوانہ رسومات، عادات، روایات اور رواج جو آ گئے ہیں ان کو اسلام سے نکالا جائے اور ایک مسلم کمیونٹی قائم کی جائے جو کہ اصل

اسلام پر عمل کرے۔ دوسری صورت میں چونکہ ہندوستان میں انگریز غالب آ چکے تھے، طاقتور بھی تھے۔ اس لئے وہاں تو یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے، اس لئے جہاد کی تحریک یہ تھی، انہوں نے کہا کہ پنجاب کو آزاد کرائیں گے چونکہ وہاں پر سکھوں کا قبضہ ہے، سکھ وہاں مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد اس کے لئے یہ تھا کہ سرحد کے اندر ہیڈ کوارٹر بنایا جائے یا اس کی ابتدا وہاں سے کی جائے۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے ذہن میں ہمیشہ سے پٹھانوں کے بارے میں رہا ہے کہ وہ بہت مذہبی ہیں اور بہادر بھی ہوتے ہیں، اور اگر ان کو مذہب کے نام پر یہ کہا جائے تو وہ فوراً جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے بغیر جانے کہ وہاں کے رسم و رواج کیا ہیں؟ ان کا قبائلی نظام کیا ہے اور ان کی صورتحال کیا ہے؟ شمالی ہندوستان سے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں کچھ شبہات پیدا ہوتے ہیں، چونکہ جب یہ مجاہدین کے دستے ہندوستان سے روانہ ہوئے ہیں تو ہندوستان کی مقامی ریاستوں نے ان کو چندے دیئے، خود ہندوستان میں بھی ان کو چندے ملے۔ جب یہ لوگ سرحد میں پہنچے ہیں تب بھی مجاہدین سرحد میں آتے رہے، چندے بھی پہنچتے رہے۔ اس لئے شبہات یہ پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ظاہری نہیں تو درپردہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت یا انگریزوں کی ان کو مدد حاصل رہی ہے یا شاید ان کی دلچسپی یہ تھی کہ ٹھیک ہے، ایک ایسا عنصر جو یہاں مطمئن نہیں ہے وہاں سے چلا جائے۔ تاکہ خود ان کی حکومت میں کسی قسم کا جھگڑا یا فساد نہ ہو۔ لیکن جب یہ لوگ سرحد میں آتے ہیں تو خاص بات یہ ہے کہ ان کی زیادہ لڑائیاں خود پٹھان قبائل سے ہوئی ہیں، سکھوں سے یہ لڑائیاں کم ہوئی ہیں۔ بعد میں ان مجاہدین نے یہاں اسلامی حکومت قائم کی اور سید احمد بریلوی خلیفہ بھی بن گئے، امام بھی بن گئے تو ایک لحاظ سے یہ اپنے وقت کے طالبان تھے چونکہ انہوں نے بھی شریعت کے نفاذ میں سختیوں پر عمل کیا جیسا کہ طالبان نے کیا۔ شاید طالبان نے انہی کی روایات پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود پٹھان قبائل ان سے ناراض ہو گئے۔ اس لئے پشاور میں مجاہدین کا قتل عام ہوا اور جب سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی وہاں سے جانے لگے تو بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے ان کا سامنا ہوا۔ جس میں یہ لوگ شہید ہوئے۔ اس طرح سے اس تحریک کا خاتمہ ہوا۔ اب اگر اس تحریک کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ محض جذباتی طور پر تحریک کو شروع کرنا، واقعات کو نہ دیکھنا اور صورتحال کا صحیح اندازہ نہ لگانا یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوئی۔ انگریزوں نے بھی اس وقت تک ان سے تعرض نہ کیا جب تک ان کو کوئی خطرہ یا مسئلہ نہیں تھا، لیکن آگے چل کر جب ہندوستان کے اندر وہابیوں کی جانب سے کچھ جھگڑوں کی ابتداء ہوتی ہے تو انگریزوں نے ان پر مقدمے چلائے اور کافی لوگوں کو کالا پانی بھیجا۔ اس طرح اس تحریک نے ایک ہلچل تو پیدا کی لیکن اس کے کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے۔

☆1857ء کی لڑائی میں بیشتر مسلمانوں بالخصوص جاگیرداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ سید احمد خاں کے گزٹ لائل محمڈن آف انڈیا میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں کی انگریز دوستی کا کیا سبب تھا؟

■ 1857ء کی لڑائی میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی شامل تھے۔ مغل شہنشاہ کو ساتھ ملایا گیا کیونکہ ان کو ایک طرح سے چیلنج کیا گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ لڑائی لڑی ان کے اپنے مفادات تھے۔ ہندو حکمرانوں کا خیال تھا، انگریزوں کے چلے جانے سے ان کو حکومت کا موقع مل جائے گا۔ اسی طرح مغل شہنشاہ کو بھی امید تھی۔ دوسری طرف جن لوگوں نے لڑائی میں انگریزوں کا ساتھ دیا جیسے لکھنؤ کے تعلقہ دار تھے یا پنجاب کا زمیندار طبقہ تھا، ان کے اپنے مفادات تھے۔ ان کے انگریزوں سے تعلقات تھے۔ انہوں نے انگریزوں کا اس لیے بھی ساتھ دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے اس لڑائی میں انگریز ہی کامیاب رہیں گے۔

☆ 1857ء کی لڑائی کے فوراً بعد لارڈ میو نے ولیم ہنٹر کو مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کی ہدایت کی۔ جس نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کو مدد کا مستحق ظاہر کیا۔ کیا مغلوں بالخصوص اورنگزیب نے مسلمانوں کو نوازا نہیں تھا۔ مسلمان دوسروں کے مقابلے میں کمزور کیسے ہوئے؟

■ پہلے میں اورنگزیب کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اورنگزیب نے مذہب کو اپنی طاقت کے لیے استعمال کیا۔ اس نے یہ نہیں کیا کہ عام مسلمانوں کو نوازیں۔ اس کی اپنی فوج اور انتظامیہ میں اکبر سے زیادہ ہندو راجپوت تھے۔ جہاں تک ہنٹر کی رپورٹ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا تعلق ہے اس کا دائرہ بنگال اور بہار کے مسلمانوں تک محدود رہا، ورنہ یوپی میں مسلمان اشرافیہ کافی طاقت میں تھی اور ملازمتوں کے اندر بھی مسلمانوں کو تعداد سے زیادہ نمائندگی حاصل تھی۔

☆ لارڈ میو کو مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔

■ 1857ء کے بعد انگریزوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اندر کافی بے چینی پائی جاتی ہے چونکہ اس وقت انگریزوں کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے ہچکچا رہے ہیں۔ ملازمتیں بھی اختیار نہیں کر رہے ہیں تو ایک لحاظ سے مسلمان قومی دھارے کے اندر نہیں آ رہے تھے۔ ان حالات میں فیصلہ ہوا کہ معلوم کیا جائے، آخر مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے، ان کی معاشی اور سیاسی حالت کے بارے میں سوچا جائے۔ چونکہ انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستان کے اندر کمیونٹیز میں توازن ضرور رکھنا چاہیے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اس رپورٹ کا تعلق بنگال کے مسلمانوں سے ہے یوپی کے مسلمانوں سے بالکل نہیں ہے۔

☆ 1857ء میں انگریزوں نے سید احمد خان کے ہاتھوں مراد آباد اور مولانا فصیح الدین کے ہاتھوں غازی پور میں سکول کھلوائے۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی، عام مسلمان انگریزی تعلیم سے ہچکچا رہے تھے اور انگریز مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے؟

■ 1857ء کے بعد جس قسم کا ماحول پیدا ہو گیا تھا، اس میں انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ کیونکہ انگریز نہیں چاہتے تھے مسلمان پسماندہ اور الگ تھلگ رہیں۔

☆ 1764ء میں انگریزوں کا شاہ عالم سے معاہدہ، اس کے بعد سید احمد بریلوی کی تحریک، 1857ء

میں مسلمان اشرافیہ کا انگریزوں کا ساتھ دینا، کیا ان باتوں سے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ انگریزوں نے شروع ہی سے مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی کامیاب کوششیں کی تھیں؟

■ یہ مسلمان اشرافیہ اور انگریزوں کا ملاپ تو تھا، لیکن اس کی شکل یہ تھی کہ شجاع الدولہ اودھ کے بادشاہ اور شاہ عالم اور ان کے امراء نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ انگریزوں سے جنگ کر سکیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے کوئی لڑائی نہیں کی۔ 1803ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر قبضہ کیا تو اس نے بھی مغلوں سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ مرہٹوں سے کی تھی۔ کیونکہ اس وقت دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ تھا اور مغل بادشاہ اس وقت ایک طرح سے مرہٹوں کا وظیفہ خوار تھا، یعنی مسلمان بکسر کی جنگ کے نتیجہ میں فوجی اور ذہنی طور سے شکست کھا چکے تھے اور انگریزوں کی بالادستی تسلیم کر چکے تھے۔

☆ حیدرآباد دکن کا نظام جو ایک طرح سے مرہٹوں کا باجگزار تھا، اس نے مرہٹہ سردار کو چوتھ دینے سے انکار کیا تھا۔ کیا اس کا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے دستور معاونت "subsidary system" کے تحت اس کے معاملات طے ہو گئے تھے؟

■ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں جو مقامی ریاستیں تھیں، ان کے ساتھ مختلف وقتوں میں مختلف قسم کی پالیسیاں اختیار کیں۔ بعد میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہوئی اور ہندوستان پارلیمنٹ کے تحت آیا تو بھی مختلف پالیسیوں کو انگریزوں نے اختیار کیا۔ مثلاً ایک پالیسی ان کی یہ تھی کہ کچھ ریاستوں کو جو وہ سمجھتے تھے ان کے لئے ضروری ہیں ان پر قبضہ کر کے برطانوی ریاست میں شامل کر لیا جائے۔ اس کے تحت لکھنؤ اور دوسری ریاستوں پر انہوں نے قبضہ کیا۔ یہ ڈلہوزی کی "Doctrine of Lapse" کہلاتی ہے۔ دوسرے یہ تھا، کچھ ریاستوں کو، ان کے جو حکمران ہیں راجہ، مہاراجہ اور نواب، ان کے ہی ماتحت رہنے دیا جائے۔ اور یوں کہا گیا کہ ان کے جو بیرونی تعلقات ہیں وہ اب برطانوی حکومت رکھے گی۔ یہ بھی کہا گیا کہ انہیں فوج رکھنے کی ضرورت نہیں چونکہ برطانوی حکومت موجود ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اندرونی معاملات کے اندر وہ بالکل خودمختار ہوں گے، جس طرح چاہیں اپنا قانون بنائیں، جس طرح چاہیں نظام چلائیں، جس طرح چاہیں حکومت کریں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان ریاستوں میں وہ اپنا ریزیڈنٹ مقرر کرتے تھے۔ ریزیڈنٹ باخبر رہتا تھا کہ ریاست کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ساری رپورٹس اس کو ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ریزیڈنٹ بہت زیادہ طاقتور ہوتا تھا، اتنا طاقتور کہ حکمران کی وفات کے بعد کون جانشین ہوگا، اس کا فیصلہ بھی اس کی سفارش پر ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے ریاستوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اگر برطانوی حکومت کہیں حملہ کرے گی، فرض کیا افغانستان کے اوپر یا برما پر یا کہیں اور تو اس صورت میں انگریز ان ریاستوں سے فوجی اور مالی مدد بھی طلب کرتے تھے۔ یہ مختلف قسم کی پالیسیاں تھیں جو انہوں نے اختیار کیں۔ 1857ء کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب جو ریاستیں رہ گئی ہیں ان کو باقی رہنے دیا جائے، اب ان پر قبضہ نہ کیا جائے۔

کیونکہ 1857ء میں جن ریاستوں پر قبضہ کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے یہ ہنگامہ ہوا۔ اس کے بعد سے انہوں نے مقامی ریاستوں کو رہنے دیا۔ آپ نے جو دستور معاونت یا "subsidary system" کی بات کی۔ اس میں یہ تھا کہ مقامی ریاستوں سے وہ مختلف قسم کے معاہدے کرتے تھے۔ مثلاً ٹیپو سلطان کے ساتھ جب ان کی جنگ ہوئی، انہوں نے مرہٹوں کے ساتھ بھی معاہدہ کیا اور نظام دکن کے ساتھ بھی۔ یہاں تینوں مل کر ٹیپو سلطان پر حملہ کرتے ہیں، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ٹیپو سلطان سب کے لئے خطرہ ہے۔ انگریزوں کے لئے بھی ہے۔ نظام یہ سمجھتا تھا کہ اس کے لئے بھی ہے۔ مرہٹے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے لئے بھی ہے۔ یہاں پر ان کا معاہدہ ہوا اور انہوں نے مل کر حملہ کیا اور ٹیپو سلطان کو انہوں نے شکست دے کے اس کی ریاست کا حصہ بخرا کیا اور لوٹ مار بھی کی۔ اور باقی ریاست کو پرانے حکمران کے حوالے کر دیا۔ تو یہ پالیسی آخر تک جاری رہی۔ ایک طرح سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک کو وہ برطانوی علاقہ، دوسرے کو مقامی ریاستیں کہتے تھے۔ اس میں چھوٹی بڑی بہت ساری ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان ریاستوں کی انہوں نے درجہ بندی کر رکھی تھی۔ اس میں خطابات بھی وہ اس حساب سے دیا کرتے تھے، مثلاً نظام کی بڑی ریاست تھی، نظام کو 21 توپوں کی سلامی دی جائے گی۔ اس کا خطاب بھی الگ تھا۔ دوسرے درجہ میں جو آتے تھے، ان کو کم توپوں کی سلامی دی جاتی تھی، جو دربار لگا کرتا تھا، اس میں نشستیں بھی ریاست کے سائز اور اہمیت کے اعتبار سے ہوا کرتی تھیں۔ تو اس پالیسی کے تحت انہوں نے مقامی ریاستوں کو باقی رکھا لیکن ان کی اہمیت اس طرح سے نہیں رہی تھی، اہمیت ختم ہو گئی تھی، مثلاً یہ معاہدے اور دوسری چیزیں۔ ریاستوں کی پوری فائلیں رکھی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1947ء کے اندر جب انگریز گئے ہیں تو انہوں نے مقامی ریاستوں کا پورا ریکارڈ ضائع کر دیا یا جلا دیا، کیونکہ یہ وہ ریکارڈ تھا جس میں ان حکمرانوں کی عیاشیوں اور بدعنوانیوں کی فائلیں وہ رکھا کرتے تھے تاکہ جب بھی موقع ہو ان کو بلیک میل بھی کیا جا سکے اور اپنا اثر و رسوخ بھی ڈال سکیں۔ جاتے وقت انہوں نے یہ سارا ریکارڈ ضائع کر دیا۔ اس پر نہرو نے احتجاج بھی کیا کہ یہ ہماری تاریخ کا ایک اہم پہلو تھا، یا معلومات تھیں آپ نے ضائع کر دیا۔

☆ 1885ء میں آل انڈیا کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت انگریزوں کو اس پر اعتراض نہیں تھا لیکن دو ہی سال بعد انگریز اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

■ جب کانگریس کے مطالبات بڑھنا شروع ہوئے تو حکومت نے اس کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔

☆ کانگریس کے مطالبات کس قسم کے تھے؟

■ ایک مطالبہ سول سروسز میں ہندوستانیوں کو زیادہ نمائندگی دینے کا تھا۔ اسی طرح امپریل کونسل میں منتخب نمائندوں کی تعداد بڑھانے اور ووٹ کا حق زیادہ لوگوں کو دینے ایسے مطالبات تھے۔

☆ 1905ء میں انگریزوں نے بنگال تقسیم کیا۔ کیا اس کا مقصد مسلم قیادت پیدا کرنا تھا؟

■ انگریزوں کا تو یہ کہنا تھا، بنگال بڑا صوبہ تھا، اس لیے انہوں نے انتظامی سہولت کے لیے تقسیم کیا۔ ہندوؤں نے تقسیم کی مخالفت کی۔ وہ سمجھتے تھے انگریزوں نے فرقہ وارانہ تقسیم کر کے بنگال کی سیاسی طاقت کو کمزور کیا۔ مسلمان تقسیم کے حق میں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرف سے تقسیم کی مخالفت کا مطلب یہ لیا کہ چونکہ تقسیم سے مسلمانوں کی ترقی کے مواقع پیدا ہوئے۔ اس لیے ہندوؤں نے اسے ناپسند کیا۔

☆ تقسیم سے فرقہ وارانہ سوچ کو فروغ ملا؟

■ تقسیم بنگال نے فرقہ وارانہ سوچ کو پیدا بھی کیا اور فروغ بھی دیا۔ چونکہ یہ تقسیم ہوئی تو مشرقی بنگال جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی ان کو اس سے فائدہ ہوا۔ اس وجہ سے 1911ء میں جب اس تقسیم کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا تو اس سے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہندو بھی ان کے مخالف ہیں اور انگریز بھی۔ یہ سوچ بہت آگے چلی۔ جب مسلمانوں میں نئی قیادت آئی، پہلے والی جس میں سید احمد خاں وغیرہ تھے، یہ تو اس بات کے قائل تھے کہ انگریزوں سے تعلقات بہتر رکھے جائیں، لیکن 1911ء کے بعد جو دوسری قیادت آئی، جس میں محمد علی جوہر اور حسرت موہانی وغیرہ تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کے ہاں چونکہ انقلابی اور طاقتور تحریکیں ہیں، انہوں نے طاقت کے ذریعے اپنے مطالبات کو منوالیا تو ہمیں بھی اسی طریقے سے سیاست کرنا ہوگی اور اسی طریقے سے اپنے مطالبات منوانا ہوں گے۔ تو اس سے نہ صرف فرقہ وارانہ سوچ پیدا ہوئی، بلکہ اس نے ہندوستانی سیاست میں خاص طور پر مسلمانوں کے اندر انقلابی جذبہ کو بھی پیدا کیا۔

☆ 1906ء میں کچھ مسلمان شملہ میں لارڈ منٹو سے ملے۔ انہیں مسلمانوں کے نمائندہ وفد کی حیثیت دی گئی۔ کیا کانگریس میں مسلمان نہیں تھے؟

■ کانگریس میں بھی مسلمان تھے۔ وفد کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک یہی کہ انگریزوں خاص طور سے منٹو نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل کے ذریعے سے کہلوایا کہ مسلمانوں کا ایک وفد ان سے ملے۔ کیونکہ بنگال میں اس وقت بڑی تیزی سے تحریک چل رہی تھی۔ اس لیے انگریزوں نے تحریک کو کمزور کرنے اور مسلمانوں کو مراعات دینے کی راہ اپنائی۔ دوسری رائے یہ ہے، نواب محسن الملک کی خواہش پر وائسرائے نے وفد سے ملاقات کی۔ جہاں مسلمانوں کو کچھ مراعات دینے کی بات ہوئی۔ بہر حال یہ وفد مسلمانوں کا نمائندہ نہیں تھا۔ اسے مسلمانوں نے منتخب کر کے یا متفقہ طور پر نہیں بھیجا تھا۔

☆ انگریزوں نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول کس بنا پر رائج کیا؟

■ یہ سیاسی نوعیت کا ہی فیصلہ تھا۔ جو انگریزوں نے اپنے مفاد میں کیا تھا، کیونکہ کانگریس کی تحریک کو کمزور کرنا مقصد تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو مراعات دی گئیں۔

☆ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمان حکمران طبقہ کو مراعات دے کر کانگریس کے

خلاف پارٹی بنالیا؟

■ یہ کہا جاسکتا ہے، چونکہ تقسیم بنگال کے خلاف جب تحریک چل رہی تھی، اس زمانے میں یہ شملہ وفد بلایا گیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ منٹو مارلے اصلاحات کے سلسلے میں بھی بلایا گیا، کیونکہ ان کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ 1909ء کے اندر یہ ہونا تھیں۔ تو یہ دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو تھوڑا سا سہارا دے کر ان کو پارٹی بنایا جائے۔ دوسرا یہ کہ آئندہ جو منٹو مارلے اصلاحات ہو رہی ہیں ان کے اندر مسلمانوں کے مطالبات کو شامل کیا جائے۔ تو یہ کہہ سکتے ہیں، چونکہ جو ایک امپیریل پالیسی ہوتی ہے تقسیم کرو اور حکومت کرو divide "and rule" یعنی ایک پارٹی کو نہ تو زیادہ طاقتور بنائیں اور نہ ہی زیادہ مخالف۔ دو پارٹیاں ہونی چاہئیں تاکہ توازن برقرار رکھا جائے۔ یہ توازن کا سلسلہ شملہ وفد سے شروع ہوتا ہے۔

☆ 1906ء میں بننے والی مسلم لیگ نے 1937ء تک الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ 1937ء میں پہلی بار الیکشن لڑا گیا۔ ہندوستان بھر میں 25 فیصد مسلم ووٹروں میں اسے 5 فیصد سے بھی کم نے ووٹ دیئے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو دو سیٹیں ملیں اور سندھ و سرحد میں کوئی ایک سیٹ نہیں ملی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

■ بات دراصل یہ ہے، مسلم لیگ پر تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ انہوں نے اس بات کی کبھی کوشش نہیں کی کہ مسلم لیگ کو عوامی پارٹی بنایا جائے۔ محمد علی جناح ابھی مسلم سیاست کی طرف نہیں آئے تھے۔ وہ کانگریس کے بھی ممبر رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ اس طرح مسلم لیگ چونکہ عوامی پارٹی نہیں بنی تھی۔ اس لیے انتخابات میں اس کو ناکامی ہوئی۔ 1937ء کے بعد اس میں تبدیلی آئی۔

☆ 1937ء کے انتخابات کے تحت کانگریس کی 11 میں سے 7 صوبوں میں حکومتیں بنیں۔ 1938ء میں قائد مسلم لیگ نے خود کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کیا اور 1940ء میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن مانگ لیا۔ کیا یہ مطالبات ان کی سیاسی حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں تھے؟

■ 1937ء میں کانگریسی وزارتوں سے غلطیاں ہوئیں۔ اگر وہ رعونت کا رویہ اختیار نہ کرتے۔ مسلم قیادت یا مسلم عوام کے ساتھ ان کا تعلق رہتا تو شاید مسلم لیگ کو اس بات کا موقع نہ ملتا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کانگریسی وزارتوں نے استعفے دیئے۔ مسلم لیگ نے ان تمام باتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ مسلم لیگ ابھی تک عوامی جماعت نہیں تھی۔ شہروں میں تھی، جوان کے جلسے جلوس ہو جاتے تھے، لیکن دیہاتوں اور قصبوں میں ان کی پہنچ نہیں تھی۔ نہ ہی اس پورے عرصہ میں مسلم لیگ نے کوئی ایسا مطالبہ اٹھایا جو عام لوگوں کا مطالبہ ہو۔ ان کے سارے مطالبات طبقہ امراء کی نمائندگی کرتے تھے، جیسے انہیں سیٹیں ملنی چاہئیں، سیاسی حقوق ملنے چاہئیں، ملازمتیں ملنی چاہئیں۔ عام آدمی کی کوئی بات انہوں نے نہیں کی۔ 1940ء کی ''قراردادِ لاہور'' کی بھی اگر ہم بات کرتے ہیں تو بہت سے سوالات ہیں۔ ایک تو یہ بھی سوال ہے

کہ اس قرارداد کو کیسے پاس کیا گیا؟ کیونکہ قرارداد انگریزی میں تھی اور عام لوگ انگریزی جانتے نہ تھے۔ کیا ہاتھ اٹھوا کر پاس کی گئی، یا یہ کہا گیا کہ پاس ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا کہ پاس ہوگئی؟ دوسری بات یہ ہے۔ اس میں نئے ملک کا جو نقشہ دیا گیا، وہ مسلم اکثریتی علاقوں کا دیا گیا۔ ورنہ اب تک یہ تھا کہ اگر ملک بنانا ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بنانا ہے۔ بنانا ہے تو کیسے بنانا ہے؟ اب یہ ہوگیا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ان علاقوں کے مسلمانوں کے لیے یہ ملک بنے گا۔ اس قرارداد میں پاکستان کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس کو ''قرارداد لاہور'' کہا گیا۔ یعنی 1940ء تک بڑی کنفیوژن کی صورتحال تھی۔ مسلم لیگ اور خود محمد علی جناح کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ کس قسم کا پاکستان چاہیے۔ ایسا کوئی خاکہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کو کس طریقے سے حاصل کیا جائے۔ کیا ہندوستان میں رہتے ہوئے حاصل کیا جائے یا ہندوستان سے الگ رہ کر اور الگ ملک بنا کر حاصل کیا جائے۔

☆ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ محمد علی جناح کے مطالبات ان کی حیثیت سے زیادہ تھے؟

■ بالکل، بہت زیادہ تھے۔

☆ ابھی آپ نے کانگریسی وزارتوں کے حوالے سے رعونت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح مسلم عوام کے ساتھ کانگریس کی لاتعلقی کی بات کی ہے۔ کہتے ہیں کانگریس کا مسلمانوں کے ساتھ تعلق تھا۔ کانگریسی وزارتوں سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کانگریس نے مسلم رابطہ مہم شروع کی تھی اور مسلمانوں کو ساتھ ملانا شروع کیا تھا تو محمد علی جناح اور ڈاکٹر محمد اقبال کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ مسلمان سارے کانگریس کے ساتھ چلے جائیں گے۔ اس بات کو مسلم لیگ کے قائدین نے بہت بُرا محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کو ان سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیا اس سے یہ شبہ نہیں ہوتا، کانگریس کی غلطی یا کوتاہی نہیں تھی، بلکہ مسلم لیگ کی اپنی کمزوریاں تھیں یا اس میں احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا؟

■ اس میں کانگریس کی بھی تھوڑی بہت غلطی تھی کیونکہ انہوں نے کہا ہندوستان میں دو ہی پارٹیاں ہیں، کانگریس یا برطانوی حکومت۔ مسلم لیگ کو بالکل ہی نکال دیا۔ رعونت کا جو میں نے لفظ استعمال کیا، وہ مسلم قیادت کے لیے تھا کہ ان کو وہ کسی خاطر میں نہیں لائے کہ آپ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مسلم رابطہ مہم کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس نے مسلم لیگ کو اور زیادہ پریشان کیا۔ چونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر اس طریقے سے مسلمان ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو مسلم لیگ ختم ہو جائے گی۔ اس لحاظ سے بھی انہوں نے اپنا کیس بنانا شروع کیا اور مسلمانوں کے اندر جا کر کہا کہ کانگریسی حکومتیں ہندو حکومتیں ہیں، جو ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہیں اور اس طرح مسلمانوں اور اسلام کو ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ یعنی مذہب کا استعمال کیا اور عام مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اٹھایا۔

☆ 23 مارچ 1940ء تک قائد مسلم لیگ نے یہی ظاہر کیا کہ وہ مسلمانوں کے مفاد میں الگ وطن

حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ 6 جون 1946ء کوانہوں نے کیبنٹ مشن سکیم منظور کر لی اور کہا، اس سے بہتر منصوبہ مسلمانوں کے لیے نہیں ہوسکتا۔ اچانک اتنی بڑی تبدیلی کا کیا سبب تھا؟

■ کیبنٹ مشن سکیم کو منظور کرنے کا مطلب یہی تھا، پاکستان سکیم کو ختم کر دیا گیا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ شاید جناح صاحب نے یہ سوچا ہو اس طرح اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کو تحفظ مل جائے گا، چونکہ پاکستان سکیم کا مطلب انہیں نظر انداز کرنا تھا۔

☆ جولائی 1946ء میں صدر کانگریس جواہر لال نہرو نے پریس کانفرنس کی جس میں کیبنٹ مشن سکیم میں بعض تبدیلیوں کا عندیہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد محمد علی جناح نے 6 جون کی منظوری واپس لے لی۔ ہر چند کہ بعد میں کانگریس نے سکیم کی مجوزہ شرائط پر کار بند رہنے کی قرار داد منظور کی اور اعلان کیا۔ محمد علی جناح نہیں مانے۔ کیا وہ سکیم منظوری سے واپسی کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے؟

■ جناح صاحب کے اندر بھی بڑی ضد تھی اور انا تھی۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی ذاتی انا کا ہی مسئلہ تھا۔

☆ اکتوبر 1945ء میں صدر مسلم لیگ نے ایک بار پھر اپنے مطالبہ میں لچک دکھائی اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن یہ شرط تھی کہ انہیں جواہر لال نہرو کے متوازی باری باری کونسل کی صدارت کا موقع دیا جائے۔ چونکہ یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس لیے انہوں نے مطالبہ پاکستان جاری رکھا۔ اور 3 جون 1947ء کو پاکستان کا اعلان کر دیا گیا۔ محمد علی جناح میں اس تبدیلی کا کیا سبب تھا؟

■ اس بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا اصول رائج کرنے والا لارڈ مانٹیگو سمجھتا تھا:

> ''عقائد اور طبقات کی بنا پر تقسیم کا مطلب یہ ہے، ایسے سیاسی کیمپ بنا دیئے جائیں، جو ایک دوسرے کے خلاف منظم ہوں۔ اس سے لوگوں کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ شہریوں کے بجائے جانبداروں کی طرح سے سوچیں۔ یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ یہ نظام آگے چل کر کبھی قومی نمائندگی میں تبدیل ہو سکے گا''۔

آپ جداگانہ انتخاب کے نتائج کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

■ بنیادی طور پر تو یہ جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ہی غلط تھا۔ چونکہ اس کا مطلب تھا، آپ قومی دھارے سے الگ ہو جائیں۔ ہندوستانی قومیت کے دھارے میں نہ رہیں اور اپنی الگ شناخت بنائیں۔ ہندوستان کے اندر جہاں مسلمان ہزاروں برس سے آباد تھے اور ایک مخلوط کلچر تھا، ایک ہی زبان بولتے تھے۔ اس صورت میں اگر ہم ہندوستانی قومیت کے دھارے میں رہتے تو وہ ہمارے لیے زیادہ مفید ہوتا۔ ہم اس دھارے سے نکلے تو یہ آگے چل کر ہمارے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہوا ہے۔ پاکستان کے اندر بھی جو اقلیتوں کے جداگانہ انتخابات کیے ہیں تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

☆ پاکستان بن جانے کے بعد محمد علی جناح نے کہا تھا، پاکستان اسی دن بن گیا تھا جب ایک ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔ کیا اس کے مقابلہ میں یہ کہنا زیادہ مناسب نہیں تھا، پاکستان اسی دن بن گیا تھا جب انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھے تھے؟

■ جناح صاحب کو تاریخ سے کوئی زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ نہ ہی دیکھا جائے تو اسلام سے انہیں کوئی واقفیت تھی۔ وہ ایک اچھے وکیل تھے، یہ ان کی خوبی تھی لیکن جہاں انہیں موقع ملا، انہوں نے بھی مذہب کو سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ وہ ذاتی طور پر تو سیکولر تھے اپنی نجی زندگی میں، لیکن عوام کو ساتھ ملانے یا خوش کرنے کے لیے، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ایسی باتیں کیا کرتے تھے اور انہوں نے یہ بات کہی۔ دوسری بات یہ کہ انگریز کے آتے ہی پاکستان بن گیا تھا، یہ بھی میرے خیال سے کچھ زیادتی ہے۔ انگریز یہاں جس طریقے سے آئے تھے، یعنی دوسرے یورپین بھی آئے ہیں تو وہ تجارت کرنے آئے تھے۔ پھر انہیں یہاں جب مواقع ملے، تجارت کے ساتھ ساتھ سیاست پر قبضہ کرنے کے، تو انہوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا۔ یہ بہت آہستہ عمل تھا جس کے نتیجہ میں وہ تجارت سے اقتدار کی طرف آئے۔

☆ محمد علی جناح کی کانگریس سے علیحدگی کا کیا سبب تھا؟

■ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ جناح صاحب اور گاندھی کی شخصیت میں بہت زیادہ تضاد تھا۔ جناح صاحب کوئی عوامی لیڈر نہیں تھے۔ وہ بہت ہی امیرانہ ذہن رکھتے تھے۔ طرز زندگی ان کی امیرانہ تھی۔ جب تک گاندھی یہاں پر نہیں تھے، کانگریس بھی کوئی عوامی جماعت نہیں تھی۔ گاندھی کا کارنامہ یہ ہے، انہوں نے آنے کے بعد کانگریس کو عوامی جماعت بنایا اور خود انہوں نے اپنے آپ کو ایک عام آدمی کی حیثیت سے پیش کیا۔ ایک عام آدمی ان سے خوف نہیں کھاتا تھا، ڈرتا نہیں تھا، بلکہ ان کے قریب جاتا تھا۔ ان سے محبت کرتا تھا۔ جناح صاحب سے وہ خوف کھاتے تھے۔ جناح صاحب کے اندر جو ایک رعونت تھی وہ اس سے ان کے قریب بھی جانے سے ڈرتے تھے۔ کوئی ان سے بات نہیں کرتا تھا۔ یہ دو شخصیتوں کا ایک زبردست قسم کا تضاد تھا اور جناح صاحب کی گاندھی کے آنے کے بعد کانگریس میں حیثیت ایک لحاظ سے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جناح صاحب کی علیحدگی کے اندر اس تضاد کا کردار بہت اہم تھا۔

☆ محمد علی جناح کا تعلق ایک عام محنت کش خاندان سے تھا۔ خود عملی زندگی میں انہوں نے بڑے مشکل حالات دیکھے تھے۔ خاص طور سے وکالت کے ابتدائی تین سال ان کے لیے صبر آزما تھے۔ انہوں نے خود اس دور کو "سیاہ دور" کا نام دیا۔ بعد میں وہ آسودہ ہوئے، شکل و صورت کے اعتبار سے بھی وہ بہت زیادہ حسین نہ تھے کہ وہ خود کو ممتاز سمجھتے۔ پھر ان میں رعونت کا کیا سبب تھا؟

■ اس کی بہت سی نفسیاتی وجوہات ہیں۔ ان کا تعلق امیر گھرانے سے نہیں تھا۔ بہت معمولی گھرانے سے تھا۔ ایک تو یہ بھی نفسیاتی چیز تھی۔ وہ کبھی اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ممبئی میں بھی جب وہ رہے ہیں،

انہوں نے زیادہ تعلقات یا تو پارسیوں سے رکھے ہیں یا انگریزوں سے۔ عام وہاں کے لوگوں سے بھی نہیں رکھے ہیں۔ طرز زندگی جو کچھ بھی اپنایا' عام لوگوں سے وہ ملتے بھی نہیں تھے، بے تکلف بھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ بہت ہی محتاط رہتے تھے۔ اس کے لیے رعونت "arrogant" کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ کسی بات کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ خوفزدہ ہوتے تھے۔ اپنی رائے کی مخالفت تو وہ بالکل ہی برداشت نہیں کرتے تھے۔

☆ کہتے ہیں محمد علی جناح جمہوریت پسند نہ تھے؟

■ صحیح ہے۔ ایک تو وہ بالکل عوامی لیڈر نہیں تھے۔ اپنے آپ کو واحد ترجمان "Sole Spokesman" کہتے تھے۔ جو مسلم لیگ کے اجلاس بھی ہوا کرتے تھے۔ ان میں لوگوں کو ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جو اپنی بات کہتے تھے اسی کو مان لیا کرتے تھے۔ پاکستان بنا۔ گورنر جنرل کا عہدہ انہوں نے لیا اور کہا، میں کوئی ''ربر سٹمپ'' گورنر جنرل بننا نہیں چاہتا۔ اس لیے 1935ء کے ایکٹ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ کابینہ کے اجلاس کی صدارت وہی کرتے تھے، لیاقت علی خاں نہیں کرتے تھے، حالانکہ وزیر اعظم وہ تھے۔ سرحد کی اسمبلی انہوں نے منسوخ کرائی۔ ایوب کھوڑو کو سندھ کی وزارت اعلیٰ سے ہٹایا۔ گورنر جنرل بھی تھے۔ وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ آئین ساز اسمبلی کے صدر بھی وہی تھے۔ یہ تینوں عہدے ان کے پاس تھے۔ یہ صحیح ہے' ان کا مزاج جمہوری نہیں تھا۔ بہت حد تک آمرانہ جذبات ان کے ہاں تھے۔

☆ دور اندیشی کسی لیڈر کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ کیا محمد علی جناح میں یہ خصوصیت تھی؟

■ دور اندیشی یا دور رسی بالکل نہیں تھی۔ مسلم پاکستان بننے کے بعد یہ اندازہ نہیں تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں نقل مکانی ہوگی۔ مہاجرین کو کیسے سنبھالا جائے گا؟ دستور کیسا ہونا چاہیے؟ ان بعد کے نتائج کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔

☆ محمد علی جناح کی زندگی کے بنیادی اصول کیا تھے؟

■ بنیادی کچھ اصول تھے۔ ایماندار تھے۔ وقت کے پابند تھے۔ بات چیت کرنے کے اندر صاف گو تھے۔ یہ کچھ ان کی بڑی خصوصیات تھیں۔

☆ 1918ء میں محمد علی جناح کا پہلا اختلاف گاندھی سے اس بنا پر ہوا۔ گاندھی جنگ عظیم اول میں حکومت برطانیہ کی غیر مشروط مدد کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا، برطانیہ اس کے جواب میں ہندوستانیوں کو حق خود اختیاری دے دے گا۔ محمد علی جناح کا موقف تھا، برطانیہ حق خود اختیاری کا وعدہ کرے تو مدد کی جائے، ورنہ نہیں۔ کانگریس نے گاندھی کی پالیسی کی حمایت کی جس پر محمد علی جناح کانگریس سے ناراض ہو گئے۔ اس کے بعد وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے محمد علی جناح کو عشائیے پر بلایا۔ مسز بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کہتے

ہیں، وائسرائے نے اس دوران محمد علی جناح کو بعض پیشکشیں کیں۔ اس کے بعد محمد علی جناح کا رویہ حکومت کے حوالے سے بالکل تبدیل ہو گیا۔ کیا اس سے ان کی ایمانداری مشکوک نہیں ہوتی؟

■ پیشکش جناح صاحب کو بھی میرے خیال سے نہیں کی گئی۔ میں نے نہیں پڑھا۔ ویسے یہ ہو سکتا ہے کہ برطانوی حکومت نے اس بات کی کوشش کی ہو کہ ان کو خریدا جائے یا ان کو اپنی حمایت میں لیا جائے۔ لیکن اس سے ان کی شخصیت پر حرف نہیں آتا، کیونکہ انہوں نے اس کو مسترد کر دیا تھا۔

☆ لارڈ چیمسفورڈ کے ساتھ ملاقات سے پہلے محمد علی جناح کا رویہ حکومت کے حوالے سے جارحانہ رہا۔ جنگ پالیسی پر ان کے موقف سے بھی ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک دو تقریروں کے اقتباس گوش گزار کرتا ہوں۔ 30 جولائی 1917ء کو بمبئی میں ہوم رول لیگ کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''میری آواز فضاؤں کو چیر کر شملے کی بلندی تک پہنچ جائے گی، جہاں وائسرائے دیدہ دانستہ ایسے وقت پر چپ سادھے بیٹھا ہے، جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کی لہریں لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر کر چکی ہیں''۔

30 دسمبر 1917ء کو کلکتہ میں مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کے دوران کہا:

''برطانوی حکومت خودمختاری کے وعدہ کو اپنی مرضی یا صرف وہم و گمان پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی قانونی ضمانت فراہم کرے اور اس ضمانت میں وقت کا تعین بھی کر دے۔ میں خاص طور سے اپنے مسلمان دوستوں سے مخاطب ہوں۔ کیا آپ یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستان کا ہندو حکومت میں تبدیل ہو جانا ممکنات میں سے ہے؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ حکومت صرف بیلٹ باکسز کی بنیاد پر چلائی جا سکتی ہے؟ یہ آپ اس لیے سوچتے ہیں کہ ہندو اکثریت میں ہیں اور اس لیے مقننہ میں اپنی مرضی چلا کر معاملہ ختم کر دیں گے۔ مگر کیا جس معاملے پر 7 کروڑ مسلمان متفق نہ ہوں صرف بیلٹ باکسز کی بنیاد پر وہ قانون تمام ملک میں جاری و ساری کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ ہندو مبصرین بھی خودمختاری ملنے کے بعد اپنی گزشتہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اور باشعور ہونے کے باوجود حکومت کے معاملات میں صرف بیلٹ باکسز ہی کو بنیاد ٹھہرائیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر ڈر اور خوف کس بات کا؟ اس لیے میں آپ مسلمان دوستوں سے کہتا ہوں کہ آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ صرف ایک شیطانی ہیولا ہے جسے آپ کے دشمنوں نے آپ کو خوفزدہ کرنے کے لیے آپ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ تاکہ آپ ہندوؤں کے اتحاد سے ہمیشہ خوفزدہ رہیں، جو کہ خودمختار حکومت بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ حکومت ہندوؤں کو چلانے کے لیے نہ دی جائے تو مجھے

اسی جذبہ کے ساتھ کہنے دیجئے کہ اسے مسلمان بھی نہیں چلا سکتے اور انگریز تو قطعی نہیں۔
دراصل یہاں کے اصل حکمران یہاں کے عوام ہیں۔ جو اس سرزمین کے بیٹے ہیں"۔

چیمسفورڈ کے ساتھ ملاقات کے بعد محمد علی جناح میں فوری تبدیلی یہ آتی ہے، وہ کانگریس کی پالیسی کے مطابق جنگ کے دوران حکومت کی حمایت پر تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسری ان میں حکومت کے حوالے سے جارحیت ختم ہو جاتی ہے۔

10 جون 1918ء کو ممبئی ٹاؤن ہال میں گورنر ولنگڈن کی زیر صدارت صوبائی جنگی کانفرنس ہوتی ہے۔ کانفرنس میں قرارداد پیش کی جاتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے، ہندوستانی جرمنی کے خلاف برطانیہ اور اتحادیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ولنگڈن قرارداد فوراً منظور کر لیتے ہیں۔ محمد علی جناح کے ہوم رول لیگ کے سینئر رہنما بی جے تلک قرارداد میں ترمیم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ولنگڈن اجازت نہیں دیتے۔ تلک اور دوسرے ہوم رول لیگ کے لیڈر کانفرنس سے واک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ محمد علی جناح ہوم رول لیگ کے صوبائی صدر ہونے کے باوجود مرکزی رہنماؤں کے ساتھ واک آؤٹ نہیں کرتے، اور بیٹھے رہتے ہیں۔ بعد میں محمد علی جناح تقریر کرتے ہیں اور گورنر ولنگڈن کی طرف سے قرارداد میں ترمیم کی اجازت نہ دینے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "لارڈ نے قرارداد میں ترمیم پیش کرنے کی اجازت نہ دے کر جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کی نظیر موجود نہیں۔ تاہم میں کانفرنس کے صدر کے فیصلے کا احترام کروں گا۔ خواہ اس کی قانونی اور آئینی حیثیت سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو"۔

8 جولائی 1918ء کو مونٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ جس پر کانگریس کا موقف بڑا محتاط ہوتا ہے اور ہوم رول لیگ کا موقف کافی سخت ہوتا ہے۔ 7 ستمبر 1918ء کو امپریل کونسل میں محمد علی جناح تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "میں صاف صاف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنے ان ہم وطنوں کا سخت مخالف ہوں جو ملک کے امن میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں اور حکومت کی بنیادیں ہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کوششوں کی مذمت کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ گڑبڑ پھیلا رہے ہیں وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ ملک اور قوم کے بدترین دشمن ہیں۔ یہ میرا حق ہے کہ میں حکومت پر سخت اور بے لاگ تنقید کروں لیکن دوسری طرف ہر تعلیم یافتہ شہری کا یہ فرض ہے کہ جب حکومت حق پر ہو تو اس کی اعانت وحمایت کرے"۔

محمد علی جناح میں ان تبدیلیوں کا کیا سبب تھا؟

■ میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

☆ محمد علی جناح جب عارضی مجسٹریٹ بنے تھے۔ اس وقت ان کے حالات مایوس کن تھے۔ وکالت نہ چلتی تھی۔ ان کی سماجی حیثیت ایک مقروض شخص کی تھی جس کے پاس ذاتی گھر تھا اور نہ دفتر۔ وہ جس دفتر میں کام کرتے تھے اس سے، جس ہوٹل میں رہتے تھے اس تک کا طویل سفر وہ پیدل کرتے تھے۔ ان تلخ حالات نے محمد علی جناح کے مزاج پر بھی اثر ڈالا تھا اور ان میں چڑ چڑا پن آ گیا تھا جو قریباً زندگی بھر ان کے ساتھ رہا۔ اس حالت میں ایک پارسی بزرگ وکیل نے ان سے ہمدردی کی اور انگریز ایڈووکیٹ جنرل میکفرسن سے ملاقات کرادی۔ جن کی سفارش پر محمد علی جناح کو تین ماہ کے لیے عارضی مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں محمد علی جناح کو مزید تین ماہ کے لیے عارضی مجسٹریٹ رہنے کا موقع مل گیا، لیکن ان چھ ماہ میں محمد علی جناح نے جو کچھ کمایا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے انہوں نے اپنا سارا قرض اتار دیا۔ گاڑی خرید لی۔ بہن کو اچھے سکول میں داخل کرا دیا۔ اپنا الگ دفتر بنایا جس میں بہترین فرنیچر ڈالا۔ اس سب کچھ کے باوجود نہ صرف کچھ رقم بچا بھی لی بلکہ آئندہ ملازمت جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔ سوال یہ ہے محمد علی جناح کی تنخواہ کتنی تھی؟ اور کیا یہ ساری تبدیلیاں تنخواہ کی رقم سے ممکن تھیں؟

■ اس بارے میں کہنا مشکل ہے کیونکہ میرے پاس کوئی شہادت نہیں ہے، لیکن آپ کا سوال غور طلب ہے۔

☆ 1906ء میں سیاست شروع کرتے وقت محمد علی جناح آسودہ تھے، لیکن زیادہ دولت نہیں تھی۔ مئی 1939ء میں انہوں نے وصیت نامہ لکھوایا اور دولت اپنی بہن کے نام کرائی تو وہ اچھی خاصی دولت تھی۔ اسی طرح 1948ء میں جب محمد علی جناح کی وفات ہوئی تو ان کی دولت کروڑوں میں پہنچ چکی تھی۔ بظاہر سیاسی مصروفیات کے سبب وہ وکالت یا کاروبار نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی دولت اپنی بہن کے نام کرانے کی ضرورت محسوس کی اگرچہ عام سیاستدانوں کی طرح ان کی کرپشن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، لیکن کیا ان پر کرپشن کا شبہ نہیں کیا جا سکتا؟

■ آپ کی بات صحیح ہے۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دولت وکالت میں اور شیئرز میں پیسہ لگا کر کمائی لیکن اس سلسلہ میں تحقیق کی ضرورت ہے، مثلاً وہ کتنا انکم ٹیکس دیتے تھے؟ اور کس طرح سے انہوں نے پورے ہندوستان میں جائیدادیں خریدیں؟ ان سوالات پر تحقیق دلچسپ ہوگی۔

☆ دوقومی نظریہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

■ دوقومی نظریہ کے بارے میں بہت سی رائیں ہیں۔ ہمارے ہاں دوقومی نظریہ کی ابتدا سر سید احمد خان سے کی جاتی ہے، لیکن اگر آپ دیکھیں تو خود ہندوؤں کے اندر بھی ہندو مہا سبھا کا جو نظریہ ہے وہ اسی طرح سے ہے جس طرح سے دوقومی نظریہ۔ ان کا لیڈر ساورکر کہتا ہے کہ ہندوؤں کی جنم بھومی اور ہندوؤں کا مذہب

ہندوستان میں نہیں ہے تو ہندوستانی بھی نہیں ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں یا عیسائیوں کو بھی ہندوستانی قرار نہیں دیتا۔

☆ کہتے ہیں، ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ، دونوں کو خود انگریزوں نے بنوایا تھا؟

■ آپ جانتے ہیں کہ اندرون خانہ بہت سی چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ لوگ بھی ایسے ہوتے ہیں جن کے مفادات اس طرح سے ہوتے ہیں۔ اس طرح اس قسم کی باتیں چلتی رہتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دوقومی نظریہ وہیں سے چلا۔ بات دراصل یہ ہے انگریزوں نے آنے کے بعد ہندوستان کو کمیونٹیز میں تقسیم کیا تھا۔ ہندو کمیونٹی، مسلم کمیونٹی۔ پہلے یہ مسلم کمیونٹی تھی۔ بعد میں اقلیت بن گئی اور اقلیت سے پھر یہ قوم بن گئی۔ تو یہ پورا ایک سفر ہے ابتدا میں کمیونٹی، کمیونٹی سے اقلیت اور اقلیت سے قوم۔ 1940ء میں کہا گیا کہ مسلم قوم۔ دیکھا جائے تو ہندوؤں کے اندر بھی بہت سے فرقے ہیں اور مسلمانوں کے اندر بھی ہیں، جن کے آپس میں اختلافات ہیں۔ یہ کہ ٹھوس قسم کی ہندو قوم ہے یا مسلمان قوم ہے، یہ تصور ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔

☆ آپ کیا سمجھتے ہیں پاکستان بننا کارنامہ تھا یا یہ غلطی تھی؟

■ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ یہ غلطی تھی۔ موجودہ حالات میں ہی اگر ہم دیکھیں تو مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ پاکستان، بنگلا دیش اور بھارت۔ ہندوستان اگر ایک ملک رہتا تو مسلمان متحد ہوتے۔ اس طرح وہ اپنے مطالبات کو منوا سکتے تھے۔ دوسرا پاکستان جن علاقوں میں بنا، یہاں تو پہلے ہی مسلمان اکثریت میں تھے۔ خطرہ تھا تو وہ اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کو تھا جن کو پاکستان بننے سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوا ہے، چونکہ وہ کمزور ہوئے ہیں۔ پھر جب پاکستان بن گیا تھا تو اسے بہتر طریقے سے چلنا چاہیے تھا جو ہم نہیں چلا سکے۔

☆1930ء میں ڈاکٹر محمد اقبال نے الٰہ آباد میں خطاب کیا۔ کہتے ہیں اس خطاب میں انہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا؟

■ اس میں انہوں نے دونوں باتیں کہی تھیں، یعنی ہندوستان کے اندر یا باہر مسلمانوں کا ملک بنانا چاہیے۔

☆ اس وقت ڈاکٹر محمد اقبال کا مکمل خطاب تحریری طور پر میرے پاس ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے:

> ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو، ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل بالآخر مسلمانوں، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی''۔

یعنی ہندوستان نہیں بلکہ سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل

کی بات ہے۔ مزید آگے اور زیادہ واضح ہے:

''اس جیتے جاگتے ملک میں اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔ مسلمانان ہند کے اس سب سے جاندار حصے کی مرکزیت کی بدولت کہ جس نے حکومت برطانیہ کی شدید ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس کی خدمات انجام دے کر برطانوی راج کو ممکن بنایا۔ بالآخر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں، چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔''

اس میں ہندوستان کی تقسیم کی بات نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ 1931ء میں چودھری رحمت علی نے لندن میں پاکستان تحریک شروع کی۔ اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے، انہوں نے انگریزوں کے اشارہ پر یہ کیا۔ بہرصورت انہوں نے جو پمفلٹ شائع کیا، اس میں لکھا:

''علامہ اقبال نے شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو آل انڈیا فیڈریشن کا ایک یونٹ بنانے کی بات کی تھی۔ لیکن ہماری تجویز یہ ہے کہ ان مسلم علاقوں کی الگ فیڈریشن بنائی جائے''۔

یعنی ڈاکٹر محمد اقبال سے منسوب تقسیم ہند کی بات کی نفی کی گئی۔

اس کے علاوہ خود ڈاکٹر محمد اقبال کا 4 مارچ 1934ء کا خط ہے جو انہوں نے ای جے ٹامسن نامی انگریز کو لکھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے خطبہ میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے بارے میں تھی جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا۔ میری سکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا''۔

کیا ان سارے حوالوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے پاکستان یا تقسیم ہند کا تصور نہیں دیا تھا، بلکہ وہ اس کے خلاف تھے؟

■ نصابی کتب کے ذریعے ہمارے تعلیمی اداروں میں جو پڑھایا جا رہا ہے اس میں یہی ہے کہ

ہندوستان کے اندر یا ہندوستان سے باہر، ایک ملک بنانے کی بات ہے، ورنہ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کے لیے زیادہ اختیارات کی بات کی تھی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ انہوں نے بعد میں اس خطبہ میں اضافہ کیا ہے یا اس طرح سے تبدیلی کی گئی ہے۔ صحیح بات ہے۔ ای جے ٹامسن کو ڈاکٹر اقبال نے جو خط لکھا اس میں بھی انہوں نے یہی لکھا کہ میرا پاکستان سکیم سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ جمہوریت کے بارے میں بھی انہوں نے لکھا کہ میرا جمہوریت سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ آپ میرے خیالات جانتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے شمال مغربی مسلم آبادی کے بارے میں جو تجویز پیش کی اس میں انہوں نے بنگال کو نظر انداز کیا اور بنگال کو اس تجویز میں شامل نہیں کیا تھا۔

☆ ؟ایک شعر بھی ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

آپ نے نصابی کتب کی جس طرح سے بات کی، کیا یہ نئی نسل کے ساتھ زیادتی نہیں ہے کہ اس پر بنا بنایا مفروضہ ٹھونس دیا جائے؟

■ ریاست نے جب تعلیم کو اپنی سرپرستی میں لیا تو خاص طور سے نصابی کتب کے ذریعے وہی پڑھایا ہے جو اس کے مفاد میں ہے۔ اب پوری تاریخ کو مسخ کر کے پڑھایا جا رہا ہے اس لیے بچوں کو پاکستان کی تاریخ کا پتہ ہے نہ ماضی کی تاریخ کا کچھ علم ہے۔ اسی لیے ہماری نوجوان نسل کے ذہن بگڑ رہے ہیں۔

☆ کہتے ہیں، سید احمد خان ان مسلمانوں میں تھے جو مغلوں کی بادشاہت کے حق میں تھے۔ جب مغلوں کی بادشاہت زوال پذیر ہوئی تو وہ انگریزوں کی حکومت تسلیم کرنے پر تیار ہو گئے، لیکن ہندوؤں کی نہیں۔ 1857ء کی لڑائی میں انہوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کے الفاظ بھی ہیں:

> ''مسلمانوں کا مذہبی فرض یہ تھا کہ 1857ء کے ہنگامہ میں انگریزوں سے بھرپور تعاون کرتے، کیونکہ مذہبی اعتبار سے انگریز عیسائی ہیں، اس لحاظ سے اہل کتاب اور مسلمانوں کے بھائی بند ہیں۔ نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ خدا کے دیئے ہوئے احکامات اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اسلام بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ جہاں عیسائیوں کا خون گرتا، وہیں مسلمانوں کا خون گرنا چاہئے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا، اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو ہر ایک رعیت پر واجب ہے، اپنے مذہب کے بھی برخلاف کام کیا۔''

سید احمد خاں کی ہندوؤں بارے مثبت سوچ نہ ہونے کا کیا سبب تھا؟

■ ہندوؤں کے بارے میں منفی سوچ نہیں تھی۔ انگریزوں کے ساتھ تعاون کی وہ بات کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ مذہبی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی زور دیتے تھے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا ساتھ دینا چاہئے لیکن جیسا کہ یو پی کا کلچر تھا، وہاں ہندو اور مسلمان مشترک طور پر رہتے تھے۔ خود سرسید کے بہت سے ہندو دوست تھے۔ صرف 1867ء میں جب اردو ہندی جھگڑا ہوا تو اس جھگڑے نے سرسید کو پریشان کیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ آئندہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

☆ اُردو ہندی جھگڑا 1867ء میں ہوا۔ سید احمد خان کے کلمات جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں، کیا وہ 1857ء کی لڑائی کے فوری بعد کے نہیں؟

■ دراصل اب سرسید کی خواہش یہ تھی کہ مسلم اشرافیہ جو ہے، عوام نہیں، مسلم اشرافیہ کو کیسے اس کا پرانا مقام ملے۔ دیکھا جائے تو ان کا تعلق ذہنی طور پر مسلم اشرافیہ سے تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اشرافیہ کی ہی بات کی ہے۔ انگریزی اگر پڑھنا چاہئے تو صرف مسلم اشرافیہ کو، عام لوگوں کو نہیں۔ یہ ان کا نقطہ نظر تھا۔ دہلی میں ان کو ایک دفعہ ایک مدرسہ میں بلایا گیا۔ وہاں صدر مجلس نے کہا کہ ہم بچوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اس پر جب سرسید نے تقریر کی تو کہا، مجھے افسوس ہوا، آپ ان بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں۔ انگریزی پڑھنا صرف اشراف کے بچوں کا کام ہے۔ علی گڑھ سکول بھی کھولا گیا تو وہ بھی صرف اشراف کے بچوں کے لئے کھولا گیا۔ عام بچوں کے لئے نہیں تھا۔

☆ ہندوستان کو کس طرح توڑا گیا۔ کیا انگریزوں کی اس میں ذاتی دلچسپی تھی، یا مسلم لیگ کی حقیقی جدوجہد تھی؟

■ اب اس پر ٹرانسفر آف پاور (transfer of power) چھپ چکی ہیں۔ کچھ لوگوں کی ڈائریز اور پیپرز بھی سامنے آ رہے ہیں۔ کافی سوالات ہیں کہ پاکستان کو بنوانے یا اس تقسیم میں انگریزوں کا کتنا ہاتھ ہے، یعنی پاکستان انگریزوں کی وجہ سے بنا تھا یا یہ کوئی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ سوالات ہیں جو شاید آگے چل کر حل ہوں۔ انگریزوں کی اس میں دخل اندازی یا وہ چاہتے تھے کہ جانے سے پہلے ہندوستان تقسیم کر دیں، اس کی بہت سے لوگوں نے وضاحتیں کی ہیں اور تشریحات بھی کی ہیں۔ تو یہ نکتہ نظر جو آپ نے دیا ہے، صحیح ہے۔ اور بھی نکتہ ہائے نظر ہیں۔ تو ان سوالات کو ابھی حل ہونے کی ضرورت ہے۔

☆ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کے بعد پنجاب اور بنگال کے نمائندوں سے ان صوبوں کی تقسیم اور ہندوستان یا پاکستان میں کسی کے ساتھ شامل ہونے بارے رائے لی گئی، لیکن سرحد سے رائے نہیں لی گئی۔ اس کا کیا سبب تھا؟

■ وہاں غفار خاں تھے۔ ان کی پارٹی بڑی مضبوط تھی اور کانگریس کی حمایت اس صوبے کے اندر بہت زیادہ تھی۔ اس لئے وہاں پر اس چیز کو نہیں اپنایا گیا۔ آگے چل کر وہاں ریفرنڈم ہوا، اور ریفرنڈم میں چونکہ غفار

خان اوراس کی پارٹی نے حصہ نہیں لیا۔اس لئے وہاں ایک ہی رائے تھی جس نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا،لیکن اس سے پہلے جو ڈاکٹر صاحب کی حکومت تھی، وہ کانگریس کی حکومت تھی۔ یہ بات صحیح ہے کہ پاکستان بننے یا تقسیم کے عمل کو اگر دیکھیں تو اس میں بہت غلطیاں اور قابل اعتراض چیزیں نظر آئیں گی۔ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے، پنجاب اور بنگال کی تقسیم، جو کہ مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ یہ ساری چیزیں ہیں۔ان سے ایسا نظر آتا ہے کہ آخر دور میں برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے طور سے پاکستان بنانے کا فیصلہ کریں اور اپنے طور سے یہ فیصلہ کریں کہ یہ کس علاقے میں قائم ہو اور اس کی کیا سرحدیں ہوں۔

☆ گینز بک آف دی ورلڈ ریکارڈ میں گاندھی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان کو سراہا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے ایک ہیرو کا کردار ادا کیا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ گاندھی نے آزادی کی جدوجہد انگریزوں کے خلاف کی۔اس کے برعکس محمد علی جناح کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟

■ دراصل گاندھی کا تعلق نہ صرف ایک سیاسی لیڈر سے ہے، بلکہ ان کا جو عدم تشدد کا فلسفہ تھا، اس نے بھی یورپ کے لوگوں کو، خاص طور پر دانشوروں کو بہت متاثر کیا۔ان کی طرز زندگی، سادگی بہت پسند کی جاتی تھی۔ پھر یہ کہ انہوں نے جس طریقے سے ستیہ گرہ، بھوک ہڑتال یا مرن برت شروع کیا، تو یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جو میڈیا کو بڑی متاثر کرتی تھیں۔اس کے مقابلے میں جناح صاحب نہ تو عوامی لیڈر تھے۔نہ ہی میڈیا کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ان کی زندگی بھی ایسی نہیں تھی کہ جو میڈیا کو متاثر کرتی۔ایک لحاظ سے وہ خود یورپین تھے تو یورپ کو کیا متاثر کرتے؟ گاندھی نے اپنے آپ کو بالکل انڈین بنایا تو ان کی شخصیت دلچسپی کا باعث بنی۔ جناح صاحب کا کوئی سیاسی نظریہ بھی نہیں تھا۔

☆1789ء میں امریکہ کی مختلف ریاستوں کے باشندوں نے ملک ترتیب دیا تھا وہ امریکی آج پوری دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ سوویت یونین بنی جو ایک بڑی طاقت تھی، وہ 1989ء میں ٹوٹ گئی اور اب پھر متحد ہونے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یورپ میں بے شمار جنگیں ہوئیں۔ وہ بھی اب قریباً متحد ہو چکے ہیں۔ جنوبی اور شمالی کوریا میں اتحاد کی کوششیں جاری ہیں۔ برصغیر 1947ء میں تقسیم ہوا۔اب انڈیا اور پاکستان میں بہتر تعلقات کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ برصغیر کے لوگ خاص طور سے انڈین اور پاکستانی متحد ہو جائیں گے یا ان لوگوں کا شعور ابھی اس قابل نہیں؟

■ اس کی سب سے پہلی مثال تو یورپ کی ہے۔ یورپ نے اتنی جنگیں لڑی ہیں کہ خاص طور سے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد انہوں نے سبق لیا اور فیصلہ کیا کہ اب یورپ میں جنگ نہیں لڑی جائے گی۔اس کے لئے یورپی یونین بنی ہے۔ یہ اس کی ایک مثال ہے۔تو یہ شعور کی بات ہے۔ وہ شعوری طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کے معاشی مفادات اور سیاسی اور سماجی مفادات ایک ہونے چاہئیں۔ ہمارے ہاں یہ ہے، ہم

شعوری طور پر بہت پسماندہ ہیں۔ ابھی تک ہم اپنے مسائل کا حل شعوری طور پر تلاش کرنے کے قابل نہیں ہو سکے۔ اگر شعوری کوششیں ہوں اور ہم ذہنی پسماندگی سے نکل کر سوچیں تو میرا خیال ہے ساؤتھ ایشیا کا جو پورا خطہ ہے اس کے مفاد میں ہے کہ آپس میں متحد ہوں۔ یعنی ملک الگ رہیں۔ خودمختاری رہے، جیسا کہ یورپ میں ہے، لیکن جس طرح سے وہ سماجی طور پر ملے ہیں، سیاسی طور پر اور تہذیبی طور پر ملے ہیں، وہ سب میرے خیال میں ہمارے لئے انتہائی ضروری ہے۔

(کتاب ''برصغیر کیسے ٹوٹا'' کے لئے انٹرویو)



جاگیردار عوامی نمائندوں نے ووٹ کو کبھی اہمیت نہیں دی ہے

انٹرویو: حسین خادم

تاریخ کا درست اور تحقیقی تناظر پیش کرنے والے محققین نے ہمیشہ ریاست کے نقطہ نظر کی نفی کی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے ایک ایسے ہی مؤرخ ہیں۔ انہوں نے گزشتہ ربع صدی کے دوران اپنی تحریروں کے ذریعے پاکستان میں تاریخ نویسی کو اہم ترین شعبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ وہ سہ ماہی جریدے ''تاریخ'' کے مدیر اور ہسٹری کانفرنس کے بانی ہیں۔ انہوں نے نئے اذہان اور نئی نسل کو ماضی کے تلخ حقائق سے متعارف کرایا ہے۔ وہ پاکستان میں تاریخ نویسی کے مستقبل سے پُرامید ہیں۔ ''ہم شہری'' نے ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ خصوصی انٹرویو کیا، جس کی تفصیل قارئین کی نذر ہے۔

ہم شہری: اپنے بچپن کی یادیں قارئین کے لئے بتائیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اپریل 1941ء میں راجستھان کے ضلع ٹونک میں پیدا ہوا۔ اُردو زبان کے معروف شاعر اختر شیرانی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ 1952ء میں ہجرت کر کے حیدرآباد سندھ آ گئے۔ 1963ء میں سندھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹرز کیا۔ بعدازاں جرمنی کی RUHR یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ 1976ء میں وطن واپسی ہوئی اور سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ 1989ء میں لاہور آنا ہوا جہاں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ جرمنی کے اس ثقافتی ادارے سے پانچ برس تک وابستہ رہا۔ نیشنل کالج آف آرٹس (این سی اے) میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر پڑھاتا رہا ہوں۔

ہم شہری: تحریر و تحقیق کی پُرخار وادی میں کب داخل ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میری اولین کتاب 1982ء میں ''تاریخ کیا ہے؟'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ 1999ء میں سہ ماہی جریدے ''تاریخ'' کا اجراء کیا۔ اس کے اب تک 37 شمارے آ چکے ہیں۔ اسی برس تاریخ کے موضوع پر کانفرنسز شروع کیں۔ آخری کانفرنس 1857ء کی تحریک آزادی کے تناظر میں منعقد کی، جس میں محققین اور مؤرخین کی بڑی تعداد شریک ہوئی تھی۔ 60 کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی

کے مؤقر اخبار ''ڈان'' اور روزنامہ ''وقت'' میں کالم لکھتا ہوں۔

ہم شہری: آپ نے بچوں کے لئے تاریخ کی کئی ایک کتابیں لکھی ہیں، اس حوالے سے کچھ بتائیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی بالکل! بچوں کے لئے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ اس حوالے سے ''تہذیب کی کہانی'' اور ہندوستان کے حوالے سے مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کو اپنی تاریخ کے بارے میں آگاہ ہونا چاہئے۔

ہم شہری: اولین انسپائریشن کیا تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: بچپن میں مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ تب ہی قلم سے رشتہ استوار ہوا۔ تاریخ کا مضمون دلچسپ اور مؤثر ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کے طرزِ فکر میں تبدیلی لانے کے علاوہ سیاسی و سماجی شعور بیدار کیا جاسکتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر مؤرخ بننے کو ترجیح دی۔

ہم شہری: پاکستان کا کوئی ایسا تاریخ دان جس نے متاثر کیا ہو؟

ڈاکٹر مبارک علی: جب میں نے تاریخ لکھنے کا آغاز کیا تو اُس وقت اس حوالے سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مؤرخ کو بہتر اور مناسب ملازمت کے حصول میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بیش تر تاریخ نویس شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے۔ اپنے اردگرد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے تاریخ کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہمارے معاشرے میں تاریخ کے مضمون کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی۔

ہم شہری: اس وقت پاکستان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے کیسا کام ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میری ذاتی رائے ہے کہ ہر شخص تاریخ کا مضمون پڑھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سماج میں مؤرخ موجود ہوں تاکہ لوگ اُن کی کاوش کو پڑھیں۔ پاکستان میں یہ روایت عام ہو چکی ہے کہ جو کتاب ایک بار لکھ دی جاتی ہے، وہ کئی کئی برس تک شائع ہوتی رہتی ہے۔ تقریباً ایک صدی قبل لطیف نے پنجاب کی تاریخ لکھی تھی جو آج تک پڑھی جارہی ہے۔ اس دوران کوئی نیا کام نہیں ہوا جبکہ پنجاب کی تاریخ ارتقاء پذیر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے ادارے قائم ہونے چاہئیں، جہاں تاریخ نویس آزادی کے ساتھ اپنا کام کرسکیں۔

ہم شہری: آپ نے اپنی کتابوں میں ہمیشہ ریاستی نقطہ نظر کی نفی کی ہے، کبھی مشکلات کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟

ڈاکٹر مبارک علی: کسی بھی مؤرخ کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ وہ روایات کا ساتھ دے اور پہلے سے قائم نظام کی حمایت کرے۔ یوں اسے ریاست کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا راستہ تنقید کا ہے۔ جب آپ اپنی تاریخ کا درست تناظر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو حکمران ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ

کو ملازمت نہیں ملتی اور سماج میں ملک دشمن کا تاثر اُبھرتا ہے۔ علم کو فروخت کرنے سے سب کچھ مل جاتا ہے لیکن جب آپ سچ کہتے ہیں تو تکالیف اُٹھانا پڑتی ہیں۔ بغاوت بپا کیے بغیر سماج میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ تاریخ کا درست تناظر پیش کرنے والا مؤرخ معاشرے کی ترقی چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں بیشتر محققین اور تاریخ نویس سمجھوتے کرتے ہیں۔ جس کے باعث لوگوں کی سوچ میں تبدیلی نہیں آرہی۔ بہت کم لوگ تحقیق کا راستہ اپناتے ہیں۔ نیتجتاً انہیں ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ میں نے ریاستی تاریخ کو بیان کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ پاکستان میں تاریخ کے مضمون کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ حکمران چاہتے تھے کہ حقائق کو دانستہ طور پر، توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ ان کے مصنوعی نظریات سے مطابقت رکھنے لگیں۔ یہ درست ہے کہ مجھے مشکل حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ ابتداء میں صورتحال قدرے بہتر تھی۔ اُس وقت میں سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے اُستاد کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔ سندھ کا ماحول ملک کے دوسرے صوبوں کی نسبت سیکولر ہے لہٰذا زیادہ پابندیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگرچہ ضیاء الحق کا دور آمریت تھا لیکن مناسب اسلوب میں سچ بیان کیا جاسکتا تھا۔

ہم شہری: وہ کون سے مؤرخین ہیں جنہوں نے ریاستی نقطہ نظر کو بیان کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی: انتظامیہ کے حامی مؤرخین نے تاریخ کو مکمل طور پر مسخ اور غیر متوازن کر دیا ہے۔ ایس ایم اکرام، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور معین الحق نے تاریخ کو جنرل ایوب کی منشاء کے مطابق لکھا ہے۔ ان کی تحقیق کی بنیاد مفروضوں پر قائم ہے۔ تاریخ کے بیشتر اساتذہ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ وہ ریاست کو چیلنج کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ بیرونی یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں لیکن اُن کی تحقیق انگریزی میں ہوتی ہے۔ جس کے باعث بہت کم لوگ ان کے کام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم شہری: آپ کو انگریزی اور جرمن زبان پر عبور حاصل ہے، لیکن آپ نے اُردو میں کتابیں لکھیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے سامنے دو راستے تھے۔ میں انگریزی یا جرمن زبان میں تاریخ لکھتا اور عالمی شہرت حاصل کرتا یا اُردو زبان کو ذریعہ اظہار بناتا اور عام لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتا۔ میں نے سوچ سمجھ کر اُردو کا انتخاب کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تحریروں کا عام لوگوں پر اثر ہوا ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں میری کتابوں کو ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے اور دو نسلیں ان سے متاثر ہوئی ہیں۔ اب لوگ بہت ساری باتیں کرنے لگے ہیں۔ شاید پنجاب میں میری تحقیق کو قبول عام حاصل نہیں ہوا لیکن سرائیکی بیلٹ میں اسے خاصی پذیرائی ملی ہے۔

ہم شہری: آپ کے نزدیک ایک تاریخ نویس کو کن سوالوں کا جواب تلاش کرنا چاہیئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں سمجھتا ہوں کہ ایک مؤرخ کو جاننا چاہیئے کہ قوموں کے عروج وزوال کی کیا وجہ

ہے؟ یورپ نے کیونکر ترقی کی ہے؟ انقلاب روس کی ناکامی کے پس پردہ کیا عوامل کارفرما رہے ہیں؟ امریکہ کی تاریخ کے بارے میں علم ہونا چاہئے کہ وہ سپر پاور کیسے بنا؟ آخر کیوں مسلمان پسماندگی کی دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں؟ تاریخ سے ان سوالوں کے جواب باآسانی مل سکتے ہیں۔ مؤرخ وہ ہے جو واقعات کا تجزیہ کرے۔ محض واقعات بیان کرنے سے تاریخ تشنہ رہ جاتی ہے اور وہ واقعاتی تاریخ بن جاتی ہے۔ جب تک تاریخ کو تجزیاتی طور پر نہیں لکھا جائے گا۔ ایک عام قاری کے لئے اُس میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوگی۔ تاریخ سبق نہیں سکھاتی بلکہ انسان کو اعتماد، شعور اور آگہی دیتی ہے۔ یوں وہ پس منظر سے آگاہ ہونے کے بعد بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔

ہم شہری: کیا پاکستان میں رائج تاریخ کے موجودہ نصاب سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، دراصل نصابی کتب ہمیشہ ریاستی سرپرستی میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کتابوں میں ریاست اپنی مرضی کا نقطہ نظر بیان کرتی ہے۔ انہوں نے پاکستان کو نظریاتی ریاست کہا۔ میری تحقیق کے مطابق دوقومی نظریے کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ نصابی کتابیں نان پروفیشنل لوگوں سے لکھوائی جاتی ہیں۔ بیوروکریسی خاکہ دے دیتی ہے کہ ایسے کتاب لکھی جائے گی جس کے باعث بچوں اور نوجوانوں کی تاریخ کے مضمون سے دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ نصاب میں محض واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس طرح سے ہم نوجوانوں کی تربیت نہیں کر رہے۔ محض وعظ کے ذریعے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ طالب علموں کو انصاف اور امن کے بارے میں بتانا ہوگا۔ انہیں مسخ شدہ حقائق بتائے گئے ہیں جس کے باعث انتہاپسندی پیدا ہو رہی ہے۔

ہم شہری: کیا آپ کو کبھی نصابی کتب لکھنے کی پیشکش ہوئی؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایسی پیشکش کبھی نہیں ہوئی۔ بچوں کے لئے کتابیں اپنی مرضی سے لکھی ہیں۔

ہم شہری: نظریہ پاکستان یا دوقومی نظریہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں کے دوران اس اصطلاح کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں جنرل شیر علی نے نظریہ پاکستان کو سیاسی شکل دی، جسے بعدازاں ضیاء الحق نے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔ اس نظریہ کی کوئی باقاعدہ شکل نہیں ہے۔ نواز شریف کے دورِ حکومت میں ایک قانون بنا جس کے تحت نظریہ پاکستان کو رَد کرنے پر دس برس کی سزا تفویض کی گئی تھی۔ اس قانون کے تحت اب تک کسی شخص کو سزا نہیں ملی۔ درحقیقت یہ قانون ترقی پسند دانشوروں کو ڈرانے کے لئے ہے تاکہ وہ حقائق بیان نہ کرسکیں۔

ہم شہری: تو کیا قیام پاکستان کے پس پردہ دوقومی نظریے کا کوئی کردار نہیں رہا؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں، ہندوستان کی تقسیم معاشی مفادات کا نتیجہ ہے۔ اترپردیش کا متوسط مسلمان طبقہ

یہ سمجھتا تھا کہ وہ ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح پنجاب اور سندھ کے جاگیردار بھی ہندوؤں کی بالادستی سے ڈرتے تھے۔ آزادی کے بعد ہم نے دیکھا کہ عام آدمی کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تقسیم کا ایک دوسرا مقصد پاکستان کو سرد جنگ میں روس کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ آنے والے برسوں میں ہم نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا اور آج تک یہی ہو رہا ہے۔ اگر تقسیم نہ ہوتی تو شاید ہندوستان سرد جنگ میں امریکہ کا ساتھ نہ دیتا۔

ہم شہری: کیا آپ کو مثال بناتے ہوئے نوجوان تاریخ نویسی کی جانب راغب ہو رہے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: نوجوان تاریخ کو بطور پروفیشن اپنانے سے گریزاں ہیں۔ وہ میری کتابیں پڑھتے ہیں۔ اگر میں کسی ادارے سے وابستہ ہوتا تو نوجوانوں سے لکھوانے کا کام کرتا۔ البتہ گزشتہ کچھ عرصہ کے دوران نوجوانوں کی تاریخ میں دلچسپی بڑھی ہے۔

ہم شہری: تو کیا مستقبل میں ہسٹری انسٹی ٹیوٹ بنانے کا ارادہ ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میری خواہش ہے کہ تاریخ نویسی کے احیاء کے لئے کوئی ادارہ بناؤں، جہاں لائبریری اور تحقیق کے لئے تمام سہولیات میسر ہوں لیکن ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے میرا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔ میں این جی او کی طرز پر انسٹی ٹیوٹ بنا سکتا ہوں لیکن اس طرح آزادی ختم ہونے کا احتمال رہے گا۔

ہم شہری: بھارت میں تاریخ نویسی کے حوالے سے کیسا کام ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بھارت میں تاریخ نویسی کے حوالے سے بہت زیادہ کام ہو رہا ہے۔ نوجوان نسل کی تاریخ کے موضوع میں دلچسپی بڑھی ہے۔ حال ہی میں بھارت میں نصابی کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن کا معیار عالمی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

ہم شہری: بھارت میں مختلف قومیتوں کے درمیان تصادم کی کیفیت ہمیشہ موجود رہی ہے، کیا ان حالات میں تاریخ کا درست تناظر پیش کیا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ سکھوں یا کسی دوسری قومیت پر تنقید کرو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود لوگ تاریخ نویسی کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں قوت برداشت پیدا ہوئی ہے۔ یہ درست ہے کہ بھارت میں بھی فرقہ وارانہ تاریخ لکھی جاتی ہے لیکن ان کے ترقی پسند مئورخین کی تعداد زیادہ ہے۔ 2 برس قبل بھارت میں 64 ویں تاریخ کانفرنس ہوئی تھی جس میں دنیا بھر سے چودہ سو مئورخین نے شرکت کی تھی۔ بھارت میں تاریخ مقبول ترین مضامین میں سے ایک ہے۔

ہم شہری: کیا ایک مئورخ غیر جانبدار رہتے ہوئے تحقیق کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بہت مشکل ہے۔ ہر آدمی کی اپنی پسند، ناپسند ہوتی ہے۔ البتہ کوشش رہتی ہے کہ واقعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے۔

ہم شہری: دنیا کی بڑی طاقتیں آج کل بدترین معاشی بحران سے دوچار ہیں، بطور تاریخ نویس آپ اس صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد منافع پر ہوتی ہے۔اس نظام میں اخلاقی قدروں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ملٹی نیشنلز کا کوئی ملک نہیں ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں پروڈکشن بہت زیادہ ہوتی ہے۔چنانچہ اگر خریدار نہ ہو تو صورتحال خراب ہو جاتی ہے۔امریکی سرمایہ دار کہتے ہیں کہ مارکیٹ آزاد ہونی چاہئے اور ریاست اُن کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ان حالات میں بینکوں نے گھر بنانے کے لئے لوگوں کو دھڑا دھڑ قرضے دیئے۔ بہت سارے لوگ قسطیں ادا نہیں کر سکے۔ نتیجتاً بنکوں نے گھر ضبط کر لئے لیکن پروڈکشن زیادہ ہونے کے باعث ان گھروں کا کوئی خریدار نہیں تھا۔جس کے باعث امریکی معیشت کا دیوالیہ نکل گیا۔اب وہ کہتے ہیں کہ ریاست اُن کی مدد کرے۔اگرچہ امریکہ میں فری مارکیٹ کی حمایت ختم نہیں ہوئی لیکن برطانیہ میں نیشنلائزیشن کے باعث وہ سوشلسٹ اکانومی کی جانب چلے گئے ہیں۔موجودہ معاشی بحران نے یورپی اور امریکی ماہرین معاشیات کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیپٹلزم کی موجودہ شکل مزید برقرار نہیں رہ سکے گی۔

ہم شہری: کیا سوشلسٹ معیشت متبادل نظام کے طور پر زیرِ غور آ سکتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہوسکتا ہے کہ سوشلسٹ اکانومی ایک نئی شکل میں سامنے آئے۔امریکہ اور یورپ میں مارکسزم کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام اپنی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ابتداء میں مرچنٹ سرمایہ دارانہ نظام تھا۔بعدازاں ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد صنعتی سرمایہ دارانہ نظام مضبوط ہوا، جس کی بنیاد صنعتی انقلاب پر رکھی گئی تھی۔اس وقت دنیا بھر میں فنانشل سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے۔موجودہ معاشی بحران کے بعد سرمایہ دارانہ نظام نئی شکل اختیار کرے گا۔وہ اپنے اس بحران کو حل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ماہرین قوموں کو بحرانوں سے نکال لیتے ہیں۔جہاں دانشورانہ روایات استوار نہیں ہوتیں، وہاں قومیں بحرانوں میں پھنس جاتی ہیں۔

ہم شہری: تاریخی تناظر میں بتائیے کہ پاکستان کے موجودہ بحرانوں کی اصل وجہ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں کبھی سیاسی نظام اور اداروں کو مضبوط نہیں ہونے دیا گیا۔1956ء میں دستور نافذ ہوا لیکن اُس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ملک میں کبھی جمہوری روایات مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں ہوسکیں۔فوج کا عمل دخل ختم ہوا تو جاگیردار سیاسی رہنما بن گئے۔پاکستان میں فوجی آمریت کے علاوہ جاگیردارانہ جمہوریت کا تسلط رہا ہے۔عام آدمی کو سیاسی عمل سے الگ کر کے جمہوریت کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ہمارے ملک میں کوئی ایک سیاسی رہنما ایسا نہیں ہے جسے ماہرین میں شمار کیا جاسکے۔انہوں نے خاندانی سیاست کو فروغ دے کر ووٹ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہے۔اقتدار میں

آنے کے بعد مراعات کو بڑھانے کی بات کی جاتی ہے۔اس وقت ملک اقتصادی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی بحرانوں کی لپیٹ میں ہے۔گزشتہ اکسٹھ برسوں کے دوران ہم ترقی کرنے کی بجائے پسماندہ ہوئے ہیں۔ بہت سارے باصلاحیت لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہر آدمی بیرون ملک جانا چاہتا ہے۔تارکین وطن کو ڈیپورٹ کرنے کی خبریں روز اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔وہ اچھی زندگی گزارنے کے خواب بنتے ہوئے بیرون ملک کا سفر اختیار کرتے ہیں۔جس ملک کے عوام اس کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں تو اُس صورت میں تمام امیدیں دم توڑ جاتی ہیں۔

ہم شہری: تاریخ کے علاوہ آپ کی دلچسپی کن موضوعات میں ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ادب، خاص طور پر فکشن میں دلچسپی رہی ہے۔اس کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ ادب تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔اچھا ادیب تاریخ کا ایک اہم ماخذ اور زمانے کا عکاس ہوتا ہے۔

ہم شہری: اس وقت دنیا میں کن موضوعات پر تاریخ لکھی جارہی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایک زمانے میں سیاست تاریخ پر حاوی تھی۔آج کل کلچرل ہسٹری پر توجہ دی جارہی ہے۔اس حوالے سے خواتین اور ماحولیات کی تاریخ لکھنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے جو خوش آئند امر ہے۔یہ جاننا اہم ہو چکا ہے کہ عام آدمی کا تاریخ میں کیا حصہ رہا ہے۔

ہم شہری: آپ کن موضوعات کو احاطہ تحریر میں لائے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: تہذیبوں اور ثقافتوں کی تاریخ کے حوالے سے خاصا کام کیا ہے۔خالص سیاسی تاریخ کبھی نہیں لکھی۔

ہم شہری: نوجوان قارئین اور مؤرخین کے نام کوئی پیغام؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ پڑھنے سے پہلے فلسفہ تاریخ ضرور پڑھیں تا کہ تاریخ نویسی کے بارے میں بنیادی باتوں کا علم ہو سکے۔

(ہفت روزہ ''ہم شہری'': 31اکتوبر تا 6 نومبر 2008ء)



میں نے عام آدمی کے لئے تاریخ لکھی

انٹرویو: خرم سہیل

ڈاکٹر مبارک علی ملک کے مایہ ناز مورخ ہیں جنہوں نے تاریخ کے صحیح رخ کو عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی۔ شعبہ تاریخ میں سیر حاصل تحقیق کی اور عام آدمی کی دلچسپی اور رہنمائی کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخ مرتب کی۔ لوگوں میں تاریخی شعور کو اجاگر کرنے کے لئے کانفرنسز کا انعقاد بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کے موضوع پر ان سے کی جانے والی گفتگو نذر قارئین ہے۔

آج کل: ایک عام سا خیال ہے کہ ہمارے ہاں جو تاریخ مرتب کی جاتی رہی ہے، وہ بغیر مورخ کے ہے، آپ کا اس حوالے سے کیا موقف ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بہت عرصہ پہلے جب پیپلز پارٹی کی ہی حکومت تھی اور فخر زمان اکادمی ادبیات کے سربراہ تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم پاکستان کی تاریخ لکھوانا چاہتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کس سے لکھوائیں گے؟ میں نے اُن کو یہ مشورہ دیا کہ ملک کی مختلف جامعات سے نوجوان طلباء کا انتخاب کریں، ان کی تربیت کریں۔ بے شک اس کے لئے آپ بیرون ممالک سے مورخ لے کر آئیں جو ان نوجوانوں کو تربیت دے سکیں، اس مرحلے کے ذریعے باقاعدہ مورخ پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں تاریخ لکھنے کا انداز بالکل تبدیل ہو گیا ہے لیکن ہمارے ہاں سیاسی استحکام نہیں۔ حکومتیں جلدی آتی اور چلی جاتی ہیں۔ طویل مدت کی پالیسیاں جاری نہیں رہتیں، کراچی سے لے کر پشاور تک جامعات میں شعبہ تاریخ میں اساتذہ موجود ہیں مگر مورخ کوئی نہیں۔

آج کل: مورخ کے کیا فرائض ہوتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: مورخ کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ تاریخی مواد کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ وہ تاریخ لکھنے کی تکنیک سے واقف ہوتا ہے۔ تاریخ ایک وسیع مضمون ہے، مثال کے طور پر کوئی قدیم ہندوستان پر لکھتا ہے تو کوئی اس وقت کی زبان کے بارے میں حقائق مرتب کرتا ہے۔ کوئی عہد وسطی کے عروج وزوال کے متعلق حالات رقم کرتا ہے۔ ان سب باتوں کو لکھنے کے لئے فارسی زبان پر عبور

حاصل ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں تاریخ کو اس رُخ سے کوئی دیکھتا نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں اس طرح تاریخ لکھنے کا رجحان ہے کہ آپ زبان سیکھ کر تاریخ پر کام کریں۔ اس وقت عہد وسطیٰ پر لکھنے والا کوئی نہیں، ہمارے لوگوں کا ایک ہی پرانا موضوع ''تحریک پاکستان'' ملا ہوا ہے۔ اسی موضوع پر طلبہ تحقیق کر کے ڈگری بھی لے لیتے ہیں اور حکومت بھی خوش رہتی ہے کہ تحقیقی کام ہو رہا ہے جبکہ اس موضوع میں کوئی نئی بات نہیں۔

آج کل: ایک اعتراض ہے کہ ''مارکسزم'' کا فلسفہ ابن خلدون کے فلسفے میں ہے، کیا یہ موقف درست ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نہیں! آپ کو میں دلچسپ بات بتاؤں، ابن خلدون پندرہویں صدی کا مورخ ہے۔ اس کو اپنے زمانے میں کسی نے نہیں پوچھا بلکہ اس کا ''مقدمہ ابن خلدون'' تو غائب ہو گیا تھا۔ اتنے حقیقی دانشور سے مسلمانوں نے کچھ نہیں سیکھا۔ پھر کہیں ایک طویل عرصے کے بعد ترکوں نے ابن خلدون کے فلسفے کو نئے سرے سے دریافت کیا، اس سے استفادہ کیا اور انہی کے ذریعے پھر ابن خلدون کا فلسفہ یورپ تک پہنچا۔ ابن خلدون کو نئے سرے سے دریافت کرنے کا ابتدائی کام ترکوں نے اور اس کے بعد تمام کام اہل یورپ نے کیا۔ مارکس ازم کی جڑیں وہاں سے نہیں نکلتیں، وہ الگ کام ہے البتہ ٹوائن بی نے جس طرز کی تاریخ لکھی، اس میں ابن خلدون کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اُس نے ایک طرح سے ابن خلدون کو خراج تحسین پیش کیا، اسی طرح ابن خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کے حوالے سے کچھ قوانین مرتب کئے۔ اسی خیال کو لے کر سپنگلر نے ''زوالِ مغرب'' لکھی لیکن اس نے کہیں اس بات کو تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ ٹوائن بی نے اپنی کتاب ''سٹڈی آف ہسٹری'' میں ابن خلدون کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: ''میں نے ابن خلدون سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' ابن خلدون پر بہت سے مورخین نے اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ کا عمل کسی قانون کے تحت نہیں ہوتا لہٰذا تاریخ کے عمل میں قوانین دریافت کرنا ممکن نہیں۔ آپ چند تاریخی واقعات کو لے کر تاریخ نہیں لکھ سکتے کیونکہ تاریخ کے بہت سے پہلوان واقعات کے علاوہ بھی ہیں۔ کال پاپر نے بھی ایک اعتراض کیا کہ آپ تاریخ کو ضابطوں کا پابند نہیں کر سکتے۔ ٹوائن بی کا یہ کہنا تھا کہ تہذیب کا یہ چیلنج ہوتا ہے کہ آپ اس کو لکھتے رہیں اور اس کا مقابلہ کرتے رہیں تو زوال کو روکا جا سکتا ہے۔ جبکہ کال پاپر کا موقف یہ تھا کہ زوال کو نہیں روکا جا سکتا کیونکہ ایک ہزار سال کی مدت میں تہذیبیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ کال پاپر کی کتاب جب شائع ہوئی تو مغرب میں بڑی کھلبلی مچی پھر ٹوائن بی نے یہ امید دلائی کہ تہذیب کو زوال آتا ہے مگر وہ ردِعمل کے طور پر اس چیلنج کا جواب دے کر زندہ رہتی ہے۔

آج کل: ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زوال کسی بھی انقلاب کا محرک بنتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایسا نہیں۔ ابن خلدون یہ کہتا ہے کہ کوئی تہذیب اسی انداز میں آگے بڑھتی ہے جس طرح انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ انسان کی زندگی میں بچپن، جوانی، بڑھاپا اور پھر موت ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی یہ سارے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ کچھ مفکرین کا یہ ماننا ہے کہ آپ قوانین کے دائرے میں رہ کر تاریخ کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہم اکثر مختلف قسم کی بحثیں پڑھتے ہیں کہ قوم پسماندہ کیوں ہے یا ہمیں کس طرح کے چیلنجز درپیش ہیں، دراصل ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہی قوم زوال پذیر ہوگی جس میں چیلنجز سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں۔

آج کل: ہمارے کچھ دانشور یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ عوام پر مہنگائی، بھوک، افلاک اور بے روزگاری میں اضافہ ہورہا ہے، یہ کسی نہ کسی انقلاب کا باعث بنے گا، کیا یہ درست ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: معاشرے کی پسماندگی اور اقتصادی بحالی سے انقلاب نہیں آیا کرتا، انقلاب کے لئے افکار اور خیالات بہت ضروری ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس طرح کی کوئی فضا نہیں، اس لئے انقلاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کے بدحال معاشروں میں صرف جرائم پنپتے ہیں، جن کی شرح میں ہمارے ہاں اضافہ ہورہا ہے۔ انقلاب کا مطلب ہے کہ آپ ایک نظام کو ختم کر کے دوسرا نظام لائیں، انقلاب ہوا سے نہیں آتا، اس کی بہترین مثال چین کا انقلاب ہے۔

آج کل: انقلابِ فرانس کے پیچھے ہم عوام کی بھوک اور افلاس دیکھتے ہیں جو انقلاب کا پیش خیمہ بنی، عوام کو روٹی نہیں ملی تو کیک کھانے کا مشورہ دیا گیا، کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ایک تو یہ بات اکثر انقلابِ فرانس کے تناظر میں کی جاتی ہے کہ ملکہ نے کہا اگر لوگوں کو کھانے کو روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے، جبکہ اُس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے، آپ جب کسی پر تنقید کرتے ہیں تو بہت سی فالتو باتیں بھی اُس سے منسوب کر دیتے ہیں۔ فرانس کے انقلاب کے پیچھے غربت متحرک نہیں تھی بلکہ یہ بورژوا انقلاب تھا۔ بورژوا جب فرانس میں کامیاب ہو گئے تو پھر انہوں نے انقلاب کو روکنا چاہا مگر عوام جب ایک مرتبہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ جب کسان اور مزدور طبقے نے حق کی آواز بلند کی تو ان کو مارا گیا، نپولین نے بہت لوگ مروائے۔ انقلابی تاریخوں میں طبقاتی کردار بھی بہت اہم ہے پھر انقلاب فرانس کے پیچھے کئی اشخاص کے افکار تھے جن میں مانٹسیکو، روسو، والٹیر وغیرہ شامل ہیں۔ اس تناظر میں اگر ہم اپنے معاشرے کو دیکھیں تو ہمارے ہاں شاعر اور افسانہ نگار تو ہیں مگر مورخ یا ماہر عمرانیات مشکل سے ہی ملے گا کیونکہ ان کو آپ پورے نظام سے باہر ہی رکھتے ہیں اور پھر ان کی تعداد بھی کم ہے۔ معاشرہ جب ذہنی طور پر آگے بڑھتا ہے تو وہ شاعری سے نثر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ نثر میں دلائل کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے، شاعری میں ہم اس طرح بات نہیں کر سکتے۔

آج کل: آپ کا موقف یہ ہے کہ شاعری صرف جمالیاتی احساس کی ترجمانی کا نام ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: شاعری صرف جذبات کو ابھارتی ہے، مثال کے طور پر فیض کی شاعری ہے، آپ پڑھتے ہیں، بہت لطف اٹھاتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ انقلاب چل رہا ہو تو شاعری مغنیہ ہو سکتی ہے مگر شاعری باعث انقلاب بنے، یہ ممکن نہیں۔

آج کل: آپ نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ علامہ اقبال کی اہمیت اپنی جگہ مگر ان کی شاعری سے کسی طرح کی انقلابی فکر بیدار نہیں ہوئی کیونکہ انقلاب شاعری کے بجائے خونی لہر کے ساتھ آتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی ہاں! جب بھی انقلاب آتا ہے تو وہ گزشتہ ڈھانچہ ختم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس متبادل کے طور پر ویسا ہی کوئی مستحکم نظام ہو۔ تمام انقلابات نے اپنے ماضی کو رَد کیا، اقبال کوئی انقلابی شاعر نہیں تھے، اُن کے ہاں بھی ہمیں بہت سے تضادات ملتے ہیں۔ اقبال بہت اچھے شاعر تھے، یہی ان کی خرابی تھی کہ وہ اچھے شاعر تھے کیونکہ اچھا شاعر جلدی گمراہ بھی کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری ابتدائی طور پر بہت اچھی قوم پرستانہ ہے مگر پھر آگے چل کر وہ بہت مذہبی اور انتہا پسندانہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات شدت پسندوں کو بہت اچھی لگتی ہے اور وہ پھر اقبال کو اپنی مرضی سے ہر جگہ کوڈ کرتے ہیں۔

آج کل: آپ کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابیں عام آدمی دلچسپی سے پڑھتا ہے مگر کچھ لوگوں کا اعتراض ہے کہ آپ اپنے کام کے ذریعے کوئی نظریاتی بنیاد قائم نہیں کر سکے جو آپ کا حوالہ بن سکے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے سامنے دو راستے تھے کہ میں پی ایچ ڈی کروں، انگریزی اور جرمن زبان میں لکھوں اور اکیڈمی سرکل میں زندگی گزاروں۔ پھر دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں عام آدمی کے لئے لکھوں اور میں نے اپنی زندگی دوسرے راستے پر گزاری ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے تاریخ کو عام آدمی کے لئے لکھا اور مجھے دانشوروں کو تاریخ پڑھوانے کا کوئی شوق بھی نہیں۔ عام آدمی تاریخ پڑھے گا تو وہ اپنے معاشرے کو سمجھ سکے گا لہٰذا میں نے یہی کام کیا مجھے شہرت کی بھی کوئی ہوس نہیں۔ میں نے شعوری طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھے عام آدمی کے لئے لکھنا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے کہ عام آدمی اس سے استفادہ کر رہا ہے۔

آج کل: آپ نے اب تک کتنی کتابیں لکھی ہیں اور یہ کس طرح طے کرتے ہیں کہ کس موضوع کو قلم بند کرنا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں نے تقریباً 60 کتابیں لکھی ہیں اور میں اپنی دلچسپی کی بنیاد پر انتخاب کرتا ہوں۔ میں نے مختلف تاریخی ادوار پر کام کیا جن میں مغل دور اور سندھ کی تاریخ شامل ہے، اس کے علاوہ فلسفہ تاریخ اور فلسفیانہ نظریاتی مباحث پر کام کیا۔

آج کل: آپ کی ایک کتاب ''تاریخ اور عورت'' ہے، اس میں آپ نے عورت کو کس حوالے سے موضوع بنایا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ میں عورت کو کمتر سمجھا گیا ہے اور عورت کو کمزور ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تاریخ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ میں نے تاریخی پہلوؤں سے عورت کو برتر دکھایا اور اس کے علاوہ میں نے علماء کرام کی تاریخ پر بھی کام کیا ہے کیونکہ بہت سے حوالے ان سے لئے جاتے ہیں۔

آج کل: جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحث کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، جس طرح واقعات کی تاریخ ہوتی ہے اسی طرح نظریات کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ پھر تاریخ میں ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں فلسفہ اور تاریخ آپس میں مل جاتے ہیں لہٰذا جب تک آپ تھیوری سے واقف نہیں ہوں گے، آپ تاریخ کو نہیں سمجھ سکتے۔ تاریخ پڑھتے ہوئے کبھی کبھار قاری کنفیوژ بھی ہو جاتا ہے لیکن ایک بات سمجھنے والی ہے کہ مورخ اپنے لحاظ سے تاریخ کو لکھ دیتا ہے، قاری اس کو اپنی سمجھ سے پڑھ کر مطلب اخذ کرتا ہے۔ اگر مورخ نے کسی دور کو سنہری کہا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دور واقعی سنہری ہو۔ اس میں مختلف زاویے اور جہتیں ہوتی ہیں کوئی ایک نظریہ مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال یوں لے سکتے ہیں کہ محمود غزنوی نے سترہ حملے کئے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس نے حملے کیوں کئے؟ اب اس بات کو ہر مورخ اپنے انداز سے لکھے گا۔

آج کل: پاکستانی جامعات میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ تو صرف افراد کی تاریخ ہے، آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: بہت عرصے تک یہ بھی خیال کیا جاتا رہا کہ تاریخ فرد بناتے ہیں جس طرح ہمیں پرانی تاریخ پڑھ کر پتہ چلتا ہے۔ پھر تاریخ کا میدان وسیع ہوا، سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر اب تاریخ نے نئے پہلو وضع کئے ہیں۔ فرد کا نظریہ تاریخ متروک ہو چکا مگر ہمارے ہاں ابھی تک پڑھایا جاتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں بتایا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے خواب دیکھا اور قائداعظم نے پورا کر دیا۔ اس کے پیچھے اور کن لوگوں کی قربانیاں تھیں اور یہ سب کیسے ہوا، اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا۔

آج کل: کیا بحیثیت قوم ہم یکجا ہیں اور طبقاتی سوچ اور تفرقات کے مسائل ہمیں انتشار کی طرف نہیں لے جا رہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مگر طبقات تو پوری دنیا میں ہیں۔ اس وقت ہماری حالت ایسی ہے جب حکمران تاریخ میں اپنی صرف اپنی فکر کرتے ہیں، انہیں عوام کا بھی خیال نہیں ہوتا۔ عوام کا تاریخ بنانے میں کوئی کردار نہیں رہا، تاریخ دانشوروں اور مفکرین سے بنتی ہے۔ ہمارے ہاں تو

جمہوریت بھی جاگیرداری کی شکل میں ہے، اسی لئے عوام کے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکے۔

آج کل: پاکستان نے بین الاقوامی تعلقات استوار کرنے میں کہاں غلطی کی؟ کیا ہمیں امریکہ سے تعلقات کوفروغ نہیں دینا چاہئے تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان بنتے ہی ہم نے امریکہ سے فوجی مدد کی اپیل کی کیونکہ شروع میں ہمارے حکمرانوں کے ذہن میں یہ خوف تھا کہ ہم ہندوستان کی نسبت کمزور ریاست ہیں۔ جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ عوام کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرتے اور ہندوستان کے ساتھ بھی ایک اچھے پڑوسی والا رویہ رکھتے۔ ہم نے ابتداء ہی مد[illegible] ب[illegible] کرنے سے کی اور اپنی پالیسیوں کی بدولت ویسٹر بلاک کی طرف چلے گئے۔ جب آپ کا کسی پر انحصار ہوتا ہے تو پھر آپ کو استعمال تو کیا جاتا ہے۔ چین کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات اس لئے اچھے ہوئے کہ 1960ء میں انڈیا کے تعلقات چین سے خراب ہو گئے ورنہ نہرو چوئن لائی کے بہت قریب تھے۔ پھر ہم نے خود کو آئی ایم ایف کے قرضوں میں جکڑا اور ضیاء الحق دور میں روس کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔ اب ہم ایک ایسی صورتحال کا شکار ہو گئے ہیں، جس سے نکلنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ ہمارے حکمران طبقے میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اس کشمکش سے خود کو نکال سکے۔ عوام سے مدد کی اپیل کی جاتی ہے، عوام کے لئے حکمرانوں نے کیا کیا ہے جو وہ مدد کے لئے آگے بڑھیں۔

آج کل: آپ کا کیریئر کس انداز سے آگے بڑھا؟

ڈاکٹر مبارک علی: بنیادی طور پر میں تدریس سے وابستہ رہا، میں نے سندھ یونیورسٹی میں پڑھایا پھر نیشنل کالج آف آرٹس میں بھی پڑھاتا رہا۔ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کا سربراہ بھی رہا، اس کے علاوہ میں نے ایک این جی او کے ساتھ ''یورپین ایشین ڈائیلاگ'' پر کام کیا، اب ایک انگریزی اخبار میں کالم لکھتا ہوں اور اعزازی لیکچرز کے لئے مجھے پوری دنیا میں مدعو کیا جاتا ہے۔

آج کل: آپ کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا مگر اس کے باوجود آپ نے محنت کی، جدوجہد کی اس زندگی میں کبھی ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں کامیاب ہوا کہ نہیں! کیونکہ میں نہ تو کسی سیاسی جماعت کا ممبر بنا اور نہ کوئی سیاسی ثمرات لئے، میں نے زندگی میں انفرادی طور پر ہی جدوجہد کی۔ معاشرہ اب جس طرح نفسانفسی کا شکار ہے، میں سوچتا ہوں کہ اس میں ہماری آواز سننے والا کون ہے۔

آج کل: آپ کا ایک سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' کا بھی شائع ہوتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی ہاں! میں نے جامعات میں تاریخ کے مضمون کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ رسالہ نکالا۔ مگر بہت افسوس کا مقام ہے کہ اس کو نہ تو اساتذہ پڑھتے ہیں اور نہ ہی اس میں طلباء کی کوئی دلچسپی ہے۔ ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت تاریخ کی مختلف کانفرنسز بھی منعقد کروائیں تاکہ لوگوں میں

تاریخی شعور بلند ہو سکے۔

آج کل: ادب سے تاریخ کے تعلق کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: ادب کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں مضامین معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے نظیر اکبر آبادی کا کلام اس لئے پسند ہے کہ اس میں عوام کی بات ہوتی ہے اور مجھے غالب کی شاعری بھی بہت اچھی لگتی ہے۔

آج کل: شعبہ تاریخ کا پاکستان میں کیا مستقبل ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ کے نظریات کو نہیں سمجھیں گے اور تحقیق میں دلچسپی نہیں لیں گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے تاریخ کو شوق سے نہیں پڑھا تو دنیا سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

(روز نامہ ''آج کل'': یکم مارچ 2009ء)

☆☆☆

ہم اپنی تاریخ لکھوانے کے لئے بھی غیر ملکیوں کے محتاج ہیں

انٹرویو: معظم علی

ڈاکٹر مبارک علی کا نام تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ گو ان کے انداز اور نظریات سے بعض حلقوں کو اختلاف ہو سکتا ہے تاہم ان کی علمیت، تاریخ شعور اور تاریخ نویسی کے سلسلے میں خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ملک کے اس اہم دانشور، مورخ اور کالم نگار سے ایک نشست میں تاریخ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ جس طرح ہم معاشی صورتحال کی بہتری کے لئے آئی ایم ایف کے محتاج ہیں اسی طرح ہم اپنی تاریخ لکھوانے میں بھی غیر ملکیوں کے محتاج ہیں۔ تاریخ کو یاد رکھنے والی قومیں زندہ رہتی ہیں اور جو اپنی تاریخ کو یاد نہیں رکھتیں وہ گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ جب تک آپ کے علم میں آپ کی تاریخ نہ ہو، آپ ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں ابھی تک تاریخ لکھنے کے لئے کسی ادارہ کا قیام عمل میں نہیں لایا گیا۔ انفرادی طور پر کئی لوگ تاریخ لکھ رہے ہیں لیکن یہ ایک فرد نہیں بلکہ ادارہ کا کام ہے۔ اگر کوئی ایک فرد تاریخ لکھتا ہے تو اس میں غلطیوں کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں بہت زیادہ مواد ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور نہ ہی تاریخ پر کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اسی طرح لائبریریوں کا برا حال ہے، عملہ تو بہت ہے لیکن کام نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان اس معاملے میں ہم سے بہت آگے ہے اور وہاں تاریخ پر بہت کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے بتایا کہ میں نے تاریخ کو نئے سرے سے دیکھا اور اس کی نئی تشریح کی ہے۔ میں نے تاریخ کو اس پہلو سے دیکھا کہ عام لوگ تاریخ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں تاریخ کے موضوع میں تبدیلی آ گئی ہے، تاریخ کا اسلوب بدل گیا ہے، نئی تھیوریز کافی آ گئی ہیں۔ ان حالات میں تاریخ پر نئے پہلو اور انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈکٹر مبارک علی نے کہا کہ میں سندھ کی تاریخ پر تفصیل سے کام کیا ہے جس کو بہت سراہا گیا ہے اور میری کتاب تین زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد 50ء کی دہائی میں

سندھ کی تاریخ پر حکومت نے بہت کام کیا اور سندھ بورڈ قائم کیا گیا جنہوں نے سندھ کی جامع تاریخ گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے جس میں سے 9 جلدوں پر کام مکمل ہو چکا ہے اور چند ایک چھپ بھی چکی ہیں۔ سندھ کی لائبریری میں مجھے تمام تر مواد ملا جس سے مجھے سندھ کی تاریخ پر کام کرنے میں بہت آسانی ہوئی۔ سندھ آرکائیوز کے ڈائریکٹر نے مجھے دعوت دی کہ میں سندھ کی تاریخ پر کام کروں، وہاں لائبریری میں بہت مواد ہے اور انہوں نے تمام مواد کو کمپیوٹرائزڈ کر دیا ہے جس سے تمام میٹر محفوظ ہو گیا ہے۔ سندھ کی تاریخ پر پہلے روائتی کام ہوا تھا اور میں نے اس سے ہٹ کر کام کیا ہے۔ ہم نے 1857ء پر ایک کانفرنس کی تھی جس کا تمام تر مواد ہمیں سندھ آرکائیوز سے مل گیا تھا۔ تحریک آزادی کے بعد جن لوگوں کو مالدیپ اور دوسرے ممالک میں جلاوطن کیا گیا ان کو کراچی سے بحری جہازوں میں بھیجا گیا تھا اور ان جلاوطن کئے جانے والے تمام افراد کا ریکارڈ کراچی میں موجود تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی نے کہا کہ صوبہ سندھ اور سندھی زبان کی اپنی علیحدہ انفرادیت ہے۔ ان کا اپنا کلچر، اپنی زبان اور سندھی ہونے کا احساس ہے۔ سندھی نوجوانوں میں پڑھنے کا بہت رجحان ہے۔ لیکن سندھی لوگوں کا out !cok بہت محدود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ زیادہ تر اپنے صوبے سے باہر نہیں گئے۔ کراچی پر جب انگریزوں نے 1935ء میں قبضہ کیا تو انہوں نے بزنس کمیونٹی کو یہاں آنے کی دعوت دی اور یہاں پھر اینگلو انڈین، خوجے، پارسی، ہندو اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد یہاں آ کر آباد ہو گئی۔ کراچی اس وقت بہت چھوٹا شہر تھا اور یہاں سندھی بہت کم تھے۔ سندھیوں کی زیادہ تعداد حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ، میرپور خاص اور دیگر علاقوں میں ہے۔

سندھ کی تاریخ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی نے بتایا کہ ہڑپہ وادی سندھ کا ورثہ ہے جبکہ موہنجوداڑو بعد میں دریافت ہوا ہے۔ مہر گڑھ کی کھدائی سے 7 ہزار قبل از مسیح کے نشانات ملے ہیں۔ وادی سندھ کی تہذیب کے آثار بھارت کی ریاست گجرات، راجستھان اور مدھیہ پردیش سے بھی ملے ہیں اور پنجاب میں بھی اس کا حصہ تھا۔

پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ پنجاب کی تاریخ پر کافی لوگوں نے کام کیا ہے لیکن وہ اتنا جامع نہیں ہے۔ کچھ دوستوں کا اصرار تھا کہ میں بھی پنجاب کی تاریخ پر کچھ کام کروں۔ میں نے تھوڑا سا کام کیا ہے لیکن ابھی تک تفصیل کے ساتھ کوئی خاص کام نہیں کر سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو پنجاب کی تاریخ پر کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ پنجاب کی تاریخ پر آخری کتاب عبداللطیف کی History of Punjab ہے جو تقریباً 100 سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اب پنجاب کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ سکھوں نے پنجاب کی تاریخ لکھی ہے لیکن ان کی تاریخ صرف اپنے مذہب کے گرد گھومتی ہے اور پنجاب کی تاریخ سکھ مذہب کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی ہے،

اس وجہ سے اس کو سکھوں کی حد تک تو ٹھیک کہا جاسکتا ہے لیکن ایک جامع تاریخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب کی تاریخ لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ ایک زمانے میں پنجاب کی سرحد کابل تک رہی ہے۔ صرف سکھوں کے دور میں پنجاب کا علیحدہ تشخص رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ پہلے یہاں آریہ آئے پھر وید یہاں آئے۔ آریہ وادی سندھ اور گنگا سے یہاں آئے۔ پھر ایرانی آجاتے ہیں یہاں پر یونانی بھی آئے اس لئے یہاں گندھارا، یونانی اور ہندوستانی تہذیب کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ٹیکسلا اور دیگر علاقہ بدھ کا گڑھ تھا۔ انہوں نے کہا کہ لاہور کی اہمیت غزنویوں کے دور میں ہوئی۔ غزنویوں کے زوال میں جب آخری سلطان حکمران تھا اس کے دور میں لاہور ایک سیاسی اہمیت کے شہر میں تبدیل ہوگیا۔ یہاں صوفیاء آئے پھر مسجدیں، خانقاہیں اور مزارات بنے۔

صوبہ بلوچستان اور سرحد کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی نے بتایا کہ انڈس ویلی کی جو تہذیب ہے اس کی ابتداء صوبہ بلوچستان سے ہوئی تھی۔ بلوچستان میں چونکہ قبائلی نظام ہے اس لئے اس کی تاریخ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ قبائلی چونکہ ریاست کی حاکمیت کو نہیں مانتے اس لئے بلوچستان اور صوبہ سرحد کی تاریخ قبیلوں کی طرح ہے۔ قلات کی ریاست بہت بعد میں قائم ہوئی۔

پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ افسوسناک بات یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ پر کوئی کام نہیں ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد معین الحق، محمود حسین اور کچھ دیگر افراد نے جو یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے، تاریخ پر تھوڑا کام کیا تھا۔ لیکن انہوں نے صرف پاکستان کی نظریاتی تاریخ پر کام کیا تھا جو کہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ سیاسی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ سیاسی تاریخ لکھنے کے لئے ریاست 30 سال بعد دستاویزات کو عام عوام کے لئے جاری کر دیتی ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی تک یہ نہیں ہوسکا۔ حکومتوں کے معاہدوں اور دیگر حکومتی امور کے بارے میں کوئی معلومات مہیا نہیں کی جاتیں اور اگر کوئی ملتی بھی ہیں تو وہ لکھنے پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ ہمارے پاس معلومات کا واحد ذریعہ صرف اخبارات اور جرائد ہیں جو ان میں چھپتا ہے وہ ہم جمع کر کے تاریخ بنا لیتے ہیں۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کی جو نامور شخصیات ہیں انہیں بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے جبکہ دیگر سیاسی، سماجی اور معاشی میدان میں گرانقدر خدمات سرانجام دینے والی شخصیات کو سرے سے ہی نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ہماری تاریخ شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ ایوب، یحییٰ، بھٹو، ضیاء الحق، بے نظیر اور نواز شریف ان پر جو لکھا گیا وہی تاریخ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تاریخ کو شخصیات سے ہٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کی تاریخ کہاں سے لکھیں گے؟ کے سوال کے جواب میں ڈاکٹر مبارک نے کہا کہ میں اگر پاکستان کی تاریخ لکھوں تو مہر گڑھ سے لکھوں گا کیونکہ مہر گڑھ کا کلچر اس زمین کی پیداوار تھا۔ ہندو، منگول،

ہن، ترک اور جو مغل آئے وہ سب اس سرزمین کا حصہ ہیں۔

انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں تاریخ کو مذہب سے نہ جوڑیں، اس سے تاریخ تقسیم ہو جاتی ہے۔ تاریخ کو طاقت سے جوڑا جائے کیونکہ طاقت ہی کسی تاریخ کو مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ معاشرے میں سیاسی، سماجی اور معاشی قوتوں نے کس طرح کردار ادا کیا ہے؟ عوام کا کردار کیا جا رہا ہے؟ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے صرف تاریخ کو نظریہ کی نظر سے دیکھا ہے جو کہ پوری تاریخ کی نمائندگی نہیں کرتا۔ عربوں کے آنے سے پہلے بھی برصغیر پاک و ہند کی کوئی تاریخ تھی جس کا علم بہت ضروری ہے۔ تاریخ تسلسل سے ہوتی ہے اگر اس میں کوئی خلا آ جائے تو وہ مکمل نہیں ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کو کئی پہلوؤں سے دیکھا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف ایک سچائی ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سچائیاں کئی ہوتی ہیں۔ فرانسیسی مورخ مائیکل فوکو کہتے ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ تاریخ میں حق و باطل کی جنگ ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ تاریخ میں دو سچائیوں کی جنگ ہوتی ہے اور جو سچائی طاقت میں ہوتی ہے وہ جیت جاتی ہے۔ تاریخ میں سچائیاں تبدیل ہو جاتی ہیں جیسے جنوبی افریقہ کے رہنما نیلسن منڈیلا ایک وقت تک غدار اور ملک دشمن تھے، لیکن ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ ایک ہیرو کی طرح پوری دنیا میں پہچانے جانے لگے اور جنوبی افریقہ کے صدر بھی بنے۔ آج اگر دیکھا جائے تو دنیا کے نزدیک فلسطینی دہشت گرد ہیں لیکن اگر آج فلسطین آزاد ہو جاتا ہے تو یہی دہشت گرد کہلائے جانے والے لوگ حریت پسند اور آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہد کہلائیں گے۔ تاریخ کے اندر اونچ نیچ بھی ہوتی رہتی ہے اور یہ طاقت کے توازن کے بگڑنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ تاریخ کئی طرح کی ہوتی ہے ایک تاریخ مورخ لکھتا ہے، کچھ اس دور کے لوگ تاریخ لکھتے ہیں اور ایک تاریخ ایسی ہوتی ہے جو لوگ لکھتے ہیں۔ جس کی مثال کچھ یوں ہے کہ کچھ لوگ اسلامی فتوحات میں مرکزی کردار صوفیاء کو دیتے ہیں کہ ان کی دعاؤں کی وجہ سے فتوحات ہوئیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ علماء نے زیادہ کردار ادا کیا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حکمرانوں نے بہترین حکمت عملی اپنائی جبکہ کچھ لوگوں کے نزدیک عام عوام نے ان فتوحات میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ کبھی کبھی تاریخی حقائق کا تصادم بھی ہو جاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر مبارک نے کہا کہ تاریخ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف اپنے ماضی کے بارے میں جاننے کا شوق ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں ہم کیا تھے؟ ماضی میں کیا ہوا؟ ہم کون تھے؟ ہم سے پہلے کون تھے؟ ان کی سرگرمیاں کیا تھیں؟ ان کا رہن سہن کیا تھا؟ اس سے ایک تسکین ملتی ہے، شعور ملتا ہے۔ سابقہ اقوام کے بارے میں آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ان کے عروج و زوال کی کیا وجوہات تھیں۔ لوگوں کے تخیل اور صلاحیتوں کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ آج لوگ اہرام مصر کو دیکھ کر

ششدررہ جاتے ہیں کہ ہزاروں سال قبل یہ کیسے بنائے گئے؟ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ نہیں کریں گے تو آپ کو اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ملیں گی کہ یہ کیسے بنے؟ آج یورپ میں لوگ اس جستجو میں ہیں کہ وہ ان رازوں کو دریافت کرلیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے کہا کہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔ جنہوں نے سبق سیکھا ہے انہوں نے اپنے ایک ایک پہلو کی تشکیل کی ہے۔ انہوں نے ترقی کی اور نت نئی ایجادات کیں۔ مسلمانوں کی تاریخ دیکھیں تو ابن خلدون واحد اسلامی تاریخ دان تھے لیکن انہیں بھلا دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن خلدون کو 19ویں صدی میں دریافت کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ کمزور ہورہی تھی تو کسی نے اس موقع پر کہا کہ قوموں کے عروج وزوال کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے۔ ترکوں نے اسے دریافت کیا تاکہ وہ اپنے زوال کے اسباب کو سمجھ سکیں۔ اس کے بعد یورپ میں انگریزوں نے ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کیا اس کے بعد ہمارے پاس آیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں میں تاریخ لکھنے کا آغاز عباسی دور سے ہوا۔ اس سے پہلے جاہلیت کی تاریخ تھی جو الایام کہلائی جاتی ہے اور یہ قبیلوں کی تاریخ ہے۔ اصل تاریخ عباسیوں کے دورِ حکومت سے شروع ہوتی ہے۔ عباسی دور میں جو تاریخ لکھی گئی اس کا فن اسلوب حدیث کا تھا اس سے واقعات کی سچائی اور حقیقت کے بارے میں آگاہی ہوتی تھی۔ تاریخ میں زیادہ تر دو موضوع رہے ہیں ایک واقعات کا جمع کرنا اور دوسرا خاندانوں کی تاریخ۔ موجودہ دور میں ''ہسٹری آف محمڈن'' کو اسلامی تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ تاریخ جھگڑوں کی بنیاد نہیں بلکہ یہ کسی بھی معاشرے کی تصویر کشی کرتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے کہا کہ یورپ میں اہم دستاویزات لکھنے والے چرچ کے پادری ہوتے تھے چونکہ چرچ کے پاس تمام افراد کا ریکارڈ ہوتا تھا اس لئے پادری ہی مورخ کا کام سرانجام دیتے تھے۔ جو پیدا ہوا اس کو بپتسمہ دینے کی تقریب اور اس کا نام لکھا جاتا تھا اور جب وہ فوت ہوتا تھا تب بھی چرچ کے رجسٹر میں اس کا نام لکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی چرچ کے رجسٹروں میں ایک ہزار سال تک پہلے خاندانوں کا ریکارڈ موجود ہے۔ یورپی ممالک کے تاجر جو تجارت کی غرض سے دیگر ممالک کا سفر کرتے تھے وہ اپنے سفر کے واقعات کو تحریر کرتے تھے جو بعد میں ایک تاریخ کی شکل اختیار کر جاتے تھے۔ اسی طرح بادشاہوں کے درباری بھی مورخ تھے۔

ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی نے کہا کہ معزول ججوں کی بحالی اچھا اقدام ہے لیکن مجھے نہیں امید کہ اس کے اثرات دوررس ہوں گے، کچھ عرصے بعد پھر وہی صورتحال

..ربے ں۔ ان ۔پیپلز پارٹی برسراقتدار رہے کل نواز شریف آ جائیں گے۔ جب تک نظام تبدیل نہیں ہوتا ہم کوئی مثبت تبدیلی نہیں لا سکتے۔ چہرے تبدیل ہونے سے تبدیلی نہیں آ سکتی۔ ہمارے ہاں خاندانی سیاست ہو رہی ہے، بھٹو فیملی، شریف فیملی، جمہوریت میں یہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی سیاسی رہنما سے متاثر نہیں ہوں۔ جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق سے لے کر بے نظیر بھٹو اور نواز شریف تک سب نے مفادات کی سیاست کی۔

(ماہنامہ ''نئی آواز'': اپریل 2009ء)



ہماری تاریخ پر..................!

انٹرویو: عظمیٰ اوشو

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے واحد (موجودہ) تاریخ دان ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ سے وابستگی بحرالکاہل کی گہرائی سے بھی زیادہ ہے انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ تاریخ کی نذر کر دیا۔ان کی تمام کتب بازار میں موجود ہیں اور ملک کے باشعور اور دانشمند طبقوں میں مقبول ہیں۔جنہیں شعور ہے ان کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا رتبہ ہمالیہ سے بھی بلند ہے۔ڈاکٹر صاحب کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو کسی نظریہ، مشن یا مقصد کی تکمیل کے لئے اپنا سب کچھ تج دیتے ہیں۔پاکستان کی بنجر زمین میں وہ ایک قد آور درخت کی طرح ہیں جس کے سایہ میں بہت سے نظریاتی لوگ پناہ لئے ہوئے ہیں۔وہ زندگی کے مصائب اور مشکلات کو بھی یوں ہنس کر گزارتے ہیں کہ شاید کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی نہ کر سکے۔لیکن ان کی زندگی کے مصائب یا مشکلات ان کے خنداں تاثر چہرے کو بھی متاثر نہیں کر سکی۔یہ ڈاکٹر مبارک علی کا ہی وصف ہے کہ انہوں نے ایک ایسی سرزمین میں ایک اچھوتے کام کی ذمہ داری اٹھائی جس کے لئے یہاں کوئی تیار نہ تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ پاکستان میں یکسر دانشورانہ ماحول نہیں ہے۔یہاں دانش کی قدر نہیں ہے۔مادیت پرستی ہے۔دانش مند کی پذیرائی نہیں۔ڈاکٹر مبارک نے اس ماحول میں تاریخ میں اتنا کام کیا ہے کہ شاید پاکستانی قوم کی تاریخ میں کوئی گروہ مل کر بھی یہ کام نہ کر سکے۔حقیقت اور سچ یہی ہوتا ہے جو موقع پر ہی بیان کر دیا جائے۔ڈاکٹر صاحب عمر کے اس حصہ میں بھی مایوس نہیں وہ اپنے کام سے مطمئن ہیں۔تاریخ پر ان کی بڑی گہری نظر ہے اور انہوں نے اس خطہ کی ہی نہیں بلکہ اقوام عالم کی تاریخ کو ایک درست سمت پر استوار کیا۔ جس پر ان کا کام قابل تحسین ہیں۔وہ اپنے کام کا کوئی صلہ لینے کے خواہش مند نہیں۔ڈاکٹر مبارک علی سے گفتگو کے کئی پہلو تھے لیکن ''بدلتی دنیا'' کے قارئین کے لئے اسے مختصر رکھنے کے لئے چند سوال کئے باقی گفتگو آف دی ریکارڈ رہی۔ڈاکٹر مبارک سے ہونے والی گفتگو قارئین کے لئے حاضر ہے۔

بدلتی دنیا: کیا تاریخ کا بھی زاویہ ہوتا ہے؟ آپ کی تصنیف 'تاریخ کے زاویے' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی بالکل ہوتا ہے مگر ایک نہیں ہوتا تاریخ کے کئی زاویے ہوتے ہیں۔ تاریخ کو ایک زاویہ سے نہیں دیکھا جاتا ہر مورخ اپنے اپنے انداز میں دیکھتا اور لکھتا ہے۔ مثال کے طور پر محمود غزنوی کو ہی لے لیں جس کے لئے وہ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ محمود غزنوی نے ٹریبوٹ اور اخراج لے کر فتح کئے علاقے واپس کر دیئے تھے۔ دوسرا مورخ یہ کہتا ہے کہ محمود غزنوی نے اسلام کو پھیلانے کے لئے جہاد کیا۔

بدلتی دنیا: آپ کے خیال میں ایک مورخ میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: مورخ کو کنسٹریٹر، آبزرور اور ویٹنس ہونا چاہئے۔

بدلتی دنیا: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مورخ کو واقعات لکھتے وقت اپنی رائے دینی چاہئے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مورخ کو اپنی رائے ضرور دینی چاہئے کیونکہ مورخ کی رائے سے عوامی شعور بیدار ہوتا ہے اگر مورخ محض واقعہ بیان کرے گا تو وہ غلط ہے اس سے کوئی شعور نہیں آئے گا۔ تاریخ کا مفہوم تجزیہ سے ہی پیدا ہوتا ہے تاریخ کے شعور کے لئے مورخ کا تجزیہ ضروری ہے۔ اچھے مورخ کے تجزیہ سے عوام میں تاریخ کا شعور اجاگر ہوتا ہے۔

بدلتی دنیا: کیا تاریخ لکھتے وقت عام لوگوں کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا مگر اب ایسا ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے تاریخ دان عام لوگوں کو سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں ماضی میں مورخ صرف بادشاہوں اور خواص کے لئے تاریخ لکھتا تھا جس میں جنگوں کا ذکر تھا۔ محلاتی سازشوں کے تذکرے ملتے تھے مگر آج کا مورخ عام آدمی کو تاریخ کا حصہ بنا رہا ہے جس سے تاریخ میں ثقافت، کلچر اور سماج کو جگہ مل رہی ہے۔ دراصل ماضی میں مورخ زیادہ درباری ہوتے تھے اور صرف بادشاہوں کی خوشنودی کے لئے تاریخ لکھتے تھے اس پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا ایک دفعہ کسی نے جہانگیر کے دربار میں آکر بتایا کہ کسانوں نے بغاوت کر دی ہے تو جہانگیر نے حیرت سے پوچھا کیا کسان بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ یعنی جہانگیر کا خیال تھا کہ بغاوت کرنے کا حق صرف بادشاہ کو ہی حاصل ہے۔

بدلتی دنیا: مسلمانوں کی تاریخ کے حوالہ سے آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: مسلمانوں کی تاریخ فرقہ واریت کے نقطہ نظر سے لکھی جاتی ہے مطلب مسلمان مورخ اپنے فرقہ کو جس سے بھی اس کا تعلق ہوتا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتا ہے بہت سے مورخ کہتے ہیں حضرت علی بھی ٹھیک تھے اور معاویہ بھی تو سوال پیدا ہوتا ہے پھر جنگیں کیوں ہوئیں۔ ہاں مسلمانوں کی تاریخ کو غیر مسلموں نے اچھے انداز میں لکھا ہے۔ مسلمانوں کے لئے تاریخ لکھنا مشکل ہے کیونکہ ان میں عقیدت آجاتی ہے اور عقیدت سے تاریخ نہیں لکھی جاتی۔

بدلتی دنیا: ہندوستان کے تاریخ دان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہندوستان میں تاریخ کا مضمون بہت وسیع ہے اور ہندوستان کا تاریخ دان سیکولر ہے۔ وہ تاریخ کو کئی زاویوں سے دیکھتا ہے، اور دوسری بات جو بہت اہم ہے اور ہمارے ہاں اس کا فقدان ہے وہ ہے ''پاور'' ہندوستان کا تاریخ دان بہت پاورفل ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں تاریخ دان ہے ہی نہیں اور جو ہے اس کے پاس پاور نہیں ہے یہاں پر بنیاد پرستوں کی اجارہ داری ہے۔

بدلتی دنیا: پاکستان کے دانشوروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: (مسکراتے ہوئے) ہمارا المیہ ہے کہ ہم شاعر کو ہی دانشور سمجھتے ہیں ہمارے ہاں یا تو شاعر پیدا ہوتے ہیں یا مُلّا، مفکر اور فلاسفر کے لئے ہماری دھرتی بہت بانجھ ہے اب آپ دیکھیں فیض کی صدی منائی جارہی ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہو رہا ہے فیض کی کتنی کنٹری بیوشن ہے۔ ایک شاعر معاشرے کی کسی تحریک میں ولولہ تو پیدا کرسکتا ہے شعور بیدار نہیں کرسکتا، شعور نثر سے آتا ہے شاعری ویسے بھی کسی سوسائٹی کی ابتداء ہوتی ہے اور ہم ابھی تک ابتداء میں ہی ہیں۔

بدلتی دنیا: علامہ اقبال بھی تو شاعر تھے ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: علامہ اقبال نے سوسائٹی کو بہت نقصان پہنچایا اقبال کی ساری شاعری میں عامیانہ پن ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ ہر شہر میں اقبال کے نام پر سڑکیں، تعلیمی ادارے اور نہ جانے کیا کیا منسوب کیا گیا ہے۔ اقبال کا کوئی رول ہی نہیں ہے، کسی کام میں۔ یہ تو جب ہندوستان اور پاکستان الگ ہو رہے تھے تو پنجاب کا تحریک پاکستان میں کوئی رول نہیں تھا۔ پنجاب کے جاگیردار تو سارے یونینسٹ پارٹی کے تھے۔ جس کا احساس ہوا تو انہوں نے کہا کہ پاکستان کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور یوں اقبال کو تحریک پاکستان کے ساتھ شامل کرلیا۔

بدلتی دنیا: کیا ادب کا تاریخ سے کوئی تعلق ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ادب کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے مورخ ادب سے بہت کچھ سیکھ رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا جائزہ لیں تو پورا ہندوستان نظر آتا ہے اسی طرح غالب کے خطوط سے بہت کچھ ملتا ہے۔

بدلتی دنیا: ٹیکنالوجی کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پسماندہ سوسائٹی میں ٹیکنالوجی آئے تو سوسائٹی مزید پسماندہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہی ہو رہا ہے انٹرنیٹ سے موبائل فون تک سب پسماندگی کا باعث بن رہے ہیں۔

بدلتی دنیا: پاکستان میں دایاں بازو اور بایاں بازو، آپ کی دونوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے خیال میں یہاں لیفٹ اور رائٹ دونوں اخلاقی طور پر پسماندہ ہیں۔

بدلتی دنیا: سوشلزم نظریہ کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: سوشلزم اجتماعیات پر یقین رکھتا ہے انفرادیت کی بات نہیں ہوتی اس لئے میں تو سوشلزم کا حامی ہوں۔

بدلتی دنیا: پاکستان میں سوشلزم پنپ کیوں نہیں سکا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہمارے ہاں لوگ جذباتی ہیں وہ سوشلزم کے حامی ہوں یا بنیاد پرستی کے دوسرا سوشلزم سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں لچک بہت ہے اس کی لچک کی وجہ سے لوگوں کو ریلیف ملتا ہے جس وجہ سے سوشلزم کمزور پڑ جاتا ہے۔

بدلتی دنیا: ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا جو نعرہ دیا تھا اس پر کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: سب فراڈ تھا اسلامی سوشلزم اسی طرح یورپ میں عیسائی سوشلزم کا پرچار کیا گیا تو لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کے ہتھکنڈے ہیں ہمارے ہاں بھیک بھی مذہب کے نام پر مانگی جاتی ہے اور ووٹ بھی۔

بدلتی دنیا: پاکستانی تعلیمی نصاب کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہمارا تعلیمی سلیبس بیکار ہے۔ نہ شعور پیدا کرتا ہے نہ دنیا سے واقفیت ہوتی ہے۔ یہ بے جان اور بیکار سلیبس ہے۔ ہمارے سلیبس میں دو شخصیات ہی نظر آتی ہیں اقبال اور قائداعظم بس۔ تاہم ہندوستان نے اپنے تعلیمی سلیبس و بدلا ہے اور بہت اچھا بنایا ہے کہیں نفرت کا درس نہیں ہے ہمارے ہاں بھی اس پر کام ہونا چاہئے۔ ہمارا سلیبس تو نفرت سے بھرا پڑا ہے کردار سازی اور شعور کی بیداری نہیں ہو پا رہی۔

بدلتی دنیا: سوشلزم کیسے متعارف ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: سوشلزم زار روس کے مظالم کے خلاف نوجوانوں کا ردِعمل تھا نوجوانوں کا خیال تھا کہ تشدد اور دہشت گردی سے سماج بدل جائے گا۔

بدلتی دنیا: نظریاتی ریاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نظریاتی ریاست ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے داخلی طور پر بھی اور خارجی طور پر بھی۔ اس لئے بھی کہ نظریات بچانے کے لئے ریاستیں جاسوسی کا نظام قائم کرتی ہیں جس سے سماج کمزور ہوتا ہے۔ آپ دنیا پر نظر ڈالیں تو ساری نظریاتی ریاستوں کا یہی حال ہے۔

بدلتی دنیا: سماج میں طبقاتی تقسیم کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: طبقاتی فرق ختم ہونا چاہئے یہ اس وقت ممکن ہے جب نجی جائیداد کا تصور ختم ہوگا طاقت تو اسی کے پاس ہوتی ہے جس کے پاس جائیداد ہوگی تو وہ دوسرے لوگوں کو حقیر یا رعایا سمجھے گا جس سے طبقاتی تقسیم ہوگی۔

بدلتی دنیا: سوشلزم امپیریلزم کو شکست کیوں نہیں دے پایا؟

ڈاکٹر مبارک علی: ویسے تو اس کا جواب بہت طویل ہے سرمایہ دارانہ نظام کی حامی ریاستوں نے سوشلزم کا راستہ روکنے کے لئے بے شمار اصلاحات کیں جیسا کہ جرمنی کے ایک چانسلر ''بسماک'' نے سرمایہ دارانہ نظام کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے خود ہی اپنے صاحبین سے یہ کہا کہ اس سے پہلے کہ یہاں کوئی اور انقلاب لائے ہم خود ہی انقلاب کیوں نہ لے آئیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ جرمنی میں قیام کے دوران میرے ساتھ ایک یورپی باشندہ فیکٹری میں کام کرتا تھا وہ ڈیوٹی اوقات کے بعد اپنے آپ کو تیار کرتا، تھری پیس سوٹ پہنتا اور مرسڈیز میں بیٹھ کر نکل جاتا میری اکثر اس سے امپیریلزم اور سوشلزم کے حوالہ سے بات ہوتی تھی اس نے ایک دن کہا تمہارا سوشلزم مجھے کیا دے گا میں جرمنی کے چانسلر کی طرح زندگی گزارتا ہوں یہ سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاحات تھیں جس نے عام آدمی کو سوشلزم سے متنفر کیا تھا۔ یوں سرمایہ دار چالباز ہے وہ اپنا سرمایہ بچانے اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کے لئے اصلاحات کے نام پر چالبازیاں کرتا ہے۔ ایک تو دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی حامل زیادہ ریاستیں ہیں اور ساری کسی نہ کسی طرح آپس میں اتحادی ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کی مدد کو ہر وقت تیار رہتی ہیں اور کسی دوسرے نظریہ کو پنپنے نہیں دیتیں۔ میڈیا پر، کاروبار پر ان کا کنٹرول ہے اور یہ انجمن ستائش باہمی ہیں۔ پروپیگنڈہ اور ذاتی مفادات کا یہ اتحاد بڑی کامیابی سے چل رہا ہے اسی لئے دوسرے نظریات یا سوشلزم کو پاؤں جمانے کا موقع نہیں ملا۔

(ماہنامہ ''بدلتی دنیا'': فروری 2012ء)



دلائی لامہ سے ایوارڈ وصول کرنا یادگار واقعہ ہے

انٹرویو: محمود الحسن

ڈاکٹر مبارک علی نامور تاریخ داں ہیں۔ پاکستان میں تاریخ نویسی سے تھوڑی سی شدبُد رکھنے والا بھی ان کے نام سے اچھی طرح واقف ہوگا۔ تاریخ کے مضمون میں عام آدمی کی دلچسپی بڑھانے میں ان کی تحریروں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے جمے جمائے نظریات کو چیلنج کیا اور بہت سے فکری مغالطوں کو آسان طرزِ تحریر کے ذریعے دور کیا۔ سرکاری سچ کو ڈنکے کی چوٹ للکارنے پر وہ معتوب بھی رہے، لیکن اپنی ڈگر سے ہٹے نہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں، کئی برسوں سے ''تاریخ'' کے نام سے سہ ماہی میگزین بھی نکال رہے ہیں۔ ہمارے سلسلے ''بھلا نہ سکے'' کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل واقعات بیان کئے:

نوجوانوں کی طرف سے اپنی تحریروں پر ملنے والا فیڈ بیک میرے لئے بہت زیادہ خوشی اور طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بعض واقعات ایسے ہیں، جنہیں میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ ایسے دو تین واقعات، بیان کئے دیتا ہوں۔ نیشنل کالج آف آرٹس میں، ''ہسٹری آف ہیریٹیج'' کے نام سے میں بہت عرصہ کورس پڑھاتا رہا۔ ایک بار کورس کے اختتام پر ایک طالبہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ سر! آپ نے تو ہمارا ذہن بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس فقرے نے مجھے بہت زیادہ سرشار کیا۔ اسی طرح کافی برس پہلے، معروف دانش ور علی عباس جلال پوری کی یاد میں ہونے والے جلسے میں شرکت کے لئے جہلم گیا تو ایک نوجوان ملا، جس نے بتایا کہ وہ میری تحریروں کا پُرشوق قاری ہے۔ اس نے بڑی محبت سے مجھے فاؤنٹین پین تحفے میں دیا، جس نے مجھے عجیب طرح کی خوشی دی۔ وہ پین میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''یورپ کا عروج'' اسی نوجوان کے نام معنون کی ہے۔

تیسرا واقعہ ماضی قریب کا ہے۔ میرے دوست محمود مرزا بہ سبب علالت خود کچھ پڑھنے سے قاصر ہیں، میں نے اپنی کتاب انہیں بھجوائی، جو انہوں نے اپنے پوتے سے پڑھوا کر سنی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پوتے کو میری یہ کتاب بہت پسند آئی اور اس نے میری دوسری کتابیں پڑھنے کے لئے بھی اشتیاق ظاہر کیا

ہے۔ ایسے واقعات مجھے بے حد خوشی دیتے ہیں اور یاد رہتے ہیں۔ ان سے حوصلہ ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ضائع نہیں ہو رہا اور لوگ اس سے اثر قبول کر رہے ہیں۔

زندگی میں ایسے موقع بھی آئے جب کسی کی بات سے دکھ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً 1989ء میں برصغیر کی تقسیم سے متعلق ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں، میں نے یہ کہہ دیا کہ کتاب میں جدوجہد آزادی کے غیر مسلم راہ نماؤں کے بارے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ غیر مناسب ہے، اور علمی زبان نہیں۔ مثلاً گاندھی کے نام کے ساتھ شاطر وغیرہ لکھنا۔ اس پر کتاب کے مولف، جنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میری تنقید کا خیر مقدم کریں گے، برا مان گئے، اور تقریر کرنے آئے تو طنزیہ لہجے میں کہنے لگے کہ بھئی! ہم نے تو تاریخ سے متعلق اتنی ضخیم کتاب مرتب کر دی ہے، ڈاکٹر صاحب تو صرف پمفلٹ لکھتے ہیں، کبھی باقاعدہ کتاب لکھیں تو جانیں۔ تو ایسی باتیں بھی سننے کو ملتی رہی ہیں۔ جائز تنقید برداشت کرنے کا بھی ہمارے ہاں رواج نہیں ہے۔

مجھے تین ایوارڈ ملے ہیں، جو ریاست کی طرف سے نہیں ہیں۔ ان کی یاد بھی ذہن میں رہتی ہے۔ سب سے پہلے فیض فاؤنڈیشن نے فیض ایوارڈ دیا۔ پھر سندھ ادبی سنگت نے پیر حسام الدین راشدی گولڈ میڈل سے نوازا۔ دس سال قبل، بھارت سے رام کرشن آرگنائزیشن سے کمیونل ہارمنی ایوارڈ ملا۔ یہ ایوارڈ اس لئے سب سے یادگار حیثیت اختیار کر گیا کہ اسے میں نے دلائی لامہ کے ہاتھوں وصول کیا۔ میں نے دلائی لامہ سے کہا کہ میری خوش قسمتی ہے کہ ان سے میری ملاقات ہوگئی۔ دلائی لامہ سے پاکستان میں ملنا، کبھی ممکن نہ ہوتا، کیوں کہ چین سے دوستی کی وجہ سے ہم تو کبھی اپنے ہاں دلائی لامہ کو نہیں بلائیں گے۔ وہ مجھے بڑے مہذب، نفیس اور پڑھے لکھے انسان لگے۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ شام چھ بجے سو جاتے ہیں اور صبح تین بجے اٹھتے ہیں۔ یہ ان کا معمول ہے۔ ان سے ملاقات کی یاد ہمیشہ ذہن میں تابندہ رہی۔

1976ء میں جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا ملنا بھی ناقابل فراموش یاد ہے۔ جرمنی میں ڈگری دینے سے قبل آپ کا آخری امتحان، مکمل طور پر زبانی ہوتا ہے، جس میں پوری فیکلٹی بیٹھتی ہے، جو آپ سے کام کے بارے میں سوال کرتی ہے۔ دو گھنٹے یہ انٹرویو چلتا رہا۔ اس دوران کافی بھی چلتی رہتی ہے اور بڑے اچھے ماحول میں مکالمہ ہوتا ہے۔ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا۔ انٹرویو کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی حتمی نتیجے سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ پندرہ بیس منٹ بڑی بے چینی میں گزرے، لیکن جب کامیابی کی خبر ملی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری اکیڈمک زندگی میں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے ملنے سے آپ میں اعتماد آتا ہے اور آپ زیادہ یکسو ہو کر اور ذمہ داری سے اپنا کام کرتے ہیں۔

میری تحریروں سے بہت سے لوگوں نے جس دیدہ دلیری سے سرقہ کیا ہے، وہ مجھے حیران بھی کرتا ہے اور بھولتا بھی نہیں۔ مثلاً ایک صاحب جو بڑے مشہور اینکر ہیں، وہ اپنے پروگرام میں بڑے دھڑلے سے

میری تحریروں سے پیراگراف کے پیراگراف پڑھتے ہیں، لیکن مجال ہے، کبھی میرا حوالہ دینے کی زحمت گوارا کی ہو۔ یہ صاحب مجھے اتفاقاً مل گئے، تو میں نے ان سے بات کی تو کہنے لگے کہ وہ تو میرا حوالہ دیتے ہیں، ان کا کہنا صریحاً غلط تھا، انہوں نے کبھی میرا نام اپنے پروگرام میں نہیں لیا۔ ان صاحب نے ایک بڑے نجی ٹی وی چینل کے لئے مجھے دبئی بلاکر دو طویل انٹرویو بھی کئے، جو کبھی آن ائیر نہیں ہوئے۔ اس چینل سے میرے چار انٹرویو ایسے ہیں، جنہیں ریکارڈ کر لینے کے بعد پیش نہیں کیا گیا۔ میرا سوال ہے کہ اگر آپ تاریخ سے متعلق سچ دکھا نہیں سکتے اور آپ میں جرأت نہیں تو پھر مجھے بلاتے کیوں ہو؟ کچھ عرصہ قبل تاریخ سے متعلق ایک صاحب نے مجھے کتاب پیش کی تو مجھے یوں لگا، جیسے میں اپنی کتاب ہی پڑھ رہا ہوں۔ کہیں کہیں بس میرا حوالہ دیا گیا تھا، اب اسے معصومیت کہوں یا جرأت، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے اساتذہ بھی سرقہ کرتے پکڑے گئے ہیں۔ یہ ساری باتیں دُکھ دیتی ہیں، لیکن لوگ ان غلط حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے۔

زندگی میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں، جنہیں پڑھ کر احساس ہوا کہ جیسے ذہن کے دریچے کھل گئے ہیں۔ ایسی کتابوں میں کارل پوپر کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب The Open Society and Its Enemies ہے۔ وہ افلاطون سے شروع ہو کر ہیگل تک آتا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ اوپن سوسائٹی کے دشمن تھے۔ اس نے فلسفے کی پوری تاریخ کو کھنگال ڈالا ہے۔ دنیا میں افلاطون اور ہیگل کی فکر کا باقی فلاسفہ کے مقابلے میں زیادہ ذکر ہوا ہے، اس لئے ان دونوں پر اس نے زیادہ گرفت کی ہے۔ کارل پوپر، بیسویں صدی کے بڑے دماغوں میں سے ایک تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس کا پروفیسر رہا۔ آئن اسٹائن خاص طور پر اس کے لیکچر سننے آتا تھا۔ اپنے تعلیمی سفر میں، وہ کتابیں جو میرے لئے بڑی چشم کشا ثابت ہوئیں، ان میں کارل پوپر کی یہ کتاب سرفہرست ہے۔

(سنڈے میگزین روزنامہ ایکسپریس: 7 اکتوبر 2012ء)

☆☆☆

ایک مؤرخ کو نفرتوں کے فروغ کا باعث نہیں بننا چاہیے

انٹرویو: علی عباس

ڈاکٹر مبارک علی کا شمار پاکستان کے معتبر ترین مؤرخین اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپریل 1941ء کو بھارتی ریاست راجستھان کے شہر ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے 1963ء میں سندھ یونیورسٹی، جامشورو سے تاریخ کے مضمون میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور بعدازاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے لندن اور بعدازاں جرمنی چلے گئے۔ انہوں نے جرمنی کی ہی ایک یونیورسٹی سے بعدازاں 1976ء میں پی ایچ ڈی کی۔ وہ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سربراہ کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی 1996ء تک گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ساتھ بطور ڈائریکٹر بھی منسلک رہے۔ وہ تاریخ کے موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور ایک سہ ماہی مجلّے ''تاریخ'' کی ادارت بھی کررہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر مبارک علی نے ''دنیا'' کے ساتھ خصوصی گفتگو کی جس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

وقت: پاکستان کو اس وقت درپیش مسائل کی وجہ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان کے مسائل و مشکلات کی بنیادی وجہ یہاں کا سیاسی نظام ہے۔ قیام پاکستان کے بعد عرصہ دراز تک ہم اپنا دستور بنانے میں ناکام رہے اور پہلا دستور 1956ء میں بنا اور پھر مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ پاکستان میں سیاسی استحکام روزِ اول سے ہی قائم نہیں ہوسکا۔ کبھی یہاں فوجی آمریت آ گئی اور کبھی صدارتی نظام قائم ہوگیا۔ پاکستان میں مستحکم سیاسی نظام تشکیل ہی نہیں دیا جاسکا۔ سیاسی عدم استحکام کے باعث ہی ملک تقسیم ہوا اور عوام میں مایوسی پائی جاتی ہے۔ ملک سے جاگیرداری نظام کو ختم نہیں کیا جاسکا اور زرعی اصلاحات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ اگر یہاں جمہوری حکومت بھی قائم ہوئی تو اس پر بھی وہی جاگیردار قابض رہے۔ دوسری جانب ملک میں صنعتی انقلاب بپا نہیں ہوسکا۔ پیداواری شرح نہیں بڑھائی جاسکی۔ آبادی میں تیزی سے اضافے سے پیداواری رسد و طلب میں توازن قائم نہ رہ سکا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد ملک سے باہر منتقل ہوچکی ہے۔ ان سب عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرائم، فسادات،

لسانی وفرقہ وارانہ فسادات نے جنم لیا۔ اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے طویل عرصہ درکار ہے۔ حکمران طبقہ عوام کے مسائل اور پریشانیوں کی جانب بالکل کوئی توجہ نہیں دے رہا۔

وقت: پاکستان میں تاریخ کو مسخ کرنے کا آغاز کب ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان میں تاریخ کو مسخ کرنے کا کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب تاریخ کے شعبہ کو ریاست کے دائرہ اختیار میں لایا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتداء سے ہی یہ رجحان قائم ہوگیا کہ پاکستان کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنا چاہئے اور اس ضمن میں پاکستان کی تاریخ کو ہندوستان کی تاریخ سے الگ کر کے پیش کیا گیا۔ نصابی اور حتیٰ کہ تحقیقی کتابوں میں بھی ہندوستان اور پاکستان کے فرق کو تاریخی و ثقافتی حوالوں سے الگ الگ کر کے پیش کیا گیا۔ ابتداء میں یہ کام اشتیاق قریشی، معین اکرام اور احسن اکرام جیسے ریاست نواز مؤرخین نے سرانجام دیا۔ بعدازاں ایوب خان کے دور میں پاکستان کی تاریخ کو ایک نئے انداز سے لکھا گیا اور ان مؤرخین میں دانی، عبدالرشید اور ضمیر چغتائی شامل تھے۔ ایوب دور میں بھی یہی کوشش کی گئی کہ ایسی تاریخ لکھی جائے جس میں پاکستان کی تاریخ کو ہندوستان کی تاریخ سے مکمل طور پر الگ کر دیا جائے۔ تاریخ نویسی کا تیسرا دور 71 کے بعد شروع ہوا۔ اس دور کے اہم مورخین میں دانی اور قدرت اللہ فاطمی شامل تھے۔ اس وقت اس نظریہ پر زور دیا گیا کہ پاکستان جس خطے میں واقعہ ہے، یہ طبعی، سماجی و تاریخی طور پر ہندوستان کے بجائے مشرق وسطیٰ کے زیادہ قریب تر ہے اور پاکستان کا مشرق وسطیٰ میں شامل ہونا زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس دور میں تاریخی حوالے سے یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی کہ پاکستان کا علاقہ محض پانچ چھ سو سال ہی ہندوستان کا حصہ رہا، اس سے قبل یہ مشرق وسطیٰ کا حصہ تھا۔ 71ء کے بعد لکھی جانے والی تاریخ کی کتابوں اور نصابی کتابوں میں بھی تاریخ کو بڑی حد تک مسخ کر کے پیش کیا گیا۔

وقت: پاکستان میں تاریخ نویسی کو سب سے زیادہ نقصان کس دور میں پہنچا؟

ڈاکٹر مبارک علی: میرے خیال میں پاکستان میں تاریخ نویسی کو سب سے زیادہ نقصان 71ء کے بعد پہنچا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد پاک بھارت دشمنی کی آگ کو مزید بڑھاوا دیا گیا۔ اس موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ وہ اگر ضرورت پڑی تو بھارت کے ساتھ سو سال تک بھی جنگ جاری رکھیں گے۔ دوسری جانب نصابی کتب میں دشمنی پر مشتمل مواد کا بے پناہ اضافہ کیا گیا۔

وقت: آپ نے تاریخ کو معروضی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی، اس حوالے سے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ لکھتے ہوئے معروضیت کو ملحوظِ خاطر رکھنا ایک کٹھن کام ہے۔ لیکن میں نے کوشش کی کہ تاریخ اس انداز میں لکھی جائے کہ اس میں نفرت کا عنصر شامل ہو اور نہ ہی یہ نفرتوں کے فروغ کا باعث بنے۔ تاریخ لکھتے ہوئے حالات کا تجزیہ نہایت ضروری ہے۔ تاریخ ماضی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

تاریخ کو سمجھنا اور اس کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے کیونکہ حال کے مسائل کا حل ماضی کی غلطیوں کی روشنی میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور یہ شعور کی پختگی کے لیے ضروری ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا، اس میں کوشش کی کہ تاریخ کو مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔ ہمارے یہاں تاریخ میں یہ اکثر فاتحین ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی سکالرز، شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور سائنس دانوں کو اپنا ہیرو نہیں بنایا جو کہ قطعی طور پر غلط طرزِ عمل ہے۔ لہٰذا اہم ہیروز نہ ہونے کی صورت میں افغانستان اور مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے فاتحین کو ہیرو بنا لیتے ہیں جو کہ تاریخی اعتبار سے ایک سنگین غلطی ہے اور اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

وقت: آپ کے نزدیک تاریخی نویسی کے لیے بنیادی مآخذ کون کون سے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ کے بنیادی مآخذ کئی ہیں، جیسا کہ عہدِ حاضر میں لکھی ہوئی تاریخی کتب اور آثارِ قدیمہ وغیرہ۔ زمانی تجربات بھی تاریخ کا مآخد ہیں جیسا کہ تقسیمِ ہند کے وقت جن لوگوں کو ہجرت کا تجربہ ہوا اور انہوں نے فسادات کو قریب سے دیکھا، یہ واقعات بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب پانچ ہزار سال قدیم ہے جبکہ مہر گڑھ کے آثار سات ہزار سال سے زیادہ پرانے ہیں۔ اس زمانے کی کتابیں، سکے اور دیگر اشیا بھی اس دور کی تاریخ لکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ موجودہ دور میں انٹرنیٹ کی سہولت سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم پہلو زبان کا ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور بنگالی کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور دیگر مقامی زبانیں بھی تاریخ لکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ عہدِ حاضر میں مختلف تحقیقی طریقۂ کار تشکیل دیئے جا چکے ہیں کہ متن کو کس طرح پڑھنا چاہئے اور مختلف مآخذوں سے حاصل ہونے والے مواد کے تجزیہ کے بعد اپنی رائے قائم کرنی چاہئے۔ واقعات اور واقعات کی شہادتیں اور ان کی تشریح یا تفسیر تاریخ نویسی کا بنیادی کلیہ ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے مؤرخ نظریاتی حوالے سے تاریخ قلم بند کر رہے ہیں جن قوم پرست، فرقہ وارانہ، مارکسی، روشن خیال اور حقوقِ نسواں کے نظریات نمایاں ہیں۔

وقت: عہدِ حاضر میں پاکستان میں کس قسم کی تاریخ لکھی جا رہی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس وقت پاکستان میں نظریاتی حوالے سے تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ ایک نظریاتی ملک ہونے کے ناطے یہاں نظریاتی تاریخ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مؤرخ سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں قوم پرست نقطۂ نظر سے بھی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ پاکستان میں ہنوز سماجی و ثقافتی نقطۂ نظر سے تاریخ لکھنے کا رواج نہیں قائم ہوا، چنانچہ ہمیں اس جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

وقت: کسی بھی تحقیق یا تاریخی حوالے کے لئے مقامی مؤرخین مغربی مصنفین کی کتابوں پر زیادہ انحصار کرتے ہیں، کیا یہاں کے مورخین کی لکھی ہوئی تاریخ مستند نہیں ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: ہمارے پاس اس قدر ذرائع نہیں ہیں کہ ہم اپنی تاریخ معروضی انداز میں مرتب کر سکیں۔ مغربی ممالک کے ماہرین جدید ذرائع اور طریقۂ تحقیق کے حامل ہیں اور اسی لئے ان کی تحقیق کو مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے کسی مؤرخ نے ایسی تاریخ نہیں لکھی جسے مستند اور معروضیت کی حامل قرار دیا جاسکے۔ لہٰذا جب ہم کسی غیر ملکی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھتے ہیں تو دراصل ہم اپنی تاریخ کو باہر والوں کی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جس سے ہم میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوسکتی۔

وقت: قیام پاکستان کے وقت سب سے زیادہ فسادات پنجاب میں ہوئے، اس کی کیا وجوہات تھیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: تقسیم کے وقت پنجاب میں فسادات کی زیادہ ذمہ داری سکھوں پر عائد ہوتی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت سکھوں کو اندازہ نہیں تھا کہ لاہور اور سکھ اکثریتی آبادی والے دیگر علاقے پاکستان میں شامل کر لئے جائیں گے۔ لہٰذا جب لاہور کو مغربی پنجاب اور کلکتہ کو مغربی بنگال میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو سکھ کشمکش کا شکار ہو گئے اور انہوں نے فسادات کی آگ کو بھڑکایا۔ کچھ علاقوں میں فسادات جاری تھے جو کہ بعد میں زیادہ ہولناک شکل اختیار کر گئے۔ دوسری جانب سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں نچلے اور متوسط طبقے کے ہندو آباد تھے اور وہ بھارت ہجرت کر چکے تھے۔

وقت: سقوط ڈھاکہ کے کیا محرکات تھے؟ بعض تجزیہ نگاروں کے خیال میں اردو کو قومی زبان قرار دینے اور بنگال کی سیاسی قیادت کو نظر انداز کرنے پر اہلِ بنگال میں قوم پرست جذبات کو ہوا ملی؟

ڈاکٹر مبارک علی: قائداعظم نے 1948ء میں ڈھاکہ میں ایک تقریر کی جس میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر صوبے کو صوبائی زبان رائج کرنے کا حق ہوگا، جیسا کہ بنگال میں بنگالی۔ البتہ اگر اس موقع پر دیگر زبانوں کو بھی قومی زبان قرار دے دیا جاتا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ دوسرا، بنگال اور مغربی پاکستان کی سیاست میں بہت فرق تھا۔ بنگال میں 1951ء میں صوبائی حکومت نے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر دیا تھا جبکہ پاکستان میں ہنوز ایسا نہیں ہوسکا۔ وہاں کے سیاست دانوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ جمہوریت کے حامی تھے جبکہ یہاں کے سیاست دان مرکز پر اپنی گرفت قائم رکھنا چاہتے تھے۔ تعلیمی میدان، بیوروکریسی، فوج اور صنعتی شعبوں میں انہیں پیچھے دھکیلا گیا جس سے ان کے اندر احساس محرومی پیدا ہوا اور 1965ء کے بعد اس کی شدت مزید بڑھی، جب انہیں احساس ہوا کہ ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سیاست دانوں اور فوج کی غلطیوں کا خمیازہ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آیا۔ ان کے پاس آزادی حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

وقت: قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس سوال کا جواب قائداعظم کی 11 اگست 1948ء کی تقریر میں واضح طور پر موجود ہے کہ قائداعظم ایک سیکولر ملک چاہتے تھے جہاں تمام مذاہب کے ماننے والے آزادی کے ساتھ زندگی بسر

کر سکیں لیکن 1949ء کی قراردادِ مقاصد کے بعد قائداعظم کی اس تقریر کی اہمیت اس طرح قائم نہیں رہتی۔ 1949ء میں قراردادِ مقاصد سامنے آئی۔ اور بعدازاں ذوالفقار علی بھٹو دور میں ریاستی امور میں مزید تبدیلیاں کی گئیں جن کا جنرل ضیاء الحق نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

وقت: افغانستان میں دیرپا امن قائم نہ ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی: اس ضمن میں افغانستان کے جغرافیائی حالات انتہائی اہمیت کے حامل ہے اور وہاں مختلف قبائل آباد ہیں۔ ماضی میں بھی جب وہاں بادشاہت قائم تھی تو اس کا دائرہ کار بھی محض کابل اور اس کے گردونواح تک محدود تھا۔ ایسا کبھی ممکن نہیں ہوا کہ تمام افغانی اپنے مفادات کے لئے ایک مرکز پر جمع ہوئے ہوں۔ دوسرا بنجر اور سنگلاخ علاقہ ہونے کی وجہ سے زرعی پیداوار بھی محدود ہے۔ لہٰذا وہاں سے لوگوں کا برصغیر کی جانب ہجرت کرنا معمول رہا اور حملہ آور بھی اس خطے کا رُخ کرتے رہے۔ اس وقت وہاں صنعت وزراعت نہیں ہے جس کے باعث افغانستان میں امن قائم نہیں ہو پا رہا۔

وقت: حال ہی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان امن مذاکرات ہوئے۔ 65 سال گزرنے کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان دیرپا امن قائم نہیں ہوسکا۔ اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان اور بھارت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جانا ہے۔ اس ضمن میں نصابی کتب میں شامل نفرت آمیز مواد نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاست دانوں کا کردار بھی نہایت منفی رہا ہے۔ جب کبھی پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات یا امن کی کوششوں کا آغاز ہوتا ہے تو کوئی ایسا سانحہ رونما ہو جاتا ہے جس کے باعث دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کشیدگی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کا دورہ پاکستان قیام امن کی جانب ایک اہم قدم تھا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ہی کارگل جنگ کے باعث حالات پھر کشیدگی کا شکار ہو گئے۔

وقت: کیا پاکستان اور بھارت کے مابین تاریخ وتحقیق کے لئے کوئی مشترکہ پلیٹ فارم موجود ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: بدقسمتی سے پاکستان اور بھارت کے مابین تاریخی موضوعات پر تحقیق کے لئے کوئی پلیٹ فارم موجود نہیں ہے۔ پاکستانی مؤرخین کو بھارت کے آثار قدیمہ اور تاریخی مسودات تک رسائی حاصل ہے، نہ ہی بھارتی مورخین کو یہاں آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے۔ دونوں ممالک کی تاریخ مشترک ہے، چنانچہ تاریخ مرتب کرتے ہوئے بھی یہ خلا برقرار رہتا ہے۔

وقت: پاکستان میں تاریخ وتحقیق کا کیا معیار ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان میں تاریخ کے شعبہ پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ یہاں پر نصابی سطح پر بھی تاریخ کا مضمون درست طور پر نہیں پڑھایا جا رہا اور اس حوالے سے کوئی بین الاقوامی سطح کا

معیار بھی موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہاں پر عالمی معیار کی تحقیق اور مؤرخین پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

وقت: گزشتہ کچھ عرصہ سے پاکستان میں نئے صوبوں کے قیام کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ تاریخی حوالے سے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی: نئے صوبوں کا قیام کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ پاکستان کا بنیادی مسئلہ عوام کا احساس محرومی اور جاگیرداری نظام ہے۔ وہ لوگ جو نئے صوبوں کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا تعلق بھی اسی جاگیردار اشرافیہ سے ہے۔ نئے صوبوں کے قیام سے یہ لوگ پسماندہ عوام کی حق تلفی کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کو بہتر سہولیاتِ زندگی مہیا کی جائیں۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو اور معاشی ترقی کی جانب توجہ دی جائے۔

(غیر مطبوعہ)



تاثرات

مکران کی دریافت

تربت اور گوادر کا سفر

جب کراچی سے جہاز تربیت کے لئے اڑا تو مسافروں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ جو خلیج میں ملازمت کے لئے گئے ہوئے ہیں، اور اب عید کے موقع پر اپنے گھر جا رہے تھے، ان کے پاس گھر والوں کے لئے چھوٹے چھوٹے تحفے تھے، سامان کو رسیوں سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا تھا، تا کہ محفوظ رہے۔ ہوائی جہاز کا عملہ ان لوگوں سے کوئی تعاون نہیں کر رہا تھا۔ ایئر ہوسٹس ایک بیزاری کے عالم میں ادھر سے ادھر جا رہی تھی۔ غریب لوگ اگر جہاز میں سفر کریں تب بھی ان کی عزت نہیں ہوتی ہے، حالانکہ کرایہ وہ پورا دیتے ہیں۔ جبکہ فوجیوں، صحافیوں اور پی۔ آئی۔ اے کے عملہ کے لئے کرایہ آدھا یا اس سے زیادہ معاف ہے۔ جہاز میں بھی مراعاتی اور غیر مراعاتی طبقوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ میرا تجربہ ہوا کہ یورپ آتے ہوئے جہاز کا عملہ بڑا تمیز دار ہوتا ہے، مگر جیسے ہی دوبئی سے ورکرز سوار ہوئے، ان کا رویہ اور لہجہ بھی بدل جاتا ہے۔ ان غریب لوگوں میں بڑی قوت برداشت ہے۔ وہ اس سلوک کو خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے، میرا سفر کوئی خوشگوار نہ تھا۔ مگر جیسے ہی تربت کے ائیر پورٹ پر اترا، تو سامنے ایک نوجوان میری کتاب ''تاریخ اور دانشور'' لئے کھڑا میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھا، میرا سامان لیا اور ایک طرف ہوتے ہوئے کہنے لگا: ''اس کتاب پر کچھ لکھ دیجئے، بعد میں شاید آپ کو فرصت ملے یا نہ ملے۔'' جب میں نے کتاب پر دستخط کر دیئے تو اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر مالک باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

باہر ڈاکٹر مالک ہی نہ تھے، ان کی جیپ بھی تھی، تربت آنے پر خوش آمدید کہا، اور ضد کرتے ہوئے گاڑی کی اگلی آرام دہ سیٹ پر مجھے بٹھایا۔ میں نے پوچھا کہ ان دوستوں کا کیا حال ہے کہ جو بذریعہ بس کراچی سے تربت آئے ہیں۔ کہنے لگے وہ صبح پانچ بجے پہنچے ہیں اور اب ہوٹل میں سو رہے ہیں۔

ہوٹل جاتے ہوئے میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ چٹیل خشک میدان، جگہ جگہ جھاڑیاں، بے آب و گیاہ زمین، کوئی رونق نہیں تھی۔ جدھر نظر دوڑاؤ وسیع میدان ہی میدان نظر آتا تھا۔ شہر میں داخل ہوئے تو کچے مکانات اور گلیاں تھیں، شہر میں بھی سڑکوں کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ

میں قرونِ وسطیٰ میں آ گیا ہوں۔ میرے ذہن سے اچانک شہر کی رونق، شاہراہیں، چمک دمک غائب ہوگئی اور میں جدید زمانہ سے نکل کر ماضی کے قدیم دور میں داخل ہوگیا۔

مکران کا میرا یہ پہلا سفر تھا۔ اس کا انتظام بلوچستان نیشنل موومنٹ اور میوچل ایڈ سوسائٹی نے کیا تھا۔ میرا کراچی آنا ویسے تو ہوتا رہتا ہے مگر اس بار آغا خاں یونیورسٹی میں دو لیکچر دینے آیا تھا۔ آغا خاں یونیورسٹی کراچی کے مرکز میں واقع، خوبصورت اور دلکش عمارت ہے۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ کلاس رومز جدید طرز کے ہیں۔ اس کا نیا اسپورٹ سینٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یورپ اور امریکہ میں آ گیا ہوں۔ جمنازیم، سوئمنگ پول، جاگنگ ٹریک اور پھر کیفے ٹیریا میں تازہ جوس۔ پاکستان میں ایسے جزیرے موجود ہیں کہ جو بقیہ آبادی سے کٹے ہوئے اپنے حصار میں قلعہ بند ہیں۔ معاشرہ اور اندرونی اور بیرونی دنیاؤں میں بٹا ہوا ہے۔ جو جزیرے میں آباد ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ دونوں دنیائیں ایک دوسرے سے بے خبر اپنے آپ میں مگن ہیں۔ پھر یہ فرق شہروں میں ہی نہیں، صوبوں میں بھی ہے، جس کا اندازہ مکران جا کر اور زیادہ ہوا۔ کہنے کو تو دنیا سمٹ رہی ہے، مگر پاکستانیوں کے لئے اس کے اپنے علاقے اور آبادیاں دور ہو رہی ہیں۔ کراچی سے تربت جانے کے لئے چودہ سے سولہ گھنٹے چاہئیں کیونکہ دونوں شہروں کو ملانے کے لئے کوئی سڑک نہیں ہے۔ کچا راستہ ہے۔ میرے جو ساتھی بہترین بس میں سفر کرتے ہوئے جب چودہ گھنٹے میں تربت پہنچے ہیں تو ان میں سے کئی زخمی ہو چکے تھے، کیونکہ بس کے جھٹکوں نے انہیں نہ تو سونے دیا تھا اور نہ ہی صحیح وسالم رکھا تھا۔

ہوٹل پہنچنے پر ڈاکٹر مالک نے بتایا کہ تربت میں ہمارے پروگرام میں تین چیزیں ہیں۔ قریب ہی آثارِ قدیمہ کو دیکھنا کہ جہاں فرانسیسی ماہر آثارِ قدیمہ کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد شہر کے خاص خاص لوگوں سے ملاقات اور لنچ اور عصر کو ہوٹل کے ہال میں لیکچر۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم تربت کے باہر اس جگہ کو دیکھنے گئے کہ جہاں فرانسیسی ماہرین آثارِ قدیمہ نے ایک ٹیلہ کی کھدائی کی ہے۔ اس ٹیم کے سربراہ موسیو رولینڈ بیوال ہیں۔ ان کے ساتھ کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں فرانس سے ان کی مدد کو آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو تربیت دے کر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ احتیاط سے کھدائی کرتے ہیں اور زمین میں مدفون اشیاء کو باہر نکالتے ہیں۔ ٹیلہ میں کئی قبریں ملیں کہ جن میں مُردہ دفن تھے۔ ان کے ساتھ دفن کیا ہوا سامان بھی ملا۔ یہاں سے جو کچھ ملتا ہے وہ کیمپ میں لیجا کر اس کی صفائی کرتے ہیں، اور پھر اس کی تاریخ اور ہیئت کے بارے میں تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی پاکستانی ماہر نہیں کہ جو ان کے ساتھ مل کر تربیت حاصل کرتا۔ ٹیم کے ساتھ مقامی لوگ بڑا تعاون کر رہے ہیں۔ موسیو رولینڈ نے بتایا کہ وہ ایران اور مکران کے درمیان ثقافتی تسلسل کو دریافت کر رہے ہیں اور یہاں سے جو بھی نتائج برآمد ہو رہے ہیں انہیں یورپ کے جرنلز میں شائع کراتے رہتے ہیں۔

اس سے پہلے بھی 1974ء میں فرانسیسی ماہرین نے کچھی صحرا میں مہر گڑھ کے آثار دریافت کئے تھے جو کہ بولان دریا کے خشک ہونے کے بعد ویران ہو گیا تھا۔ مہر گڑھ کی دریافت نے بلوچستان کی تہذیبی حیثیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس کی کھدائی کے بعد جو نتائج آئے وہ یہ تھے مکانات کچی اینٹوں کے بنائے جاتے تھے۔ اناج کو ذخیرہ کر کے رکھا جاتا تھا، اور معاشرہ مل کر اسے استعمال کرتا تھا۔ لوگ مُردوں کو دفن کرتے تھے اور ان کے ساتھ ضرورت کا سامان بھی رکھ دیتے تھے۔

تربت کے قریب آثار کی دریافت اور اس کے نتائج بلوچستان کو اور زیادہ تہذیبی اہمیت کا بنا دیں گے۔ ان نتائج کے بعد بلوچستان کی تہذیب وادیٔ سندھ کی تہذیب سے قدیم ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان دریافتوں کے پیچھے پاکستانیوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ غیر ملکی لوگ ہیں کہ جو ہماری تاریخ کو تشکیل کرنے میں ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے تعلیمی اداروں اور ریسرچ کے اداروں کی پسماندگی ظاہر ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان آثار کے بارے میں اب تک نہ تو پاکستان کے لوگوں کو علم ہے اور نہ ہی یہ نصاب کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جب کہ بلوچستان کی نصاب کی کتابوں میں چاغی میں بم کے دھماکے فوراً شامل کر لئے گئے ہیں۔

آثارِ قدیمہ کی یہ دریافتیں یقیناً بلوچستان کے لوگوں میں تاریخی شناخت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کریں گی۔

یہاں سے ڈاکٹر مالک ہم لوگوں کو اپنے فارم پر لے گئے۔ چٹیل اور خشک ماحول میں اگر درخت اور پانی مل جائے تو اچانک ذہن بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ درختوں کے سائے میں فرش پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے، موسم خوشگوار تھا، آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے، بحث رسمی بات چیت کے بعد سیاست پر آ گئی۔ ہر ایک کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ ملک کا کیا ہوگا؟ حالات کدھر جا رہے ہیں؟ کیا بہتری کی کوئی امید ہے یا نہیں؟ حاضرین میں سے اکثر میڈیکل ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور کچھ سرکاری ملازمین تھے۔ سب ہی نے کراچی میں تعلیم پائی تھی۔ اس لئے ان کا کہنا تھا کہ کوئٹہ سے زیادہ ان کا تعلق کراچی سے ہے۔ تاریخی طور پر بھی کراچی بلوچستان کا ہی ایک حصہ تھا۔ وہاں لیاری کے بلوچ یہاں ہی سے گئے ہوئے ہیں۔ جب بات سیاست کی ہوئی تو سب ہی نے پنجاب کی بالادستی پر تنقید کی اور سوال کیا کہ آخر کب تک پنجاب پاکستان پر حکومت کرے گا۔ میں نے کہا کہ ''ذرا مسئلہ کو وسیع تناظر میں دیکھیں۔ قوم پرست تحریکیں اپنے سرداروں اور وڈیروں کو اپنا تسلیم کر کے ان کے مظالم اور ان کے طبقاتی کردار کو بھول جاتی ہیں۔ قوم پرستی کا فائدہ ہمیشہ اعلیٰ طبقے اٹھاتے ہیں۔ اس لئے پنجاب سے مقابلہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے حکمران طبقوں کی مخالفت کی جائے، اس کے عوام بھی استحصال شدہ ہیں، انہیں ساتھ ملا کر طبقاتی بنیادوں پر جدوجہد کی جائے۔''

اس پر ایک ساتھی نے کہا کہ ''کیا پنجاب کے مظلوم طبقوں میں طبقاتی شعور بیدار کرنے کی ذمہ داری بھی ہماری ہے؟'' اس جواب نے مجھے خاموش کر دیا۔ میں نے سوچا کہ کہاں ہیں وہ پنجاب کے دانشور کہ جو طبقاتی جدوجہد کی بات کرتے تھے۔ جواب ملا کہ اب یہ این۔ جی۔ اوز میں ہیں اور اپنا طبقاتی درجہ بلند کرنے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا اگر خود پنجاب میں ایسی کوئی تحریک نہیں تو پھر بلوچستان اور سندھ کیا کریں؟ یقیناً پنجاب سے نفرت بڑھتی چلی جائے گی جو آگے چل کر ملک کے لئے تباہ کن ہوگی۔

لوگوں کے لہجہ میں تلخی تھی، غصہ اب تک نہیں تھا، ان میں محرومی کا احساس جھلکتا تھا۔ تربت کی ساری معیشت کا دارومدار ایران پر ہے، اناج، سبزی، پھل، پٹرول اور ہر چیز ہی ایران سے آتی ہے۔ شہر میں جگہ جگہ پٹرول اور ڈیزل کے ڈرم رکھے ہیں۔ پٹرول 13 روپیہ لیٹر ہے۔ دوستوں نے کہا کہ پاکستان سے صرف حکمراں آتے ہیں، خفیہ ایجنسیوں کے لوگ آتے ہیں، تاکہ لوگوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جائے۔ کہنے لگے کہ ''ہم میں سے ہر ایک ملک دشمن اور باغی نظر آتا ہے۔'' میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں ان کی گفتگو سے سیکھتا رہا کہ لوگوں کے جذبات کیا ہوتے ہیں؟ محرومیاں اور مایوسیاں کس شدت سے اپنا اظہار کرتی ہیں؟ اگر ملک لوگوں کو نظر انداز کر دے، تو لوگوں کا اس سے کیا تعلق رہ جاتا ہے؟

تربیت کی آبادی چھ یا ساڑھے چھ لاکھ کی ہے۔ اکثر مقامات کچی مٹی کے ہیں، پورے شہر میں کوئی خاص عمارت نظر نہیں آتی، سڑکیں برائے نام ہیں۔ شہر کی معیشت کا دارومدار ان لوگوں کی آمدنی پر ہے کہ جو خلیج میں ملازمت کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ پیداوار میں کھجوریں خاص ہیں۔ تربت کو دوسرے شہروں سے ملانے کے لئے کوئی سڑکیں نہیں ہیں۔ لہٰذا شہر مٹی و گرد میں اٹا ہوا خاموش اور اداس شہر ہے۔

چار بجے میرا لیکچر تھا جس کا عنوان تھا ''جاگیرداری، سرداری نظام اور مذہبی انتہا پسندی'' کوئی 200 کے قریب لوگ جمع تھے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ بلوچستان کے کلچر میں ابھی بھی رواداری ہے اس لیکچر میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ تھے۔ لوگوں نے بڑے تحمل اور خاموشی سے تقریر سنی۔ آخر میں خوب سوالات کئے۔ مگر بحث نہیں کی۔ چائے کے وقت بڑی تعداد ملنے آئی۔ ان میں سے اکثر نے میری کتابیں پڑھیں تھیں۔ سوالات ہوتے رہے۔ لوگ اپنے خدشات بیان کرتے رہے۔ مسائل کا حل تلاش کرتے رہے۔ یہ نوجوان اس ملک اور اس معاشرے میں اپنے مستقبل کی تلاش میں تھے۔ کیا سہانا اور آرام دہ مستقبل انہیں ملے گا یا نہیں؟ اور کیا یہ خاموشی سے استحصال اور محرومی کو برداشت کرتے رہیں گے؟ اگر کرتے رہے تو کب تک!!!

دوسرے دن تربت سے گوادر جانا تھا۔ جب شہر سے نکلے تو معلوم ہوا کہ ان دونوں شہروں کے درمیان کوئی سڑک نہیں ہے، کچا راستہ ہے۔ بعض جگہ تو یہ کچا راستہ بھی نہیں تھا۔ گاڑی جھاڑیوں میں ہوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک طرف موٹروے ہے تو دوسری طرف یہ کچی سڑکیں اور راستے۔ موٹروے

والے محب وطن ہیں، اوران کچی سڑکوں پر سفر کرنے والے مشتبہ لوگ ہیں۔ راستہ میں میدان بھی تھے تو پہاڑ بھی۔ کبھی کبھی یہ راستہ کچی مٹی کی چٹانوں کے درمیان سے گزرتا تھا، یہ مٹی کی چٹانیں بارش اور ہواؤں کی وجہ سے تراشے ہوئے مجسمے معلوم ہوتی تھیں۔ اگر راستہ میں گاڑی خراب ہو جائے تو اس کی مرمت کی کوئی امید نہیں ہوتی ہے راستہ ویران وسنسان ہے۔ کہیں ایک آدھ جگہ دور جھونپڑی ضرور نظر آئی، ورنہ نہ آدم نہ آدم زاد، نہ درخت، نہ سبزہ، ویران و بے آب وگیاہ دشت ہے۔

تربت سے گوادر پہنچنے میں ساڑھے چار گھنٹے لگے۔ لیکچر کا وقت گیارہ بجے کا تھا، مگر کوئی ایک گھنٹہ دیر سے پہنچے۔ لوگ ہال میں بیٹھے منتظر تھے۔ گوادر کی آبادی 60 یا 70 ہزار کی ہے۔ حاضرین 60 یا 70 کے قریب تھے۔ لیکچر کا موضوع وہی تھا جو تربت میں دے آیا تھا۔ مگر سوالات مختلف تھے۔ خاص طور سے مجھے ایک سوال اچھی طرح سے یاد ہے۔ ایک نوجوان نے کہا کہ ”آپ ہمارے سرداری نظام کو برا کہتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سردار ہی برے وقت میں ہمارے کام آتے ہیں۔ ہماری مدد کرتے ہیں۔ ہمارا تحفظ کرتے ہیں۔“

میں نے کہا کہ ”آپ کی بات درست ہے۔ مگر اس تحفظ اور مدد کے عوض آپ ایک بڑی قیمت ادا کرتے ہیں، یعنی اپنی آزادی، عزت، وقار۔ آپ کا اور سردار کا رشتہ، آقا اور غلام کا ہوتا ہے، وہ آپ سے وفاداری کی توقع رکھتا ہے، اس کے بدلہ میں آپ کی مدد کرتا ہے اگر آپ کو یہ سودا منظور ہو تو بخوشی آپ سرداری نظام کو برقرار رکھیں۔“

سوالات میں پنجاب کی بالادستی پر لوگوں نے کھل کر بات کی۔ کہنے لگے گوادر میں کوسٹ گارڈز، خفیہ ایجنسیوں کے لوگ، فوجی چوکیوں پر تعینات لوگ سب پنجابی ہیں۔ یہ لوگ بسوں سے مسافروں کو اتار کر ان کی تلاشی لیتے ہیں، ان کی بے عزتی کرتے ہیں، آخر ہم یہ سب کب تک برداشت کریں؟ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ گوادر آتے ہوئے جب ہم چیک پوسٹ پر پہنچے تو وہاں ایک نوجوان فوجی نے پہلے معلومات کیں کہ ہم کون ہیں۔ گوادر کیوں جا رہے ہیں؟ اس کے بعد جانے کے لئے راستہ دیا۔

لیکچر کے بعد میں نے پوچھا کہ ہم تو سنتے آرہے ہیں کہ گوادر میں ترقی ہو رہی ہے، اس کی بندرگاہ کو وسیع کیا جا رہا ہے؟ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ تو ہم بھی سن رہے ہیں۔ مگر گوادر آپ کے سامنے ہے۔ دیکھ لیجئے کہاں ترقی ہو رہی ہے۔

اس کے بعد گاڑی میں بٹھا کر وہ لوگ پہاڑ کے اوپر لے گئے۔ کیا خوبصورت نظارہ تھا، صاف وشفاف سمندر کا پانی۔ یہاں ایک آبادی کی بنیاد رکھی گئی ہے کہ جہاں پاکستان کے حکمران طبقوں کے پلاٹ ہیں۔ ابھی مکانات نہیں بنے ہیں، مگر یہاں سڑکیں بن گئی ہیں۔ شاید لوگ اس انتظار میں ہوں کہ گوادر بڑی بندرگاہ بنے اوران کے پلاٹ سونے کے داموں بکیں۔

بلوچستان میں مکران کا یہ علاقہ معاشی طور پر تو پسماندہ ہے، مگر ذہنی اور سیاسی طور پر نہیں۔ نوجوانوں میں پختہ سیاسی شعور ہے۔ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ معاشی پسماندگی نے انہیں ذہنی طور پر پسماندہ نہیں بنایا ہے۔

میرے لئے مکران کا یہ سفر، لوگوں سے بات چیت ایک نئی دریافت ثابت ہوئی، اور یہ خود بھی سوچتا رہا اور دوستوں سے سوال بھی کرتا رہا کہ پاکستان کے حکمراں طبقوں نے مشرقی پاکستان کے المیہ سے کچھ نہیں سیکھا۔ پنجاب کے حکمرانوں نے، غیر پنجابیوں سے عزت و وقار کے ساتھ بات کرنا نہیں سیکھی۔ ان کے ذرائع کو استعمال کر کے انہیں پسماندہ کر دیا۔ اہل بلوچستان اس کا اظہار کئی مرتبہ کر چکے ہیں، ان کی مزاحمتوں کو قوت سے کچل تو دیا گیا ہے مگر ان کے اندر زخم ابھی بھی تازہ ہیں۔ مجھے یہ قول یاد آ رہا ہے کہ جو قومیں تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتی ہیں۔ وہ سزا کے طور پر تاریخ کو بار بار دہراتی ہیں۔ مگر اس سزا کی قیمت بھی غریب اور مجبور عوام کو دینی ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے بحران نے کس کو متاثر کیا، عام لوگوں کو، حکمران طبقے پر تو اس بحران کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ جب حکمرانوں کو اپنی بدعنوانیوں کی قیمت چکانا ہوتی ہے تو یہ بڑی بھاری قیمت ہوتی ہے۔ جب آتش فشانوں سے لاوا اُبھلتا ہے تو وہ ہر شے کو تہس نہس کر کے جلا دیتا ہے۔ شاید ہمارے حکمران طبقے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔



سندھ کی آواز

کراچی سے حیدر آباد کے لئے جب مسافر بس اسٹینڈ پر پہنچتا ہے تو اس پر مختلف بسوں کے کنڈکٹرز ٹوٹ پڑتے ہیں، ایک مرتبہ جب مسافر بس کے اندر چلا جاتا ہے تو وہ ان کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ اگر بس میں مسافر زیادہ نہ ہوں تو انہیں کسی دوسری بس کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ خود سے بس تبدیل کرنا چاہے تو اس کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ اب مسافروں کے احتجاج کے حق کو پوری طرح سے چھین لیا جاتا ہے اور وہ کنڈکٹروں کے قابو میں ہوتا ہے۔

میں جس بس میں سوار ہوا، اس میں پوری آواز کے ساتھ ریکارڈنگ جاری تھی۔ موسیقی کے بارے میں بس کے مسافروں کا اور بس کے ڈرائیور کا تصور ہے کہ اسے زور شور سے بجایا جائے۔ شاید لوگوں کے اندر جو تناؤ اور پریشانی ہے اسے اس شور کے اندر ڈبونا چاہتے ہوں۔ بس میں جو گانے بجائے جا رہے تھے وہ شوقیہ گانے والوں کے تھے، کوئی مکیش کی آواز میں گا رہا تھا، تو کوئی رفیع کی۔ اب ہر اصلی چیز گم ہوتی چلی جا رہی ہے اور نمبر دو کی ہر جگہ مانگ ہے۔ پتہ نہیں جب کہ اصلی گانے مل جاتے ہیں تو پھر ان نقلی گانے والوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے معاشرہ کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نقل اور تقلید کی جانب تیزی سے رواں دواں ہے۔ تخلیقی صلاحیتیں نہ صرف معاشرہ سے ختم ہو گئیں بلکہ لوگ بھی ان کی جگہ گھسی پٹی روایات کو چاہتے ہیں، چاہے وہ وقت کے ساتھ نمبر دو یا تین کی شکل میں ہی کیوں نہ ہوں، اور المیہ یہ ہے کہ اس نقل سے خوش ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔

جب بس چلی تو ڈرائیور نے پریشر ہارن پر ہاتھ رکھ دیا، جو اس قدر زور سے بجتا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں، اس کی خواہش تھی کہ اس کے سامنے ہر سواری ہٹ جائے اور راستہ صرف اس کے لئے کھلا رکھا جائے۔ اس سے بھی معاشرہ کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں دوسروں کو شریک کرنے یا ان کو جگہ یا حق دینے کا جذبہ ختم ہو گیا ہے۔ ہر فرد صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور زبردستی، زوری، یا غنڈہ گردی سے اپنے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔ چاہے اس کے نتیجہ میں سامنے والا نقصان ہی کیوں نہ اٹھائے۔

لہٰذا جب میں گانوں کے شور اور پریشر ہارن کی آواز کے ساتھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد حیدر آباد پہنچا ہوں تو میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ بس سے اترنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔

میرا حیدر آباد آنا ہوتا رہتا ہے، مگر جب بھی میں آتا ہوں، اسے ایک مختلف شہر دیکھتا ہوں آہستہ آہستہ شہر کی تمام کھلی جگہیں ختم ہو گئیں، اب وہاں پلازہ بن گئے ہیں۔ شہر کی چھوٹی اور تنگ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم، شور، اور

دھواں ہی دھواں ہے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں، گٹر بہہ رہے ہیں، کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا ہے، مگر زندگی جاری ہے۔ لوگ ماحول کے اس قدر عادی ہیں کہ ان کے لئے یہ ٹوٹی سڑکیں، گندہ پانی اور آلودہ ماحول کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ لوگوں نے اس صورت حال کو قبول کرلیا ہے۔ احتجاج کی جگہ خاموشی اور اطاعت ہے۔

پریس کلب حیدر آباد میں کتابوں کی نمائش یا میلہ کی تقریب تھی۔ میں اسی کے لئے یہاں آیا تھا۔ حیدر آباد کا پریس کلب احتجاج اور مظاہروں کی جگہ بن گیا ہے۔ جب صبح میں وہاں گیا ہوں تو دیکھا کہ آٹھ، دس لوگ سامنے فٹ پاتھ پر بھوک ہڑتال کئے بیٹھے ہیں۔ یہ ریڈیو پاکستان کے لوگ تھے جو اپنے مطالبات کے لئے یہاں آئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک جلوس آیا، یہ پانی کی قلت کے سلسلہ میں مظاہرہ کررہا تھا۔ پورے دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک صحافی نے کہا کہ حیدر آباد کا یہ پریس کلب ''ہائیڈ پارک'' ہے۔ یہاں لوگ آتے ہیں مظاہرہ کرتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں۔ مگر کیا اس کا اثر بھی ہوتا ہے؟ ہاں اخباروں میں خبریں آجاتی ہیں۔ لوگوں کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے، بس۔ انتظامیہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ ناانصافی اسی طرح سے جاری رہتی ہے۔

18 مارچ کو پریس کلب ہی میں میرا ایک لیکچر تھا۔ وقت کے ہوتے ہوتے یہاں لوگ آنے شروع ہوئے، کچھ دوست کراچی سے آئے تھے، کچھ میر پور خاص سے آئے، چھوٹا ہال تھا، وہ تقریباً بھر گیا۔ میں نے لیکچر میں جو بات کہی وہ علم اور کتابوں کے حوالہ سے تھی۔ اگر کتابوں کا میلہ مختلف شہروں میں لگتا رہے تو لوگوں کو کتابوں کے بارے میں معلوم ہوگا، کیونکہ اکثر کتابیں چھپتی ہیں مگر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کون سی کتاب کہاں سے چھپی ہے؟ اخباروں میں ریویو بھی کم آتے ہیں۔ لہٰذا اگر پبلشر لوگوں تک کتابیں لے کر جائیں تو لوگ یقیناً انہیں پڑھیں گے۔ بشرطیکہ ایسے موضوعات ہوں کہ جن سے ان کا تعلق ہو۔ ایسی تحریر ہو کہ جو انہیں آگہی و شعور دے۔

دوسری بات جو میں لیکچر میں کہی وہ یہ تھی کہ علم ایک طاقت ہے۔ لہٰذا امراعاتی اور حکمراں طبقے اس پر اپنی اجارہ داری رکھنا چاہتے ہیں اور اسے عام لوگوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ایک زمانہ میں اس پر برہمنوں کا تسلط تھا۔ امریکہ میں افریقی غلاموں کے لئے قانونی طور پر لکھنے پڑھنے کی پابندی تھی۔ لیکن اس جمہوری دور میں چونکہ مکمل پابندی ممکن نہیں، اس لئے تعلیم کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے نصاب کی کتابوں کو۔ ان میں وہی تعلیم دی جاتی ہے کہ جو حکمراں طبقوں کے مفاد میں ہوتی ہے تاکہ لوگوں کے ذہن کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ اس لئے یہ پروپیگنڈا کہ تعلیم معاشرے کے لئے ضروری ہے اور ان کے مسائل کا حل ہے اس کو چیلنج کرنا چاہئے کہ کون سی تعلیم؟ یہ تعلیم کہ جو اس وقت دی جارہی ہے، یہ تو لوگوں کو تنگ نظر، انتہا پسند اور ذہنی طور پر پسماندہ بنارہی ہے۔ چونکہ تعلیم کا پورا نظام حکومت کے ہاتھوں میں ہے لہٰذا وہ اپنی مرضی کی تعلیم دے رہے ہیں اور لوگوں کو ذہنی غلام بنارہے ہیں۔

ان حالات میں معاشرہ کو اپنی بقاء اور زندگی کے لئے متبادل علم کو پیدا کرنا چاہئے۔ یہ کام ملک کے دانشوروں کا ہے۔ مگر کیا ہمارے دانشور اس کام کو پورا کررہے ہیں؟ بدقسمتی سے نہیں۔ ان میں اکثر حکومتوں کی

خوشامد اور اس کی پالیسیوں کو صحیح ثابت کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کررہے ہیں۔ اگر متبادل علم کو پیدا نہیں کیا گیا تو لوگ ذہنی طور پر غلام اور پسماندہ رہیں گے۔

علم کی تخلیق میں یونیورسٹیوں کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کے ماحول کو خراب کرنے میں طلباء کی سیاسی پارٹیوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لئے ہم صرف حکومت ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے ہیں ان سیاسی پارٹیوں کو بھی مجرم قرار دیتے ہیں کہ جن کی تنظیموں نے تعلیمی ماحول کو خراب کیا ہے۔ امتحانات میں نقل کرنا، اساتذہ کو مارنا، پیٹنا، یونیورسٹی انتظامیہ سے بھتہ وصول کرنا، عام طلباء کو ہراساں کرنا اور اپنی مرضی کے اساتذہ کا تقرر کرنا یہ سندھ یونیورسٹی سے لے کر پنجاب یونیورسٹی تک ہے ایسے ماحول میں نہ تعلیم رہی اور نہ ذہن کا سکون۔ اس نے پاکستان کی یونیورسٹیوں کو تعلیم اور فکر سے محروم کررکھا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں اسکالرز پیدا ہونا بند ہوگئے۔

اس صورت حال میں اگر متبادل تعلیم کی کوشش ہوئی تو وہ مارکیٹ کی ضروریات کے لئے ہے۔ جعلی غیر ملکی یونیورسٹیوں کے کیمپس میں ہر شہر میں نظر آئیں گے۔ لیکن ایسا کوئی متبادل تعلیمی نظام تشکیل نہیں دیا گیا کہ جو باصلاحیت اور تخلیقی ذہن کو پیدا کرے۔

موضوع کوئی ہو، بات سیاست پر آجاتی ہے۔ جب سوالات شروع ہوئے تو لوگوں نے سندھ کی محرومی، پنجاب کی بالادستی، فوج کے جبر اور سختی پر سوالات کئے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اپنے صوبہ میں خود کو مجبور اور بے بس پاتے ہیں۔ فوج ہمارے ساتھ جو چاہے سلوک کرے، اس کی شکایت کس سے کریں؟ ایک صاحب نے کہا کہ فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت ہے۔ اب جب کہ فوج ہمارے حقوق پر حملہ کررہی ہے تو اس سے دفاع کے لئے کس سے کہیں!! کون ہے جو فوج کے حملوں سے ہمیں بچائے گا، ہمارا تحفظ کرے گا!! جب فرد کی عزت اور وقار پر حملہ ہو تو لہجہ میں تلخی آجاتی ہے اور ذہن سے ڈر اور خوف بھی نکل جاتا ہے۔

لوگ ملک کے دانشوروں، صحافیوں اور اساتذہ سے بھی نالاں تھے کہ جنھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اپنے مفادات کی خاطر اپنی صلاحیتیں فروخت کردیں۔ مگر میرا خواب تھا کہ جن دانشوروں نے خود کو فروخت نہیں کیا، ان کے ساتھ معاشرہ نے کیا سلوک کیا؟ اگر معاشرہ آزاد دانشوروں کی ہمت افزائی کرے، ان کی عزت کرے، ان کو زندہ رہنے کے ذرائع مہیا کرے تو لوگوں میں ہمت اور جرات آئے گی، ورنہ دانشور بھی سمجھوتہ کرلیتا ہے۔ زندہ معاشرہ، تخلیقی دانشور پیدا کرتا ہے، مردہ معاشرہ پسماندہ دانشوروں کو عزت دیتا ہے۔ سوالات شروع ہوں تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اس قدر بے چینی ہے اور اس قدر سوالات ہیں کہ جن کا جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

دوسرے دن میں سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے بنک میں ایک کام سے گیا۔ پھر بیٹھے بیٹھے وہاں کام کرنے والے کلرکس، اور دوسرے لوگوں نے مجھ سے کچھ سوالات کیے کہ آخر ہم کب تک اس پسماندگی میں رہیں گے اور کیا یہ ممکن ہے کوئی تبدیلی آئی گی۔ یہ لوگ بڑی امید سے اپنا بیلنس معلوم کرنے آئے تھے۔ ایک کام

کرنے والی عورت مٹھی میں چیک بک دبائے آئی اور بیلنس معلوم کیا، جو 120 روپیہ تھا۔ یہ سن کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سکتہ کے عالم میں آ گئی۔ چیک بک کو زور سے مٹھی میں دبا دیا، اور پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کے اکاؤنٹس میں پیسہ نہیں ہوگا، مگر شاید یہ امید ہو کہ کہیں سے پیسہ آ گیا ہو۔ آخر بنک میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔ بنک کے لوگ اس کے عادی ہیں، اس لئے ان کے لئے یہ روزمرہ کی بات ہے، مگر میں ان کے چہروں کے تاثرات دیکھتا رہا۔ ناامیدی، مایوسی، بے بسی اور لاچاری۔ آخر کب ان کی قسمت بدلے گی؟ کب ان کے چہروں پر خوشی و مسرت کی جھلکیاں ابھریں گی؟

وہاں سے اٹھ کر میں ہیومن رائٹس آف پاکستان کے دفتر میں آیا۔ شکیل پٹھان نے سندھ میں نجی جیلوں سے ہاریوں کو آزاد کرانے کی تحریک شروع کی تھی۔ یہ اب تک جاری ہے۔ دفتر کے باہر تیس چالیس ہاری کہ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سندھ کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے، اس امید میں کہ ان کی شکایات کو کوئی سنے گا اور ان کے مسائل کو حل کرے گا۔ ہاریوں کو جیل سے آزاد کرا کے ان کی اذیتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی رہائش، ملازمت اور روزگار کا کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں کوئی ان کی مدد کو تیار نہیں۔ این۔ جی۔ اوز کی دلیل ہے کہ ان کا کام صرف ''شعور'' پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا یہ آزاد ہاری اسی طرح غلامی اور مجبوری کا شکار ہیں۔ پولیس اور وڈیرے انہیں برابر تنگ کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو اغوا کرتے ہیں۔ یہ غریب اور بے بس لوگ کس سے شکایت کریں؟ یہ امیدوں کے ساتھ روز حیدرآباد آتے ہیں، اور ناامیدی کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں۔ جب میں نے خاموشی سے بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے چہروں پر تاثرات پڑھنے کی کوشش کی تو مجھے ان میں کچھ نظر نہیں آیا۔ ان کے میلے کچیلے کپڑے فرش کی مٹی سے ملے ہوئے تھے اور یہ اس کا ایک حصہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے جسم نحیف و لاغر تھے، چہروں پر جھریاں تھیں، رنگ کالے تھے، یہ کسی اور ملک کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ میرے ذہن میں ''غربت مٹاؤ'' سوشل ایکشن پروگرام اور ایسی ہی اسکیموں کے نام آتے رہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے افسران این۔ جی۔ اوز کے عہدیداران خوبصورت باتیں کرتے ہیں۔ مگر عملی طور پر لوگوں کے مسائل سے واقف نہیں ہیں۔ اور خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ خواب کے جوان کے ہیں، کہ جن میں ان ہاریوں کا گزر نہیں۔

تاج مری اور میوچل ایڈ کے دوستوں نے ایک پروگرام سانگھڑ میں رکھ دیا تھا۔ لہٰذا 19 مارچ کو صبح حیدرآباد سے سانگھڑ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب میں حیدرآباد میں تھا تو اس وقت فریدالدین کے ساتھ سانگھڑ اکثر جانا ہوتا تھا۔ ان میں سے اب اکثر دوست تلاش روزگار میں سانگھڑ سے دوسرے شہروں میں چلے گئے ہیں۔ لیکن ابھی بھی اللہ وارایو اور حسن وسان وہاں موجود ہیں۔ راستہ میں دیکھتا گیا کہ کھیت سرسبز اور شاداب تھے، مگر نہروں میں پانی نہیں تھا، اگر پانی کی یہی صورت رہی تو خطرہ ہے کہ یہ سرسبز و شاداب کھیت سوکھ جائیں گے۔

سانگھڑ کا شہر گرد آلود اور پسماندہ شہر ہے، دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح یہاں بھی سہولتوں کا فقدان

ہے۔ کہا گیا کہ لیکچر کالج کے ہال میں ہے۔ جب کالج پہنچے تو اسٹاف روم میں بٹھایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کالج کی بلڈنگ اگرچہ نئی تھی، مگر مرمت کے نہ ہونے اور دیکھ بھال کی کمی نے اس کو اجاڑ بنا رکھا ہے۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر گر رہا ہے۔ فرنیچر ٹوٹا ہوا تھا، ماحول میں زندگی کی بجائے مایوسی تھی، اس کا اظہار اساتذہ کے چہروں سے بھی ہو رہا تھا، جو اسٹاف روم میں بیزاری کے ساتھ بیٹھے تھے۔

لیکچر گیارہ کے بجائے بارہ بجے شروع ہوا۔ یہاں میں نے جاگیرداری اور مذہبی انتہا پسندی پر بات کی۔ مگر جب سوالات شروع ہوئے تو اس نے سیاست کو موضوع بنا لیا۔ لوگوں کے ذہن میں یہی سوالات تھے کہ ان حالات میں ملک کا کیا بنے گا؟ کیا یہ ملک سلامت رہے گا یا نہیں؟ حالات کو کیسے سدھارا جائے؟ لوگوں کو ان کے حقوق کیسے دلائے جائیں؟ لوگ معلوم کر رہے تھے کہ انہیں کوئی منصوبہ اور پروگرام بتایا جائے کہ جس پر عمل کر کے وہ حالات کو ٹھیک کر دیں۔

میں نے کہا کہ منصوبہ یا پروگرام اوپر سے نہیں آتا ہے۔ یہ لوگوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اس لئے کسی پلان کے لئے اوپر مت دیکھئے، خود سوچئے۔ دوسرے یہ کہ معاشرہ میں اگر تبدیلی آسکتی ہے تو وہ این۔ جی۔ اوز کے ذریعہ نہیں، بلکہ سیاسی جماعت کے ذریعہ سے آسکتی ہے۔ اس لئے ایک ایسی سیاسی جماعت کی ضرورت ہے کہ جس پر کسی ایک خاندان کا قبضہ نہ ہو، جہاں کوئی تاحیات صدر نہ ہو اور جو جاگیرداری اور سرمایہ داروں کے تسلط میں نہ ہو۔ ایک ایسی پارٹی کی ضرورت۔ ہے جو لوگوں کی بات کرے اور جو لوگوں کی اپنی ہو۔

جب سانگھڑ سے واپسی ہوئی تو راستہ بھر میں یہ سوچتا رہا کہ لوگوں میں تبدیلی کی زبردست خواہش ہے۔ لوگ اس ملک اور اس معاشرے کی بہتری کے خواہش مند ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہ جو ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنائے۔ جو ان کی توانائیوں کو استعمال کرے، اور تبدیلی کے عمل کو لائے۔ لوگوں نے ہر بار تبدیلی کے لئے جدوجہد کی، قربانیاں دیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، مگر جب تبدیلی آئی، تو صرف حکمراں طبقے بدلے، عوام وہیں رہے، اس لئے اب عوام احتجاجاً خاموش ہیں، اور ہمارے سیاسی راہنما اور حکمراں طبقے، ان کی حمایت سے محروم ہیں، مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا، کیا عوام میں اس قدر شعور اور توانائی آئے گی کہ وہ خود اپنی قیادت کریں اور ان راہنماؤں سے چھٹکارا پائیں کہ جنہوں نے انہیں استعمال کر کے اپنے مفادات پورے کئے ہیں۔ پتہ نہیں، ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں، مگر میری خواہش ضرور ہے کہ ایسا ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ سندھ، بلوچستان، پنجاب و سرحد کے غریب لوگوں کی آواز سننے کے لئے حکمراں طبقے تیار نہیں۔ انہوں نے اپنے اردگرد اونچی اونچی دیواریں تعمیر کرا رکھی ہیں۔ وہ ان لوگوں کی محرومی، اور بے بسی سے واقف نہیں، وہ ان کی شکایتوں سے بھی آگاہ نہیں۔ مگر یہی بے علمی اور دوری حکومتوں کو برباد کرتی ہے۔ مگر اس کی قیمت بھی یہ غریب لوگ ہی ادا کرتے ہیں۔ شاید، اور یہ ''شاید'' شاید کبھی پورا نہ ہو، مگر خواہش ضرور ہے کہ ہم بھی عام لوگوں کو عزت و وقار کے ساتھ دیکھ سکیں۔ عزت و وقار کہ جو ان کا حق ہے۔

☆☆☆

لسانیت، وفاقیت اور دوقومی نظریہ

سندھ عوامی سنگت کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرے سے خطاب

''جب بات چیت ہوتی ہے تو سیکھنے کا عمل یکطرفہ نہیں ہوتا بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے یعنی جہاں میں آپ لوگوں سے بات کر کے اپنے خیالات آپ لوگوں تک پہنچاتا ہوں، جب سوالات کئے جاتے ہیں تو بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ مجھے اس سے سیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟ ان کے ذہنوں میں کیا سوالات ہیں؟ جب بھی معاشرے کے اور ملک کے حالات خراب ہوتے ہیں تو ملک کے لوگوں میں ایک نئی سوچ، نئی فکر پیدا ہوتی ہے وہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ حالات کو کس طرح ٹھیک کیا جائے اور یہ بھی کہ کیا حالات ٹھیک ہو بھی سکتے ہیں۔ کبھی مایوسی ہوتی ہے اور کبھی امید۔ اس وقت ہمارا معاشرہ اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوالات ہیں۔ آج ملیر کی ایک نشست میں نوجوانوں سے جب گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ معاشرے میں کتنے سوالات پیدا ہو رہے ہیں؟ میں بھی جوابات دیتے دیتے تھک گیا اور ظاہر ہے کہ ہر سوال کا جواب میں دے بھی نہیں سکتا تھا۔

آج ایک موضوع میں تین چیزیں ملا دی گئی ہیں، لسانیت، وفاقیت اور تیسرا موضوع دوقومی نظریہ ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر موضوع پر کچھ عرض کروں۔

لسانیت

زبان کی کسی بھی معاشرے میں کیا اہمیت ہوتی ہے؟ یعنی زبان کس طریقے سے ثقافتی وسماجی سطح پر ایک سرمایہ ہوتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ کسی بھی معاشرے میں سب لوگ ایک ہی زبان بولتے ہوں، لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور ہر زبان اپنے بولنے والے کا ثقافتی سرمایہ رکھتی ہے ان کی اپنی سوچ وفکر ہوتی ہے کہ آپ کوئی نئی زبان سیکھتے ہیں تو بالکل ایسے ہی ہوتا ہے کہ جیسے آپ نئی دنیا دریافت کر رہے ہوں، اس لئے زبانیں سیکھنے کا سلسلہ نئی دنیائیں دریافت کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ایک بات یہ کہ ہر زبان میں یہ صلاحیت اور قابلیت ہوتی ہے کہ وہ ہر موضوع کے اظہار کا باعث بن سکتی ہے۔ عام طور سے

کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں سائنسی مضامین لکھے جائیں جیسے اقبال نے بھی اردو کے لئے کہا تھا کہ:

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

یہ بات درست نہیں ہے بلکہ بات یہ ہوتی ہے کہ اس زبان کو زرخیز بنانے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کرنے کا کام لوگوں کا ہوتا ہے۔ زبان اپنے آپ میں کچھ نہیں ہوتی ہے اور اگر زبان کو لوگ نہیں بنائیں گے تو ظاہر ہے کہ زبان پسماندہ رہے گی اور اگر لوگ زبان کو بنائیں گے تو ظاہر ہے کہ زبان آگے بڑھے گی ترقی کرے گی، یہ تصور کہ پنجابی میں یہ صلاحیت نہیں ہے یا سندھی زبان میں یہ صلاحیت نہیں ہے یہ بالکل غلط اور مفروضے پر مبنی بات ہے جو ہمارے یہاں قائم کیا گیا ہے۔ زبان کو بنانے کا کام اس کے دانشوروں کا اس کے سماجی علوم کے ماہرین کا ہوتا ہے کہ اس زبان میں نئی نئی بات علمی، ادبی اور سائنسی مضامین لکھیں۔ اسی صورت میں زبان ترقی کر سکتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک واقعہ ہے کہ جب ایک صاحب پنجاب سے رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے گئے تو ٹیگور نے ان سے پوچھا کہ اقبال پنجابی میں شاعری کیوں نہیں کرتے؟ تو ان صاحب نے کہا کہ پنجابی زبان اس قابل نہیں ہے۔ جواب میں ٹیگور نے کہا کہ ایک زمانے میں بنگالی زبان کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا تھا کہ بنگلہ زبان اس قابل نہیں ہے لیکن ہم نے تو آج اس کو اس قابل بنا لیا ہے کہ اب وہ دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کمتر نہیں ہے۔ تو یہ آپ ذہن میں رکھئے گا کہ کسی بھی زبان کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ اس قابل نہیں ہے یہ ایک بالکل غلط خیال اور خود سے گھڑا ہوا مفروضہ ہے۔

ایک بات اور جو اہم ہے کہ پوری تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ زبان کا اور زبان کے ساتھ طاقت کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی ریاست کی سرپرستی جب کسی زبان کو ملتی ہے تو اسے گویا اقتدار کا ساتھ مل جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسری زبانوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو زبان اور طاقت کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ پوری تاریخ آپ پڑھیں کہ جب بھی امپیریل ازم آیا تو اس کے آنے کے ساتھ ہی دوسری زبانوں کو پیچھے دھکیلنے کا عمل شروع ہوا اس کی مثال رومی امپیریل ازم کی ہے کہ جس نے لاطینی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا اور قرون وسطیٰ کے زمانے میں تمام یورپ میں دانشوروں کی زبان لاطینی زبان بن گئی۔ اسی میں لوگ لکھتے تھے اور اپنی اپنی زبانوں کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس قابل نہیں ہیں اور جب رومی سلطنت ختم ہوئی تو اس کے بعد ایک زمانے تک یہی صورت حال رہی۔ یہاں تک کہ بائبل صرف لاطینی زبان میں لکھی ہوئی تھی اور اسے اور کسی دوسری زبان میں نہیں لکھا جاتا تھا۔ جب لوتھر نے چرچ کی مخالفت کی اور اصلاح مذہب کی تحریک شروع کی تب اس نے کہا کہ بائبل کو ہر قومی زبان میں ترجمہ کرنا چاہئے۔ جرمن زبان میں لوتھر نے خود ترجمہ کیا پھر اس کے بعد انگریزی میں، فرانسیسی میں، ڈچ میں اور دوسری زبانوں میں بائبل کے ترجمے ہوئے۔ تو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ زبان اور طاقت کا آپس میں

گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں فارسی زبان سرکاری زبان بنی تو اس کے ساتھ ہی یہاں کی زبان سنسکرت کو پیچھے دھکیل دیا گیا اور پنڈت جو کہ سنسکرت جاننے کی وجہ سے معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے وہ ایک دم بیروزگار ہو گئے۔ اس لئے البیرونی نے لکھا کہ ایک بڑی تعداد ان پنڈتوں کی ہجرت کر کے کشمیر چلی گئی۔ کشمیر کے جو پنڈت مشہور ہیں وہ یہی ہیں جو محمود غزنوی کے آنے کے بعد جب سلطنت قائم ہوئی اور فارسی زبان سرکاری و درباری زبان بنی تو خاص طور پر سنسکرت زبان کی اہمیت ختم ہو گئی۔ جب انگریز یہاں آئے اور جب انہوں نے 1935ء میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا تو اس کے ساتھ ہی فارسی اور اُردو کی اہمیت گھٹ گئی اور انگریزی زبان کامیابی کی زبان بن گئی، اس کو سیکھنے کے ساتھ ہی ملازمتوں کے مواقع لوگوں کو مل جاتے تھے۔ یہ بات بہت اہم ہے اس لئے کہ پاکستان میں آپ دیکھیں کہ کون سی زبانوں کا تعلق طاقت کے ساتھ ہے۔ پاکستان میں طاقت کا تعلق اُردو زبان کے ساتھ نہیں بلکہ انگریزی کے ساتھ ہے۔ اسی لئے انگریزی زبان پر طبقہء اعلیٰ کا تسلط ہے۔ ہوا یہ ہے کہ جس طرح ہمارا تعلیمی نظام بنا ہے اس میں انگریزی میڈیم اسکول اُردو میڈیم یا سندھی میڈیم یا پشتو میڈیم اسکولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ جن لوگوں کو انگریزی آتی ہے انہی کے لئے ملازمتیں ہیں تو جب تک کوئی زبان اقتدار میں داخل نہیں آئے گی اسے طاقت نہیں ملے گی، اس وقت تک وہ زبان پسماندہ رہے گی۔ اب یہ بات کہ زبانوں کو کس طرح اقتدار میں آنا چاہیے اس کا تعلق جمہوری جدوجہد سے ہوتا ہے۔ ایک بات اور جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ جب یورپ میں قوم پرستی آئی اور اس کے ساتھ ساتھ قومی ریاست کا تصور آیا تو اس تصور میں ایک چیز یہ تھی کہ ایک قوم ہے تو ایک زبان ہونی چاہیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری جو زبانیں بولی جاتی تھیں، انہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ یہ زبانیں قوم کے اتحاد میں رکاوٹ ثابت ہوتی تھیں اس لئے ان زبانوں کو ایک طرف کر دیا گیا چنانچہ جب 1789ء میں فرانس میں انقلاب آیا تو اس وقت وہاں 50 فیصد لوگ فرانسیسی نہیں بولتے تھے ان کو زبردستی مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی زبانیں ختم کر کے فرانسیسی زبان سیکھیں کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قوم کی تشکیل جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ زبان ایک ہو، اور اسی طرح کا عمل اٹلی میں ہوا۔ اٹلی میں بھی ڈھائی فیصد لوگ اٹالین بولتے تھے وہاں بھی لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ دوسری زبانوں کو ختم کر کے صرف ایک زبان بولیں تو قومیت یا نیشنلزم کے تحت کوشش کی جاتی ہے کہ زبان ایک ہو۔ ہمارے یہاں بھی کوشش ہوئی کہ اُردو کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے اور دیا گیا لیکن اُردو سرکاری زبان نہیں تھی، قومی زبان تھی۔

دوقومی نظریہ

جب ہم ساتھ میں دوقومی نظریئے کا ذکر کرتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ قوم پرستی میں بھی مختلف قسم کے نظریات ہیں۔ مثلاً قوم پرستی کے تصور کو ہم علاقائی قوم پرستی کہتے ہیں وہ سارے لوگ جو کسی ایک علاقے

میں کسی بھی جغرافیائی حدود میں رہتے ہوں ایک قوم میں چاہے ان کا مذہب کوئی ہو زبان کوئی ہو اور ان کا رنگ ونسل کوئی ہو، لیکن اگر وہ کسی ایک جغرافیائی حدود میں رہتے ہیں تو ان کا تعلق ایک قوم سے ہے اس کو ہم علاقائی قومیت کا تصور کہتے ہیں۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ زبان کی بنیاد پر قوم کی تشکیل ہو اور جیسا کہ میں نے کہا کہ قومی ریاست میں کافی جگہ یہ کوشش ہوئی کہ ایک زبان کو معیار بنا کر لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ صرف وہی زبان بولیں، دوسری زبانیں نہ بولیں۔ تو اس کو ہم کہتے ہیں لسانی قومیت کا تصور۔ جس کا ایک زبان پر انحصار ہوتا ہے۔ تیسرا جو قومیت کا نظریہ ہے، وہ مذہب کا ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے متحد ہوں اور ایک قوم کی شکل اختیار کرلیں جس کو ہم مذہبی قوم پرستی کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں ہندوستان میں جب پاکستان کی تحریک چلی اور ہندوؤں کے ساتھ تصادم ہوئے تو وہاں پر جو دو قومی نظریئے کا ارتقاء ہوا ہے اس کے پس منظر میں مذہبی قوم پرستی تھی کہ مذہب کے نام پر تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے پہلے جب ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی۔ اس زمانے میں یہاں کا معاشرہ جو مسلمانوں پر مشتمل تھا، وہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک اشراف کہلاتے تھے، جن کا تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا۔ دوسرے اجلاف کہلاتے تھے جن کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا، اور یہ اجلاف وہ لوگ تھے جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی بہت ساری ہندوانہ رسموں کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ اس کی کئی مثالیں راجپوت قبائل میں ہیں، جو مسلمان ہوئے جیسے قائم خانی یا خان زادہ یا میو برادری کے لوگ۔ یہ مسلمان ہو گئے لیکن اپنی مقامی اور ثقافتی روایات کو برقرار رکھا۔ اس لئے یہاں پر کوئی مسلمان قوم کا تصور نہیں تھا کہ سارے مسلمان ایک ہیں بلکہ اشراف اپنے آپ کو اعلیٰ و برتر سمجھتے تھے۔ ان کا تعلق ان لوگوں سے تھا جو وسط ایشیا، ایران، افغانستان یا عرب سے آئے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم غیر ملکی ہیں ہم صحیح اسلام کے ماننے والے ہیں اور ہندوستان میں جو باقی لوگ مسلمان ہوئے ہیں یہ صحیح اسلام کے پابند نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے بہت سی ہندوانہ رسمیں اختیار کر رکھی ہیں۔ معاشرہ بٹا ہوا تھا ایک نہیں تھا لیکن برطانوی حکومت کے زمانے میں یہ احساس پیدا ہوا اور مسلمان ہونے کا احساس پیدا کرنے میں اس زمانے میں ہونے والی بہت سی اصلاحات ہیں مثلاً یہاں 1871ء میں جو سب سے پہلے مردم شماری ہوئی اس میں خاص طور پر یہ خانہ رکھا گیا تھا کہ آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ جبکہ نہ اس سے پہلے کبھی مردم شماری ہوئی تھی اور نہ اس قسم کا حساب رکھا جاتا تھا مگر اب حساب کتاب رکھا جانے لگا ہے کہ آپ ہندو ہیں، مسلمان ہیں، سکھ ہیں، یا بدھسٹ ہیں وغیرہ۔ اس مردم شماری کے نتیجے میں مذہب کے بارے میں احساس پیدا ہوا کہ فرد کی مذہبی شناخت کیا ہے دوسرا اہم کردار جو ادا کیا، وہ ہندوستان میں جب نچلی سطح یعنی ضلعی سطح پر انتخابات ہوئے تو اس کی وجہ سے اچانک یہ بات سامنے آئی کہ جو لوگ اقلیت میں ہیں وہ تو انتخابات جیت ہی نہیں سکیں گے اور جو اکثریت میں ہیں ہمیشہ وہی جیتیں گے۔ اکثریت و اقلیت کا لوگوں کو ایک دم احساس ہوا اور خاص طور پر مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ ہم ہندوستان میں

اقلیت میں ہیں اور اگر انتخابات ہوئے اور جمہوریت آئی تو ہم کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اسی لئے ہمارے یہاں کے بڑے لوگوں نے جن میں سر سیّد احمد خان کا نام سرفہرست ہے، جمہوریت کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جمہوریت ہمارے لئے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم اقتدار میں کبھی نہیں آئیں، آگے چل کر مولانا محمد علی جوہر نے بھی جمہوریت کی مخالفت کی اور خود جناح صاحب نے بھی مخالفت کی کہ جمہوریت ہمارے لئے اس لئے مفید نہیں ہے کہ ہم اقلیت میں ہیں اور جمہوری نظام ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جمہوریت مخالفانہ جذبات پاکستان بننے کے بعد بھی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جی ایم سیّد نے کہا کہ جمہوریت سندھیوں کے لئے بالکل مناسب نہیں ہے کیونکہ پنجاب اکثریتی صوبہ ہے تو پنجابی ہمیشہ یہاں حکومت کریں گے ہم تو کبھی حکومت میں نہیں آسکتے اور یہی بات مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئی۔ مشرقی پاکستان چونکہ زیادہ آبادی والا علاقہ تھا اگر یہاں پر جمہوریت ہوتی تو مشرقی پاکستان کے نمائندے زیادہ منتخب ہو کر آتے اس لئے یہاں مختلف طریقے استعمال کئے گئے کہ صحیح جمہوری روایات قائم نہ ہوں۔ اکثریت کے حقوق کی نفی کرنے کے لئے ہی ون یونٹ کی تشکیل کی گئی اور برابری کا اصول اختیار کیا گیا، یہ رویہ جمہوریت کی نفی کرنے کے مترادف تھا اور یہ کوئی نئی نہیں تھیں بلکہ ان کی جڑیں بھی بہت پرانی تھیں، تقسیم سے بھی پہلے کی۔ ہندوستان میں طبقہء اعلیٰ کے لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ ہم تو اقلیت میں ہیں اب اقلیت کو مضبوط کس طرح بنایا جائے، اب پہلی مرتبہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ یہاں جو نومسلم ہیں ان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کیا جائے ورنہ اب تک اشراف الگ تھے اور اپنے مذہب کو اصلاحی اور اعلیٰ سمجھتے تھے، اور اجلاف یعنی نچلے طبقے کے مسلمانوں کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرتے تھے مگر اس احساس کے بعد کہ ہم اقلیت میں ہیں، انہوں نے اجلاف سے رابطے شروع کئے تاکہ یہ لوگ ساتھ ہوں گے تو ان کی طاقت بنے گی اور ان کی طاقت کی بنیاد پر یہ اپنے مطالبات پیش کر سکیں گے۔ اس پورے عمل میں جس نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا وہ اس زمانے کے ہمارے اخبارات ہیں جو کہ اب تک اپنا کردار ادا نہیں کر رہے تھے۔ جب اخبارات نئے نئے آئے۔ ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' محمد علی جوہر نے نکالے۔ ''زمیندار'' ظفر علی خان نے نکالا۔ یہ اخبار پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ مسلمانوں نے انہیں پڑھا۔ اب ان کا ایک دوسرے سے رابطہ ہوا اور یہ جذبہ بھی اُجاگر ہوا کہ مسلمان ایک قوم ہیں اس لئے مذہبی بنیادوں پر یہ کہا گیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں ان کا مذہب الگ ہے۔ ان کی ثقافت، ان کی تاریخ الگ ہے۔ پورا ایک نظریہ تشکیل دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان الگ الگ دو قومیں ہیں۔ اس طرح مذہبی بنیادوں پر قومی شناخت کو ابھار کر اور اشراف و اجلاف کو ملا کر ایک قوت بنا کر ہندوستان کی اشرافیہ نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق اور زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کئے جائیں تو پاکستان کے بننے میں اسی اشرافیہ کا حصہ ہے۔ جیسے فوج کے جرنیل عام فوجیوں کو استعمال کرتے ہیں، جانیں وہ دیتے ہیں لیکن کامیابی کا سہرا ان کے

جنرل کے سر بندھتا ہے بالکل ایسی ہی صورتحال پاکستان کے بننے میں پیش آئی۔ ہمارے دوست پروفیسر حمزہ علوی کا کہنا ہے کہ یوپی کا تنخواہ دار طبقہ ایک طرف تھا اور دوسری طرف سندھ اور پنجاب کا زمیندار طبقہ تھا، ان کے مفادات تھے کہ پاکستان بننا چاہئے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان ایک ایسا خطہ ہوگا جہاں ان کی جائیدادیں محفوظ رہیں گی۔ ہندوستان میں ان کا خیال تھا کہ جاگیرداری ختم ہو جائے گی اس لئے ان کی پہلی ترجیح جاگیروں کا تحفظ تھی۔ اسی طرح تنخواہ دار طبقے کے مفادات یہ تھے کہ اگر پاکستان بن جائے گا تو انہیں یہاں ملازمتوں کے زیادہ مواقع ملیں گے وہ زیادہ ترقی کر سکیں گے یہ سارا پس منظر موجود تھا۔ اب ایک بڑا سوال یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد دوقومی نظریئے کو رہنا چاہئے یا ختم ہو جانا چاہئے؟ کیونکہ پاکستان کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ قومی ریاست ہے تو یہاں پر ایک قوم کی تشکیل ہونی چاہئے۔ قوم کی تشکیل کس طرح ہونی چاہئے؟ کیونکہ یہاں یہ مسئلہ ہے کہ سارے ہی تو مسلمان نہیں ہیں، یہاں ہندو، عیسائی وغیرہ مذہبی اقلیتیں بھی ہیں، اگر آپ مذہب کی بنیاد پر مذہبی قومی ریاست بناتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان سارے لوگوں کو خارج کر دیتے ہیں، انہیں آپ قوم کا حصہ نہیں بنا سکتے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں جائیں؟ کیا یہ دوسرے درجے کے شہری بن کر اس ملک میں رہیں؟ اگر ایسا ہے تو آج کے جمہوری زمانے میں کوئی بھی اقلیت دوسرے درجے کا شہری بن کر نہیں رہ سکتی، کیونکہ جمہوریت میں سارے لوگ ایک جیسے شہری ہوتے ہیں، اور اس حیثیت سے وہ برابر کے حقوق کے حقدار ہوتے ہیں تو ایک مسئلہ یہاں یہ پیش آیا کہ کیا پاکستان کو مذہبی بنیاد پر قومی ریاست ہونا چاہئے یا لسانی بنیاد پر؟ تو یہاں کون سی ایک زبان ایسی ہو جس کی بنیاد پر سارے پاکستان کو جبکہ مشرقی پاکستان بھی ہمارے ساتھ تھا، اس کو شامل کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ اگر آپ اردو کی بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے جو دوسری زبانیں بولنے والے پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے تھے، اور اگر آپ یہ کہتے کہ علاقائی بنیادوں پر ہونا چاہئے تو یہ ایک صورت تھی جس میں پاکستان میں رہنے والے تمام لوگوں کو ایک قوم کی حیثیت سے برابر کے حقوق دے کر آپ طے کر سکتے تھے۔ تو یہ بہت بڑا مسئلہ تھا جو ہمارے یہاں قیام پاکستان سے شروع ہوا اور آج تک یہ مسئلہ اسی طریقے سے قائم ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مذہبی قومیت کے خلاف جو پہلا احتجاج ہوا وہ بنگلہ دیش میں ہوا۔ جو اس وقت مشرقی پاکستان تھا اور انہوں نے اس کے خلاف تحریک چلائی۔ لسانی قوم پرستی کا جو تصور ہے وہ بھی مختلف قوموں کے اندر ہم دیکھتے ہیں مثلاً اس کی بڑی مثال جرمنی کی ہے 18 ویں اور 19 ویں صدی میں جرمنی متحد نہیں تھا وہاں 300 سے زائد ریاستیں تھیں، جب نپولین نے وہاں حملہ کیا ہے اور جرمنوں کو شکست ہوئی تو اس کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ اب ہمیں کسی طریقے سے متحد ہو جانا چاہئے اگر ہم 300 ریاستوں میں بٹے رہے تو ختم ہو جائیں گے تو وہاں ان کے دانشور اور مفکرین تھے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ جرمن زبان کی بنیاد پر قوم کو متحد کیا جائے، وہاں بھی اس سے پہلے طبقہء اعلیٰ کے لوگوں کے لئے جرمن زبان گنواروں کی زبان تھی۔ وہ سمجھتے تھے

کہ اس زبان میں اتنی گہرائی نہیں ہے یا یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس میں کچھ لکھا جائے۔ لیکن بہت سے دانشور
نتشے، ہرڈر اور گرم برادر تھے، انہوں نے سوچا کہ اس زبان کو کس طریقے سے علمی و ادبی طور پر اس قابل بنایا
جائے، زیادہ سے زیادہ لکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے جرمن
زبان کی بنیاد پر قوم کو متحد کیا۔ تو اس اتحاد کی بنیاد لسانی قومیت پر تھی۔ اسی ماڈل کو آگے چل کر مشرق وسطیٰ میں
عربوں نے عربی قومیت کی بنیاد بنایا، اور عربی زبان پر اس کی بنیاد رکھی۔ عرب دنیا میں صرف مسلمان ہی نہیں
تھے وہاں بھی عیسائی تھے، یہودی تھے اس لئے عرب قومیت کی بنیاد عربی زبان پر رکھی گئی اور اس عمل میں بہت
زیادہ حصہ لبنان و عراق کے عیسائیوں نے لیا۔ چونکہ ان کا یہ کہنا تھا کہ زبان مذہب سے زیادہ اہم ہوتی ہے
کیونکہ کسی بھی مذہب کو آپ زبان کی مدد سے ہی سمجھتے ہیں اس لئے زبان کی اہمیت زیادہ ہے، اور زبان کی
بنیاد پر جس قوم کی تشکیل کی جائے گی اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہوں گی۔ وہاں انہوں نے اسی بنیاد پر عرب
قومیت کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں عرب قومیت کس طریقے سے ٹوٹنے کے بعد کتنے حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ یہ
ایک الگ کہانی ہے۔ تو ہمارے ہاں بنگلہ دیش میں سب سے پہلے مذہبی قومیت کو چیلنج کیا گیا اور وہاں لسانی
قومیت کی بنیاد پر ایک تحریک چلی، دوسرا ردِعمل سندھ میں ہوا، خاص طور پر ون یونٹ کے بعد۔ سندھ میں
لسانی قومیت کی تحریک کی بنیاد سندھی زبان پر تھی کیونکہ زبان صرف بولنے کے لئے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں
ثقافت ہوتی ہے اور روایات ہوتی ہیں اس لئے سندھ میں جو وفاق اور مرکزیت کو چیلنج بھی کیا گیا وہ بھی زبان
کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک یہاں جو مذہبی قوم پرستی کا تصور تھا وہ ٹوٹا، اور آپ دیکھیں گے
کہ آگے چل کر خود ایم کیو ایم کی جو بنیاد تھی وہ زبان کی بنیاد پر ہی پڑی، شناخت کا تصور ابھرا کہ اُردو زبان کے
بولنے والوں میں شناخت کا تصور پیدا کیا جائے۔ اس لئے مذہبی قوم پرستی کو انہوں نے چیلنج کیا۔ تو یہ زبان کی
سیاست ہے اس کو ذرا تاریخی تناظر میں آپ دیکھیں تو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور کوئی زبان
اسی وقت آگے بڑھتی ہے جب ریاست کی جانب سے اس کی سرپرستی ہوتی ہے مگر صرف ریاستی سرپرستی ہی
کافی نہیں ہے بلکہ جب تک خود وہاں کے لکھنے والے دانشور کوئی اضافہ نہیں کریں گے، علمی و ادبی حوالے سے
تخلیقات نہیں کریں گے، اس وقت تک زبان مقابلہ نہیں کر سکتی اور کمزور رہتی ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ دوقومی نظریہ پاکستان بننے کے بعد ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اب پاکستان بننے کے
بعد دوقومی نظریئے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پاکستان کو اب علاقائی قوم پرستی کی بنیاد رکھنی چاہیے جو لوگ بھی پاکستان میں رہتے ہیں کسی بھی زبان و
مذہب سے ان کا تعلق ہو ان کو ایک قوم کا حصہ بنا لینا چاہئے۔ ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے دیکھیں کس
طریقے سے ہماری قوم کمزور ہوئی۔ مثلاً احمدیوں کو ہم نے اقلیت قرار دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے پڑھے لکھے اور
پیسے والے احمدی تھے وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ یہی عیسائیوں کے ساتھ ہوا، یہی ہندوؤں کے ساتھ ہوا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اقلیتوں میں اب وہ لوگ رہ گئے ہیں جو غریب ہیں۔ وہ اپنا دفاع بھی خودنہیں کر سکتے ،اب ہم ان کوظلم وستم کر کے پریشان کرتے رہتے ہیں تو ان کا اس قوم کے ساتھ اور اس کو بنانے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا تو اس بات کو محسوس کرنا چاہئے کہ جب تک کسی کو اس کے بنیادی حقوق نہیں ملیں گے ایک شہری کی حیثیت سے۔ کیونکہ ائین و جمہوریت کا ایک تصور یہ ہے کہ شہریوں کو بنیادی حقوق ملنے چاہئیں اگر وہ نہیں ملیں گے تو یقیناً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کو ہم مرکزی دھارے سے کاٹ دیں گے۔

وفاقیت

وفاقیت کا جو نعرہ لگایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس نعرے کا تصور ہی خطرناک ہے۔ کیونکہ ہم جب اتحاد کی بات کرتے ہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ لوگ اپنی دوسری شناختوں کو ختم کر کے اپنے آپ کو بڑی شناخت میں ضم کر دیں مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ سندھی، بلوچی، پنجابی وغیرہ یہ اپنی ساری شناختیں ختم کر کے اپنے آپ کو صرف ایک پاکستانی شناخت میں ضم کر دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اور اگر کسی قوم میں اس بنیاد پر اتحاد ہو جائے تو وہ فاشزم کی طرف لے جاتا ہے۔ سوشیالوجی میں دو قسم کے نظریات اس بارے میں پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ جیسے کوئی ہانڈی پک رہی ہے اس میں ہر چیز کو کوٹ کر ملا دیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ زبردستی تمام شناختیں ختم کر کے کہیں کہ آپ کی ایک ہی شناخت ہے باقی ساری جڑیں کاٹ دیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جیسے کسی ایک پیالے میں سلاد ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز پیالے میں الگ، الگ ہوتی ہے۔ اس لئے ایک نظریہ یہ ہے کہ ایک قوم ہے مگر اس کی دوسری شناختیں ہیں خواہ وہ مذہبی ہوں، لسانی ہوں یا رنگ و نسل کی بنیاد پر ہوں وہ اپنی شناخت کو بھی برقرار رکھیں اور پیالے میں بھی رہیں۔ یہ ایک نظریہ ایسا ہے جو جمہوری معاشرے میں جہاں خاص طور پر بہت سی ثقافتیں ہیں، بہت سے گروہ رہتے ہیں، بہت سی قومیں رہتی ہیں، مفید ہے۔ پاکستان میں جب تک ہم اپنے دستور کو اپنی ریاست کے ڈھانچے کو اور اپنے قوم پرستی کے جذبے اور نظریئے کو نئے سرے سے تشکیل نہیں دیں گے اور خاص طور سے اس دو قومی نظریئے سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے اور جب تک نظریہ پاکستان کی جو اصطلاح ہم نے ایجاد کی ہے، اس سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کریں گے کسی سمت کا تعین نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کوئی بھی نظریہ ہو اسے حکمران طبقے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں تو جب تک ہم اپنے آپ کو اس نظریئے کے بندھنوں سے نہیں نکالتے جب تک ہمارے لئے آگے بڑھنا مشکل ہوگا۔ اس لئے اس حوالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کل کا جو عالمی تناظر ہے اس میں جو ضرورت محسوس کی جارہی ہے کسی بھی معاشرے کے لئے یہ ہے کہ معاشرہ سیکولر ہو، جمہوری ہو، ریاست کو مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانبدار ہونا چاہئے اور جتنے بھی دوسرے ایسے ادارے ہیں جو معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ ہیں جیسے جاگیرداری ہے،

تعلیم کی ہمارے یہاں جس طرح کمی ہے جب تک یہ ساری چیزیں دور نہیں ہوں گی، پاکستان میں رہتے ہوئے ہم ترقی یافتہ معاشرے یا ترقی یافتہ ریاست کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس لئے قوم کی مرکزیت کے نظریئے کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں کو خودمختاری دینے کی ضرورت ہے ان کی اپنی جو شناخت ہے اس کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے اور ریاست کا کام یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کسی ایک زبان کی سرپرستی کرے بلکہ ریاست کا کام یہ بھی ہے کہ جو دوسری علاقائی زبانیں ہیں بلکہ اور جو چھوٹی چھوٹی زبانیں بولی جاتی ہیں ان تمام زبانوں کا تحفظ کرے کیونکہ یہ زبانیں اپنے اندر ثقافت رکھتی ہیں، روایات رکھتی ہیں، جس کی بنیاد پر قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔

مذاکرے کے اختتام پر سندھ عوامی سنگت کے جنرل سیکریٹری انور ایڈووکیٹ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

